نوائے ادب

(ششماہی)

جلد ۳۶ : شمارہ ۱

اپریل ۱۹۸۶ع

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲، دادابھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

انجمن اسلام کی مجلس عاملہ

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

●

نائب صدر	نائب صدر	نائب صدر
جناب مصطفیٰ فقیہ	محترمہ ہمائے پیر بھائی	جناب عزیز احمد بھائی

●

جائنٹ سیکرٹری	اعزازی جنرل سیکرٹری	جائنٹ سیکرٹری
جناب یوسف مراد	جناب عبدالمجید ای پالکا	جناب عبدالستار زری والا

● ●

اعزازی خازن

جناب عبداللہ فقیہ

●

اراکین

جناب کے ضیاءالدین	محترمہ زلیخا مرچنٹ	جناب عبدالستار عمر
جناب مامون لقمانی	جناب احمد آر پیر محمد	جناب فیض جسدن والا
پروفیسر عبدالقادر اے قاضی	ڈاکٹر علی محمد یو میمن	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

● ● ●

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کمیٹی

چیرمن

جناب مصطفیٰ فقیہ

●

اراکین

جناب عبدالمجید ای پالکا

جناب عبدالستار زری والا

پروفیسر عبدالقادر قاضی

●

سیکرٹری

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

● ● ●

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تا حال ڈائرکٹران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۴۷ سے ۱۹۶۸ء)

پروفیسر سید ظہیرالدین مدنی (۱۹۶۹ سے ۱۹۷۴ء)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (۱۹۷۵ سے جاری)

نوائے ادب ممبئی

ششماہی

مدیر
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

•

جلد ۳۶ — شمارہ ۱

اپریل ۱۹۸۶ء

•

مندرجات

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

- لغات گجری (مرتبہ)
- رقعات عالمگیر (مرتبہ)
- مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
- تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
- برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
- سوراج (ترجمہ)
- رہنمائے صحت (ترجمہ)
- ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی

- ولی گجراتی (مولفہ)
- نورالمعرفت (مرتبہ)
- غزل ولی تک (مولفہ)
- اردو ایسیز (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

- اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
- نوائے وقت (مولفہ)
- گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مولفہ)
- طوطیاں ہند (مرتبہ)
- انڈو ایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)

عبدالرزاق قریشی

- نوائے آزادی (مرتبہ)
- مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
- مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
- مبادیات تحقیق (مولفہ)
- راگ مالا (مولفہ)

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامداللہ ندوی

مقالہ نما مرتبہ رقیہ انعامدار

خبر نامہ

انجمن اسلام کا صد سالہ جشن :

اگرچہ انجمن اسلام بمبئی کا قیام ۱۸۷۵ع میں عمل میں آیا اور امسال یعنی ایک سوگیارہ سال بعد اس کی صد سالہ تقریبات کا افتتاح وزیر اعظم جمہوریۂ ہند عالیجناب راجیو گاندھی کے ہاتھوں یکم مئی ۱۹۸۶ع کو انجمن اسلام کی تاریخی عمارت کے احاطہ میں ہورہا ہے۔ ڈاکٹر جمخانہ والا صدر انجمن اسلام اور انجمن کے کارکنان مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کل ہند اساتذۂ اردو جامعات ہند کانفرنس :

۲۵ تا ۲۷ اپریل ۱۹۸۶ع کو کانفرنس کے گیارھویں اجلاس کا انعقاد بمبئی میں ہورہا ہے۔ تقریباً سو سے زائد مندوبین مختلف یونیورسٹیوں کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کررہے ہیں۔ کانفرنس کا افتتاح یونیورسٹی کلب ہاؤس آڈیٹوریم، چرچ گیٹ (بمبئی) ۲۵ اپریل ۱۹۸۶ع کو ہورہا ہے۔ سوا سو سالہ بمبئی یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر ایم ڈی لیمیٹے کانفرنس کا افتتاح کررہے ہیں اور صدر بلدیۂ بمبئی جناب دتّا نلوادے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کررہے ہیں۔ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند (دہلی) کے صدر ڈاکٹر محمد حسن صدارت کرینگے۔ خوشی کی بات ہے کہ ایک سو گیارہ سالہ انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب کی انتھک مساعی کا نتیجہ ہے کہ یہ کانفرس بمبئی میں ہورہی ہے۔

مندوبین حضرات کانفرس کے مختلف اجلاسوں میں اپنے مقالے پیش کرینگے اور اپنے اپنے علاقوں سے متعلق اردو کے تعلق سے اظہار خیال فرمائینگے اور اختتامی اجلاس میں مہاراشٹر کے ان اردو اساتذہ کو سندات پیش کی جائینگی جو دانشگاہوں سے سبکدوش ہوگئے ہیں۔ یہ کانفرنس ۲۷ اپریل کی شام میں اختتام پذیر ہوگی۔

اس ضمن میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صدر انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کے مکتوب کے پیش نظر انجمن اسلام کے صدر نے انکی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میزبانی کے فرائض قبول کرنے میں خوشی محسوس کی۔ لیکن ملا پورم (کیرالہ) میں منعقدہ کانفرنس کے بعد مختلف تیکنکی مشکلات کا سامنا کرنا

پڑا ملکہ ہر بار کسی نہ کسی چنوتی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ آخر میں مارچ ۱۹۸۶ع کے وسط میں صدر انجمن اساتذۂ اردو نے کانفرنس کے انعقاد کی منظوری دیدی اور انجمن اسلام اور اسکے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے فعال اور سرگرم متعلقہ حضرات نے اس کانفرنس کے انعقاد کی ذمہ داری کو قبول کرلیا۔ ہوسکتا ہے کہ ان حالات میں کچھ غلطیاں سرزد ہوجائیں جو قابل درگذر تصور کیجائینگی۔

پاکستانی ادبا کی تشریف آوری اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں :

مشاہیر پاکستانی اردو شخصیتوں میں جناب مشفق خواجہ صاحب اور ڈاکٹر ممتاز حسین صاحب نے ہماری انسٹی ٹیوٹ میں تشریف لاکر ہماری عزت بڑھائی۔ دونوں حضرات نے انسٹی ٹیوٹ کے کاموں کو سراہا اور اسکے ترجمان نوائے ادب کے معیار کے بارے میں اظہار خیال فرمایا۔ ہم ان دونوں حضرات کے ممنون ہیں اور امید کرتے ہیں کہ بین الملکی سطح پر انسٹی ٹیوٹ اور نوائے ادب کے فروغ میں وہ اپنی مساعی کو جاری رکھینگے۔

انجمن اسلام کے صدر حافظکا صاحب کا انتقال :

انجمن اسلام کے ماضی صدر جناب عبدالقادر حافظکا صاحب نے ۸ اپریل ۱۹۸۶ع کو ستر سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ خدا انہیں فردوس بریں میں جگہ عطا کرے - آمین ! ایک تعزیتی جلسہ ۲۵ اپریل ۱۹۸۶ع کی شام میں انجمن اسلام کمپلیکس، بوری بندر (بمبئی) میں سابق وزیر اعظم جمہوریۂ ہند عالیجناب مرارجی دیسائی کی صدارت میں منعقد ہورہا ہے مہاراشٹر کے وزیر اعلی جناب شنکر راؤ چوہان، بلدیہ بمبئی کے میئر جناب دتا نلاودے، حزب مخالف کے لیڈر جناب شرد پوار، رکن پارلمان جناب شانتی پٹیل، سابق وزیر مہاراشٹر ریاست جناب مصطفی فقیہ اور انجمن اسلام بمبئی کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا نے اس تعزیتی جلسہ میں مرحوم حافظکا صاحب کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرینگے۔

— مدیر

ڈاکٹر منظر اعظمی
ریڈر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی،
جموں (کشمیر)

اردو کی ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا سرسری جائزہ

رجحان یا میلان اردو میں Trend کے معنوں میں استعمال ہے۔ رجحان ایک خاص ذہنی رویہ، مخصوص نہج اور الگ اسلوب یا طرز کی ابتدا اور اس کے پھیلنے اور وسیع ہونے سے عبارت ہے۔ یہ ایک غیر شعوری رویہ ہے یہ ایک فرد یا افراد میں یکساں پنپ سکتا ہے۔ رجحان کسی خاص فکر ہی کے سمت نہیں پیدا ہوتا حالات کے تقاضے کے طور پر بھی جنم لیتا ہے۔ دبستان یا اسکول رجحان یا تحریک نہیں ہوتا۔ دبستان کا تعلق کچھ مخصوص قواعد وضوابط اور ان کی پیروی پر اصرار کرنے سے ہے اس کا کسی شہر سے نسبت دینا روا نہیں۔ اس لئے کہ ایک شہر میں کئی دبستان یا مکاتیب ہوسکتے ہیں اسکا تعلق تدریس اور حلقہ بگوشی سے ہے اور اس میں ایک بانی یا قائد کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے تحریک کے لئے ایک قائد دستور العمل اور ایک مقصد کی موجودگی ضروری ہے تحریک میں تبلیغ، جد وجہد اور شعوری کوشش کو خاص دخل ہے۔ تنظیم اگرچہ اسکے لئے ضروری نہیں لیکن ایک ڈھیلی ڈھالی تنظیم کچھ غیبی اور کچھ نمایاں ہاتھ کی موجودگی ہر تحریک کے پس پشت نظر آتی ہے۔

اردو میں کچھ رجحانات قوی ہیں کچھ کم قوی رجحانات ہیں اور کچھ معمولی رجحانات - قوی رجحانات میں ایہام گوئی کا رجحان، مقفٰی اور مسجع عبارت آرائی کا رجحان، سلیس نثر نگاری کا رجحان، ہیئتی تجربوں کا رجحان، قومی شعور اور شاعری کا رجحان، ادب لطیف کا رجحان، بھاشائی اسلوب اور موضوع کے احیا کا رجحان اور ابہام اور لب ولہجے کی تبدیلی یا جدیدیت کا رجحان شامل ہے کم قوی رجحانات میں مرثیوں میں رزم کا رجحان - انگریزی کے زیر اثر انگریزی الفاظ کے استعمال کا رجحان - گھن گرج اور بلند آہنگی کا رجحان اور مذہبی احیائیت کا رجحان شمار ہوسکتا ہے معمولی رجحانات بھی ہیں مثلاً رسالہ پن اور نسائیت کا رجحان وغیرہ - تحریکوں میں صحیح معنوں میں منظم تحریکیں دو تھیں ترقی پسند

تحریک اور ادب اسلامی کی تحریک غیر منظم یا نیم منظم تحریکوں میں فارسیت کی تحریک، ایہام گوئی کی مخالفت کی تحریک، نظم نگاری کی تحریک اور علی گڈھ تحریک شامل ہیں

اردو کی ابتدا میں ہندی یا ہندوی روایت کا خاصا گہرا اثر تھا فارسی زبان کے اثرات سے فارسیت کا رجحان بھی پیدا ہوا اور اس طرح ان میں ایک خاص مدت تک کشمکش چلتی رہی ایک زمانے میں یعنی سولہویں صدی عیسوی میں بھاشا کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے مگر سترہویں صدی عیسوی میں فارسیت کے رجحان اور ۱۸ ویں صدی میں ہندوی کو متروک بنانے کی شعوری کوششوں نے اردو کو فارسی سے قریب کرنا شروع کردیا اس سلسلے میں اصلاح زبان کی شعوری کوششوں سے بھی بڑھاوا ملا اس ذیل میں دلی کا کافی بڑا حصہ ہے شاہ ظہور الدین حاتم خان آرزو اور میر ومرزا نے فارسی اشعار، فقروں اور افعال و اسما سے فائدہ اٹھاکر اردو کو مالا مال کیا اسی عرصے میں ایہام گوئی کا ایک قوی رجحان پیدا ہوا جس سے اردو کا پلڑا پھر ہندوی یا بھاشا کی طرف جھکتا دکھائی دیا مگر ۳۰ چالیس سال کی مختصر مدت ہی میں اس کی مخالفت بھی شروع ہوگئی اور مرزا مظہر، حاتم اور میر ومرزا نے اسکی مخالفت کرکے اردو کو پھر سے فارسی کے قریب لا کھڑا کیا اور فارسی سے استفادے کی لے تیز ہوتی گئی۔

اصلاح زبان کی کوششیں فارسیت کی تحریک ہی کا ایک حصہ تھیں ان سے یہ فائدہ ہوا کہ زبان میں باقاعدگی اور وسعت پیدا ہوگئی اور اردو زبان کا اردو پن نکھر آیا اور ایسا کلچر وجود میں آیا جسے ہم اردو کلچر کہہ سکتے ہیں اس کلچر کی ترکیب میں عجمی حسن ہندوستانی ملاحت اور عرب کا سوز و ساز شامل تھا اسے مرزا مظہر نے تطہیر کے خیال سے، خان آرزو اور انکے عقیدت مندوں نے ادبی نکتہ نظر سے اور ناسخ اور انکے شاگردوں نے لسانی اور اسلوبیاتی پہلو سے پروان چڑھایا۔ اس کی ابتدا اگرچہ شاہ سعداللہ گلشن کے ولی کو فارسی کے استعمال کے مشورے سے ہوئی مگر لے میں تیزی ایہام گوئی کی مخالفت کے بعد پیدا ہوتی اور اولیت کا سہرا شاہ حاتم کے سر بندھا انہوں نے نامانوس ہندی اور بھاشا (بیشتر دکنی الفاظ کو) اردو سے خارج کرکے ولی کی فارسیت کی روایت سے اسکا

سرا جوڑ دیا اور اس طرح شاہ سعد اللہ گلشن کی خواہش کے مطابق فارسیت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ میر رشک اور میر عشق کی کوششوں پر ختم ہوگیا۔

اصلاح زبان کے سلسلے میں شاہ حاتم کا نام قدر سے لیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ پہلے مصلح زبان ہیں جنھوں نے تشکیل زبان میں حصہ بھی لیا ایہام گوئی کے شاعر ہونے کے باوجود اس کی مخالفت میں بھی پیش پیش رہے، زیادہ عمر کے سبب زبان کی کاٹ چھانٹ کے مختلف مرحلوں میں بھی شامل رہے اور اپنے دیوان کا انتخاب بھی کیا اور اس انتخاب میں سختی سے وہی اشعار اپنائے جو قدامت اور دکنیت سے پاک وصاف تھے مرزا رفیع سودا سعادت یار خان رنگین، محمد امان نثار اور مکند سنگھ فارغ ان کے شاگردوں میں تھے انھوں نے اپنے دیوان زادہ کے مقدمے میں اشعار کے انتخاب کے وجوہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انکے نزدیک کیا چیزیں جائز اور روا اور کون سے الفاظ متروک ہیں مختصراً یہ کہ حاتم نے اپنے معاصرین سے آگے بڑھکر زبان کے حسن اور صوتی مناسبت کا سب سے پہلے احساس کیا اور بعض صورتوں میں مناسب اصلاحیں تجویز کیں اگرچہ حاتم کی اصلاحات مکمل بھرپور اور پورے طور پر شستہ ورفتہ نہیں تھیں مگر یہی کیا کم تھا کہ انھوں نے نہ صرف ٹھوس تجاویز مرتب کیں بلکہ ان پر پہلے خود عمل کیا اور اپنے دیوان کا انتخاب مرتب کیا اور وہ اشعار نظری کردیے جس میں ان کے اصولوں کے مطابق کوئی سقم تھا اور الفاظ کا املا اسی طرح استعمال کیا جس طرح اسے تجویز کیا انھوں نے بہت سی فارسی ترکیبوں اور الفاظ کو رواج دینے کی کوشش کی مثلاً بحر عمیق عشق، ترک رسم دوستی، حرم بخش عاشق غم خوار بردہ چشم نما شمشیر جوش غلاف تختہ مشق طمیماں لب حیرت زدہ جراح زخم عشق اور آبـــرو بخش مرداں وغیرہ۔ اس کے علاوہ انھوں نے پوری کوشش کی کہ زبان میں سادگی، صفائی برجستگی اور روانی بھی رہے۔ اس طرح حاتم نے پہلی بار لسانی اور عروضی سطح پر زبان پر تنقیح کا عمل کیا۔

میر ومرزا جیسے دیو قامت شاعروں نے بھی فارسی تراکیب اور الفاظ اور فارسی رنگ وآہنگ سے استفادہ کرکے اردو کو اور بلند، وسیع اور مالامال کیا اور اسے بے شمار موضوعات پر اظہار کی قدرت عطا کی انھوں نے فارسی مصادر

سے اردو الفاظ تراشے بلکہ ترجمہ کیے اور انہیں شعروں میں استعمال کیا بہت سے فارسی شعروں کو اردو میں منتقل کیا۔ بے شمار فارسی عربی مرکبات بناکر اردو کے لفظوں کے خزانے کو بھر دیا۔ اگرچہ انہوں نے خود بھی بہت سے اصولوں کی پابندی نہیں کی۔ غالباً وہ اردو کو محدود کرنے کے بجائے وسیع کرنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ جس خیال یا مضمون کو وہ باندھنا چاہتے تھے قواعد سے ہٹ کر بھی انہیں باندھ جاتے تھے۔

اصلاح زبان کے سلسلہ میں شیخ امام بخش ناسخ کا ذکر بہت ہوتا ہے۔ وہ ایک بڑی شعری شخصیت تھے جن کے لئے مشہور ہے کہ وہ طرز قدیم کے منسوخ کرنے والے اور پرانی سادہ گوئی کے واقعی ناسخ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناسخ نے ایک نئے اور متاثر کن اسلوب کی بنیاد رکھی اصلاح زبان اور تذکیر وتانیث کے سلسلے میں انہوں نے نہ تو کوئی قاعدہ مرتب کیا اور نہ خود اس پر عمل پیرا ہوئے بقول رشید حسن خاں صاحب۔

"حقیقت یہ ہے کہ متاخرین (امیر وجلال) کے یہاں قواعد شاعری اور متروکات کی جو طویل بحثیں ملتی ہیں۔ وہ رشک کے آخری عہد کی پیداوار ہیں ناسخ وآتش سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔ رشک آخر میں کربلائے معلی چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۲۸۴ھ میں ان کا انتقال ہوا لیکن ان کا تیسرا دیوان جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ان متروکات سے پاک ہے جو ان کے پہلے دو دیوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۲٦٧ھ یعنی وفات ناسخ کے کم وبیش تیرہ سال بعد مرتب ہوا۔ (کلیات میر ص ۵۹۴) اور تیرہ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے" (۱) تلخیص معلی (۱۲۸۰ھ) مصنف ڈپٹی کلب علی خاں نادر شاگرد ناسخ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ استاد مرحوم نے تذکیر و تانیث کے سلسلے میں کوئی رسالہ نہیں لکھا تھا (۲) رشید حسن خان صاحب نے صراحت سے لکھا ہے کہ "ناسخ کی ایسی کوئی تحریر اب تک سامنے نہیں آئی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ انہوں نے قواعد شاعری

۱- انتخاب ناسخ مقدمہ رشید حسن خان ص ۷۷

۲- ملاحظہ ہو تلخیص معلی مرتبہ ڈاکٹر انصار اللہ نظر ص ۸ - ۱۰

کے سلسلے میں کیا نئی پابندیاں عائد کیں یا متروکات میں کیا اضافے کیے۔ عہد ناسخ کی کوئی دوسری تحریر بھی ایسی نہیں ملتی جس میں اصلاحات ناسخ کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو۔» (۱)

اس سے بہر حال یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اصلاح زبان کے سلسلے میں ناسخ کا کوئی کارنامہ نہیں البتہ ان کے شاگردوں خصوصاً میر رشک، کلب علی خاں نادر اور میر عشق وغیرہ نے اصلاح زبان کے سلسلے میں متروکات کی فہرستیں بنائیں اور زبان کو کانٹ چھانٹ کر سنوارنے اور ایک معیار مقرر کرنے کی کوشش کی۔ رشک کی نفس اللغۃ نادر کی تلخیص معلا اور میر عشق کے مجموعہ مراثی گلزار غم کا دیباچہ اس کے بین ثبوت ہیں۔

۱۸ ویں صدی کی نثر میں آسان اور سادہ مشکل ادق اور مقفی مسجع دونوں اسالیب ملتے ہیں مذہبی تصانیف اور تراجم عموماً آسان نثر میں ہیں، جبکہ ادبی کتابیں بیشتر مرصع اور مقفی نثر میں ہیں مہر افروز اور دلبر کے علاوہ باقی نثری ادبی کتابیں مشکل اور مقفی نثر میں ہیں۔ کربل کتھا فارسی نما نثر اور ہے۔ نو آئین ہندی القصہ نسبتاً صاف ستھری اور سلیس زبان میں ہے۔ ۱۹ ویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج نے اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر سلیس اور آسان نثر کو پروان چڑھایا مگر کالج کے باہر اس کا اثر نہیں ملتا بلکہ فسانۂ عجائب کے اسلوب کو فروغ حاصل ہوتا رہا

اس سلسلے میں فسانہ عجائب کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ع میں سرور نے جب جان عالم کے قصے کو اپنے ایک دوست کی فرمائش پر لکھنا شروع کیا تو آسان نثر میں لکھا جس میں زیادہ سے زیادہ سہل ممتنع کا اہتمام تھا۔ مگر جب ۱۲۵۹ھ ۱۸۴۳ع میں اس کا پہلا ایڈیشن شایع ہوا تو وہ مقفی اور مسجع اور رنگین نثر میں تھا[۲] اور یہی اسلوب سرور کی شناخت

۱۔ انتخاب ناسخ مقدمہ - رشید حسن خاں ص ۷۷

۲۔ ملاحظہ ہو فسانہ عجائب کا بنیادی متن - مرتبہ ڈاکٹر محمود الہی مقدمہ ص ۱۷

بن گیا حالانکہ یہ تبدیلی دہلی کی لسانی برتری سے لکھنؤ کی علیحدگی کی کوششوں کا ایک حصہ تھی۔ اس خطی نسخے میں میر امن اور ان کی باغ وبہار کا بھی کوئی ذکر نہیں سید اعظم علی اکبر آبادی کی فسانہ سرور افزا (۱۸۲۴ع) محمد بخش مہجور کی گلشن نو بہار منشی سدا سکھ لال کا مجموعہ قوانین (۱۸۳۴ع) فقیر محمد گویا کی بستان حکمت (۱۸۳۵ع) نیم چند کھتری کا ترجمہ گل صنوبر ۱۸۳۷ع مولوی قطب الدین دہلوی کی ظفر جلیل (۱۸۲۷ع) اور مظاہر حق (۱۸۳۸ع) مفتی صدر الدین آزردہ کے خطوط امام بخش صہبائی کا ترجمہ حدائق البلاغۃ (۱۸۴۲ع) سرسید احمد خاں کی آثار الصنادید (پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ع) سبھی کم و بیش فارسی آمیز اور رنگین نثر میں ہیں خواجہ فخر الدین حسین سخن کی سروش سخن، جعفر علی شیون کی طلسم حیرت الف لیلا کے مختلف ترجمے داستان امیر حمزہ بوستان خیال اور دوسرے غیر معروف قصوں مثلاً قصہ بہرام گور قصہ اگر وگل حکایت سخن سنج قصہ ممتاز اور گلشن خاں افزا سبھی میں سرور کی پر تصنع اور فارسیت زدہ رنگین نثر کی روایت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں سلیس نثر نگاری کے رجحان کی پرورش کی گئی اس سے پہلے قواعد ولغت کی تدوین کی اولین کوششیں بھی کی گئیں ان دونوں سلسلوں میں انگریز مصنفوں اور اردو نوازوں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جان جوشوا کٹلر، بنجامن شولز، مسٹر گلسٹن، ہیڈلے، فرگوسن، ڈاکٹر فرانسیس بال فور اور کپتان جے رس کی خدمات قابل تحسین ہیں ان سب میں نمایاں اور ممتاز نام ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے جو لغت وقواعد اور زبان وادب سے متعلق سترہ کتابوں کا مصنف اور مرتب تھا فورٹ ولیم کالج نے ہندوستان میں برطانوی مفاد کو مضبوط کرنے اور انگریزی حکومت کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں انگریز افسروں کو آسان زبان میں اردو پڑھانے کے لئے آسان اور سلیس نثر میں نصابی کتابیں تیار کروائیں۔ ان تصنیفات کی ادبی اہمیت ہے اور اس پہلو سے بھی کالج کی یہ کاوشیں قابل قدر ہیں کہ ان میں شعر وشاعری اور قصے کہانیوں کے علاوہ متعدد دوسری اصناف اور علوم وفنون پر بھی کتابیں تیار کرائی گئیں جو اردو میں موجود نہ تھیں اس کالج میں ہندوستانی ملازمین کی تعداد ۴۲ تھی جز وقتی ملازمین ۱۰ تھے تصنیف

وتالیف اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تعداد ۶۰ تھی جو کالج نے تیار کروائیں ان کتابوں سے اردو نثر کے خزانے میں اضافہ ہوا آسان اور سلیس نثر کے اسلوب میں معیاری نمونے سامنے آئے۔ انگریزی سے ترجموں اور اردو مطابع کے قیام نے اردو کی رفتار ترقی کو مہمیز کیا

اردو مرثیوں میں بین ورثا کا ہی رواج تھا غیر رثائی اجزا کو شامل مرثیہ کرنے یعنی مرثیوں میں رزم کے مضمون کی ابتدا کرنے کا سہرا عموماً میر ضمیر کے سر بندھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر ضمیر نے طرز نوی ہی ایجاد کیا تھا۔ اور یہ طرز نوی سراپا نگاری کا تھا ویسے میر ضمیر نے سراپا کے ساتھ رزم اور صف آرائی کی پہل کا بھی دعوی کیا ہے

ہے ولے صد ہزار شکر خدا — کہ مری طرز ہے سبھوں سے جدا
طرز یہ مرثیہ کی ٹھہرائی — کہ سراپا ہو اور صف آرائی
پایا میرے کلام نے یہ رواج — کہ نہیں ہے بیاں کا محتاج
(مظہر العجائب)

میر ضمیر کے اس دعوے کو ڈاکٹر مسیح الزماں تسلیم نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ مرثیے کے آٹھوں اجزا جو فرض کیے گئے ہیں میر ضمیر سمیت کسی بھی مرثیہ نگار نے اس کی پیروی نہیں کی اس لیے یہ کہنا کہ ان اجزا کا تعین میر ضمیر نے کیا صحیح نہ ہوگا لیکن علی جواد زیدی صاحب اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتے اور رزم نگاری کی ابتدا کا سہرا میر ضمیر ہی کے سر باندھتے ہیں [۱]

سماجی اور مفید علوم وفنون پر لکھنے کی تحریک اگرچہ ادبی تحریک نہیں تھی مگر اس تحریک نے اردو ادب میں بڑے متنوع اضافے کیے۔ اس تحریک کو پھیلانے میں بہت سے اداروں نے حصہ لیا اس سلسلے میں سب سے اہم نام دلی کالج اور اس کی ٹرانسلیشن سوسائٹی کا ہے جس نے بڑی مفید علمی اور سائنسی کتابیں تصنیف وترجمہ کروائیں۔ کالج کے پرنسپل اور اساتذہ کی خدمات بھلائی

۱۔ ملاحظہ ہو مضمون "مرثیے کی ہئیت" مشمولا ماہنامہ آج کل دہلی ۱۹ نمبر جون ۷۵ع ص ۱۴

نہیں جاسکتیں. اسی طرح شمس الامرا ثانی محمد فخر الدین خان نے دکن میں مغربی زبانوں سے تقریباً ۷۵ کتابیں اردو میں منتقل کروائیں دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے اصول بھی منضبط کیے یہ وہ اصول تھے جو آج بھی ترجمے کے فن کے سلسلے میں نہایت کارآمد ہیں دلی کالج نے مختلف موضوعات پر ۱۲۸ کتابیں تصنیف وتالیف اور ترجمہ کروا کے اردو ادب کے خزانے میں زبردست اضافہ کیا اور اردو زبان کو علمی معیار ہی عطا نہیں کیا بلکہ علمی تحقیق اور تجسس کے رجحان کو بھی بڑھاوا دیا[1]

مغربی علوم وفنون کی ترویج واشاعت سے انگریزی شعر وادب سے استفادے کا جذبہ عموماً بڑھتا ہی گیا۔ ۱۸۶۷ع میں آزاد نے انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں «خیالات در باب نظم اور کلام موزوں» کے عنوان سے جو لیکچر دیا تھا وہ بذات خود انگریزی علوم فنون سے استفادے پر زور کے علاوہ انگریزی علوم وفنون سے استفادے کی ایک شکل تھی ۱۸۴۲ع میں حالی نے انگریزی کی ایک نظم کا ترجمہ «جوان مردی کا کام» کے عنوان سے کیا۔ اسی عرصے میں خود آزاد نے بھی کچھ نظمیں مکمل یا نامکمل کہی تھیں جو شایع نہ ہوسکی تھیں، اسماعیل میرٹھی نے انگریزی کی چار نظموں کپڑا، ایک قانع موس، موت کی گھڑی اور فادر ولیم کے نام سے انگریزی نظموں کو اردو لباس عطا کیا مولوی میر حسن کا کہنا ہے کہ «ترجموں میں انھوں (آزاد) نے آزادی سے کام لے کر انگریزی خیالات کو اردو نظم کا جامہ پہنایا مجموعۂ نظم آزاد میں ان کی ایک نظم ہے جس کا عنوان «اولوالعزمی کے لیے کوئی سد راہ نہیں» ہے یہ لارڈ ٹینی سن کی نظم ایکسیلسیئر، کے انداز پر لکھی گئی ہے اسی رنگ کی دوسری نظمیں ایک تارے کا عاشق، معرفت الٰہی، اردو مثنوی شرافت وغیرہ ہیں»[2] استفادے کی ان شکلوں نے لوگوں کو موضوعات کے تحت نظم نگاری کی طرف مائل کیا۔ کرنل ہالرائیڈ نے باقاعدہ

۱۔ ملاحظہ ہو «قدیم دلی کالج، مرتبہ مالک رام مکتبہ جامعہ نئی دہلی طبع دوم اکتوبر ۱۹۷۶ع

۲۔ «مغربی تصانیف کے اردو تراجم» از مولوی میر حسن ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد ۱۹۳۹ع ص ۱۰۴

اس کی تجویز انجمن کے جلسے میں رکھی۔ نظم نگاری کی اس تجویز کی تحریک حکومت پنجاب کی طرف سے تھی[1] مولوی محمد حسین آزاد اور دوسرے شرکاء نے اس کی تائید کی اور اس طرح موضوعی مشاعرے کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ مشاعرے انجمن پنجاب کے دفتر میں ہوتے تھے جس کی روداد انجمن کے رسالے میں چھپتی تھی۔ اس کے علاوہ انجمن پنجاب سے اس مشاعرے کا اور کوئی تعلق نہیں تھا[2] پہلا مشاعرہ ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کو ہوا تھا۔ ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ کا انجمن کا جلسہ مشاعرہ نہیں تھا جیسا کہ پنڈت کیفی اور ڈاکٹر صادق نے خیال ظاہر کیا ہے اس لیے کہ اس میں مشاعرے کی تجویز پاس کی گئی تھی اور ہالرائیڈ اور آزاد اور دوسرے لوگوں نے تقریریں کی تھیں اور صرف آزاد نے اپنی نظم "شب قدر" سنائی تھی ظاہر ہے یہ مشاعرہ نہیں تھا۔ پہلے مشاعرے کا موضوع "برسات" تھا زمستان دوسرے مشاعرے کا تھا اس طرح کے کل ۹ مشاعرے ہوئے جن میں مختلف موضوعات کے تحت مختلف شعرا نے نظمیں کہیں ان نظموں اور مشاعروں پر تنقیدیں بھی ہوئیں مگر بہر حال آہستہ آہستہ نظموں کی افادیت اجاگر اور دلنشین ہوتی گئی آزاد نے اپنے خطبات اور سرسید احمد خان نے اپنے مضامین کے ذریعہ اس نئے شعری رجحان کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اسے باقاعدہ پروان چڑھانے کے بھی جتن کیے اس سے سرسید کی دلی تمنا برآئی تھی جس کا اظہار انھوں نے آزاد کے نام اپنے ایک خط میں کیا ہے[3] اسی سلسلے میں حالی اور آزاد دونوں نے شعر کے مقصد اور اسکی افادیت کے سلسلے میں اظہار خیال کیا حالی نے ایشیائی شاعری کی وسعت کی بات کی جس کے در وسعت پر عشق اور مبالغے کی حکمرانی تھی۔ آزاد نے خیال پسندی، استعاروں کی پیچیدگی اور زبان کی آرایش کو قابل نفریں ٹھہرایا سرسید نے بھی اس کے نیچرل ہونے پر زور دیا اس طرح نظم نگاری کو بتدریج فروغ ہوتا گیا اور شاعری میں مختلف تجربوں خصوصاً ہئیت شاعری میں تجربوں کی رو چل

۱۔ ملاحظہ ہو کرنل ہالرائیڈ کی تقریر بحوالہ "محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار" از ڈاکٹر محمد صادق ص ۵۸ - ۵۷

۲۔ محمد حسین آزاد "حیات اور تصانیف" از ڈاکٹر اسلم فرخی ص ۹۵ - ۲۹۴

۳۔ ملاحظہ ہو خطوط سرسید مرتبہ راس مسعود نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۱ء ص ۲۲

پڑی اسماعیل میرٹھی نے بےقافیہ نظمیں لکھیں۔ شرر اور طبا طبائی نے بھی بےقافیہ اور معرّیٰ نظمیں لکھیں۔ سنٹوں کی نئی تشکیل بھی شروع ہوئی۔ استانسرے، سانیٹ وغیرہ نظم کی مختلف شکلیں وجود میں آتی گئیں اور اس طرح اردو شاعری میں کسی موضوع یا پابندیٔ خیال کے تحت نظم لکھنے کی ابتدا ہوئی جو بعد میں ترقی پسندوں کے ذریعے بڑے زور وشور سے نہ صرف وسیع ہوئی بلکہ غزل کے دائرۂ اثر میں بھی داخل ہوگئی اور وہ زمانہ بھی آیا جب غزل کی گردن بےتکلف ماردینے اور اس کے نیم وحشی صنف سخن ہونے کی بات کہی گئی۔

اردو کی ادبی تحریکوں میں علی گڈھ تحریک سب سے اہم، ہمہ گیر اور دور رس اثرات کی حامل تحریک تھی یہ اگرچہ خالص ادبی تحریک نہیں تھی مگر سرسید کی سیاسی، مذہبی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی کوششوں کے نتیجے میں اردو شعر وادب کو بھی ایک نئی جہت ملی اور اس نئی جہت کی تبلیغ، ترسیل اور تشہیر مختلف ادبی اور تہذیبی وسائل کے ذریعے تن دہی سے کی گئی اس ادبی تحریک کی لغوی معنوں میں کوئی تنظیم نہیں تھی مگر سرسید کی سیاسی سماجی اور تعلیمی تحریک چونکہ منظم تھی اس لیے اس تحریک سے ادبی تحریک کو بھی غذا ملتی رہی اور بالواسطہ طور پر یہ بھی ایک منظم تحریک بن گئی جسکو سائنٹفک سوسائٹی محمڈن ایجوکیشنل کانفرس، تہذیب الاخلاق اور ایم اے او کالج کے ترجمانوں اور علم برداروں نے تحریر، تصنیف اور تخلیق کی سطح پر اتنا بلند کیا کہ وہی اردو شعر وادب کا معیار بن گئی یہ تحریک اگرچہ سرسید کے انگلستان سے واپس آنے کے بعد ۱۸۷۰ع میں باقاعدہ طور پر منظم ہوئی مگر اس کی داغ بیل غازی پور کے انگریزی اسکول اور سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد پڑنے کے وقت ہی سے ڈالی جاچکی تھی

اسکی پہلی فکری بنیاد مادیت اور ترقی تھی اس سلسلے میں انہوں نے مسلمانوں کو نہ صرف انگریزی سے استفادے کا مشورہ دیا بلکہ انگریزوں کی دوستی کو بھی حق بجانب ٹھہرایا انہوں نے نہ صرف عیسائیت اور اسلام کو قریب ثابت کیا بلکہ مسلمانوں کے نظریۂ جہاد کی وہ تعبیر کی جو انگریزوں کو راس آتی تھی اسکی دوسری فکری بنیاد عقلیت تھی سرسید کا خیال تھا کہ نہ صرف ادب

میں خیالی جذباتیت سے کام نہیں چلے گا بلکہ مذہبی اور دوسرے سماجی امور میں عقلی اور استدلالی انداز نظر ضروری ہے اس تحریک کی تیسری بنیاد تصور اجتماعیت پر تھی یعنی سرسید کا خیال تھا کہ سوسائٹی کو ذہنی اور اجتماعی طور پر مسلسل ترقی کی طرف مائل ہونا چاہئیے اسی سلسلے میں انھوں نے آزادی رائے اور رسم ورواج کو تبدیل کرتے رہنے پر زور دیا۔ اس ضمن میں انھوں نے انفرادی کے بجائے اجتماعی تعلیم پر اصرار کیا اور دوسرا ان کا تصور قومیت تھا جس کے تحت انھوں نے اختلاف رکھتے ہوئے بھی اتحاد ویگانگت پر زور دیا تھا ان کے فکر کی چوتھی بنیاد ان کی نیچریت تھی ان کا خیال تھا کہ ادب وتہذیب کا اصول قدرت کے مطابق ہونا اور مبالغے اور جذباتیت کی جگہ حقیقت اور اصلیت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اسی خیال کو حالی نے مقدمہ شعر وشاعری میں بھی بیان کیا۔

اس تحریک کی مرکزی اور محوری شخصیت خود سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے مختلف علوم وفنون پر متعدد کتابیں اور مضامین لکھے لیکن انھوں نے شعر وادب اور عروض وبیان کے سلسلے میں جو خیالات ظاہر کیے وہ بعد کے محققوں ناقدوں اور شاعروں کے لیے رہنما اصول بن گئے ادب کا افادی ہونا، ہئیت اور اسلوب میں تجربے، نیچرل نظموں کو بڑھاوا یہ سب انھیں کے خیالات کا ثمر تھا۔ ان خیالات کی ترویج واشاعت میں تہذیب الاخلاق، نے اہم رول ادا کیا اور بقول مولانا ابوالکلام آزاد «مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڈھ میں صرف ایک کالج ہی نہیں قایم کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کردیا تھا۔ اس حلقے کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اسکے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہوگئے تھے ہندوستان کے کسی مرقت المشیوع رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہونگے جیسے کہ تہذیب الاخلاق سے مرتب ہوئے۔[1]

علی گڈھ تحریک کے اولین معماروں میں مولانا الطاف حسن حالی تھے جنھوں نے مقدمہ شعر وشاعری کے ذریعہ ادب کو اخلاق اور افادیت کا تابع کردیا۔ نظم نگاری کی تحریک کو فروغ دیا سوانح کے فن کو ترقی دی اور ڈیڑھ درجن ادبی

۱۔ کانویکیشن ایڈریس، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰ فروری ۱۹۴۹ ع

اور غیر ادبی تصانیف، تالیفات اور تراجم کے ذریعہ اردو ادب کے دامن کو مالامال کیا۔ مولانا شبلی نعمانی تھے جو نہ صرف بلند پایہ شاعر تھے بلکہ صاحب طرز انشاء پرداز اور بالغ نظر محقق اور نقاد بھی تھے

انھوں نے سیرت وسوانح ، فلسفہ وکلام، سفر نامہ، تاریخ تعلیم، خطبات، خطوط، کلیات اور مقالات کے ذریعہ اردو کے روشن ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا تاریخی تنقید وتحقیق کا حق ادا کیا سوانح اور تاریخ کا ترقی پسندانہ انداز نظر پیش کیا۔ تقابلی مطالعے کی داغ بیل ڈالی اور اس طرح اردو ادب میں گراں قدر تصنیفات وتالیفات کا اضافہ کیا ڈپٹی نظیر احمد نے ناولوں کی بنیاد رکھی۔ اخلاق، مذہب، منطق، علم ہئیت، قواعد اور انگریزی اور عربی سے تراجم کے ذریعے اردو علم وادب کو بہت کچھ دیا۔ ان کے لیکچرس اور «نظم بے نظیر» بھی ادبی حیثیت سے کم اہم نہیں محسن الملک کے مضامین چراغ علی کی تحقیقات اور استدلالی انداز نظر، نواب وقار الملک کے مضامین، مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہندوستان، سید حسین بلگرامی کے رسائل عماد الملک، عبدالحلیم شرر کے انشائیے، ناول اور مضامین اور مولانا وحیدالدین سلیم کی تصنیفی اور تالیفی خدمات سب اسی ادبی تحریک کے قبائے حق کے مختلف نقوش ہیں جن کی افادیت اور اہمیت ہمیشہ مسلّم رہیگی

علی گڈھ تحریک نے عقلیت، مغرب پرستی اور ہئیتی تجربوں کی جو فضا پیدا کی اس نے آزادہ روی کو پروان چڑھایا اور دوسری طرف سرسید کی بڑھتی ہوئی عقلیت سے جہاں ان کے قریبی رفقا خصوصاً شبلی نعمانی نے انحراف کیا نئی نسل نے اس سے متاثر ہوکر عقلیت کے برعکس جذباتیت اور رومانویت کو گلے لگایا اور چونکہ نئی نسل مغربی ادب سے بہت زیادہ متاثر تھی اس لیے سرسید اور انکے ساتھیوں کے یہاں مذہب کا تھوڑا بہت جو تعلق باقی تھا وہ ان کے یہاں مذہب بیزاری میں بدل گیا چنانچہ ایک نئے رجحان نے جنم لیا جس پر مغرب کی رومانویت اور جمالیت پرستی دونوں کے اثرات تھے ان لوگوں نے شعر وادب میں وجدان کو محور بنایا اور آزادہ روی کے ساتھ ہم آغوش ہوکر عقلیت، افادیت، اخلاقیت اور ادبی مقصدیت سے روگردانی کی انھوں نے علی گڈھ تحریک کی عقلیت، توازن،

تکمیل بیان اور اسلوب کی سادگی کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا اور قـــوم اور معاشرے سے زیادہ فردیت اور انانیت پر زور دیا اس رجحان کو آگے بڑھانے والوں میں سجاد حیدر یلدرم، مہدی الافادی، عبدالرحمن بجنوری، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار جو علی گڈھ کی پیداوار تھے نہ صرف شامل تھے بلکہ پیش پیش تھے ان کے علاوہ نیاز فتحپوری، ل۔ احمد، مجنوں گورکھپوری اور ناصر علی وغیرہ بھی اسکے علم برداروں میں تھے۔ خلیقی دہلوی، بشیر احمد اور سلطان حیدر جوش بھی اس رجحان سے متاثر تھے

اس رجحان کے تحت تخلیق کا ارفع ہونا ضروری تھا اسکا اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونا غیر ضروری سوال تھا۔ وہ ادب کی مقصدیت سے زیادہ اسکے اسلوب کی نفاست اور آراستگی کے قائل تھے۔ ان کو ہر چیز میں خوش سلیقگی اور ہر شئے میں صفائی اور پاکیزگی اور تسکین ذہن کے لئے صنفی حسن کی ضرورت تھی۔ وہ فن کے حسن کے زیادہ قائل تھے موضوع اور مواد کی حیثیت ان کے نزدیک ثانوی تھی عشـق ومحبت، عورت اور مناظر فطرت انہیں بہت عزیز تھے۔ اس طرح یہ ایسے ادیبوں اور دانش مندوں کا قافلہ تھا جو خوش فکر، خوش مذاق، وسیع النظر اور احساس حسن کے قائل لوگوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے اپنے انشائیوں، افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور شاعری کے ذریعے اردو میں متاثر کرنے والی خوبصورت تخلیقات اور فن پاروں کا اضافہ کیا۔ لیکن چونکہ یہ خوشبو اور رنگ کی دنیا اور خوابوں کی وادیوں میں بھٹکنے والے ادبی شہـــزادے تھے اسلئے ترقی پسند ادبی تحریک کی حقیقت نگاری، مقصدیت اور باقاعدہ منظم کوششوں کے آگے ان کی تخلیقـات کو زیادہ دیر تک فـــروغ نہ مل سکا پھر بھی انہوں نے شعری تحریروں، اور اپنی شاعرانہ نثری کوششوں کے ذریعہ خاصی مدت تک ادبی دل ودماغ کو متاثر کررکھا تھا

ترقی پسند تحریک علی گڑھ تحریک کے بعد دوسری اہم سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظم تحریک تھی۔ جس کی کوشش شعوری اور مقصد واضح تھا ادب لطیف کے رجحان اور حسن پرستی کی شدت کے خلاف یہ ایک طرح کا شدید ردعمل تھا۔ اس تحریک نے علی گڑھ تحریک کی عقلیت، مادیت اور اجتماعیت کی

نظریاتی بنیادوں سے جدلی مادیت اور اشتراکی نظام فکر کو جوڑ دیا اس میں قدامت اور جاگیردارانہ سماج سے بغاوت کا رجحان بڑا تیز تھا ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے میں کہا گیا کہ

«ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بناکر روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریںگے جو ہمیں لاچاری ، سستی اور توہم پرستی کی اور لیے جارہے ہیں ۔ ہم ان تمام قوتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تعمیر اور ترقی کا ذریعہ قبول کرتے ہیں »[1]

مولانا حسرت موہانی نے ایک تقریر میں صاف صاف کہا کہ «محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے جدید ادب کو سوشلزم بلکہ کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہئے ۔»[2] اس کے مخصوص تصور کے تحت اسکی دو خصوصیتیں تھیں ایک یہ کہ نیا ادب اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہ راست تعلق رکھتا ہو اور دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے ان خصوصیات کے تحت اشتراکی ادیب نہ صرف اپنی تنظیم اور اسکے مقاصد کا پابند تھا بلکہ سیاسی جدوجہد میں اسکی عملاً شرکت بھی ضروری سمجھی جاتی تھی انہوں نے اجتماعی جنس کے تصور کو عام کیا اور فرائڈ اور یونگ کے جنسی اور نفسیاتی تصورات سے متاثر ہوکر اسکا رشتہ کارل مارکس کے معاشی فلسفے سے جوڑ دیا ۔ اس طرح انہوں نے اشتراکی شعر و ادب کی تخلیق کی ۔ اس تصور سے ہم کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھتے ہوں مگر اس تحریک کے زیر اثر تخلیق کئے گئے نثر اور شعر پارے اردو ادب کا ایک اہم اور گراں قدر حصہ ہیں

۱۔ نیا ادب لکھنو ۔ خاص نمبر جنوری فروری ۱۹۴۱ ع

۲۔ بحوالہ روشنائی از سجاد ظہیر ۔ بار اول ۱۹۵۹ ع ص ۱۳۱

جوش، فراق، فیض، مخدوم، مجاز، سردار جعفری، جذبی، کیفی اعظمی جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، مسعود اختر جمال، علی جواد زیدی، سلام مچھلی شہری، اختر الایمان اور احمد ندیم قاسمی اور دوسرے بہت سے شعرا کی شعری تخلیقات نے اردو کے ادبی ارتقا میں نمایاں حصہ لیا گیتوں میں سید مطلبی فرید آبادی کا ایک اہم مقام ہے افسانوں کو ایک نئی جہت دینے میں سجاد ظہیر احمد علی رشید جہاں اور محمود الظفر نے نمایاں کردار ادا کیا۔ جس کو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، ہنس راج رہبر اور مہندر ناتھ وغیرہ نے اور بلندی تک پہنچایا۔ ناولوں کو نک سک سے درست کرنے اور بلندی عطا کرنے میں کرشن چندر عزیز احمد، بیدی، عصمت، خواجہ احمد عباس، خدیجہ مستور وغیرہ کا نام فراموش نہیں کیا جاسکتا سجاد ظہیر کا بیمار، محمود الظفر کا امیر کا محل، رشید جہاں کا عورت، احمد علی کا آزادی اور عابد گاربر کا ڈاکٹر اردو کے اچھے ڈرامے ہیں اس کے بعد دروازے کھول دو، سرائے کے باہر اور حجامت (کرشن چندر) اس منجدھار میں (منٹو) یہ امرت (خواجہ احمد عباس) یہ کس کا خون ہے (سردار جعفری) فرزانہ۔ قید حیات، پینترے، شکاری اور جونک (اشک) آنسو اور ستارے اور لہو اور قالین (مرزا ادیب) سانپ اور فسادی (عصمت چغتائی) نقل مکانی اور رخشندہ (بیدی) بھوت گھر (حیات اللہ انصاری) اور کرتار سنگھ دگل، خدیجہ مستور ہاجرہ مسرور، ریوتی سرن شرما، ڈاکٹر محمد حسن، پرکاش پنڈت، حبیب تنویر اور اطہر پرویز وغیرہ کے ڈرامے بھی ہیں جو اردو کے ڈرامائی ادب کی زینت ہیں

ترقی پسندوں نے طنز و مزاح، رپورتاژ، خطوط، خاکوں، ڈائریوں اور ترجموں میں بھی نمایاں کام کئے۔ اس کے علاوہ ان کا نمایاں کام تنقید کی صنف میں بھی ہے۔ جس کی وجہ سے اردو تنقید کا ایک خاص مزاج اور ذہن وجود میں آیا۔ اور اسکے زیر اثر لکھے گئے بے شمار مقالے مضامین اور کتابوں نے اردو نثر کے وقار کو بڑھایا اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر احتشام حسین، سجاد ظہیر اختر انصاری، سردار جعفری، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس وغیرہ کم اہم نام نہیں انہوں نے ترقی پسند نکتہ نظر سے

بہت سے ادبی مسائل کی تعبیر و تشریح کی اور مستقل کتابیں اور مقالات کے مجموعے شایع کئے ترقی پسند شاعروں نے بلند آہنگی اور گھن گرج کا جو مزاج نظموں میں پیدا کیا اس نے قومی شاعری اور تحریک آزادی دونوں کو جوش و ولولے سے پر کردیا

ترقی پسند تحریک نے اجتماعی مسائل کو جس طرح انفرادی فکر اور انفرادی تجربوں پر ترجیح دی اور انفرادیت کے رجحان کو فراس کے زوال پسندوں کی گمرہی کا رنگ دے کر جس جماعتی جبر کے ذریعے روکا اس کے نتیجے میں بہت سے شاعر اور ادیب حلقہ ارباب ذوق لاہور کے پلیٹ فارم پر جمع ہونے لگے۔ وہ منفرد طرز احساس، داخلی تپش ایہام، پراسراریت نئے استعاروں اور نئی تراکیب اور امیجز کے ذریعے اردو میں اظہار کے نئے سانچے تراشنے لگے ان کی کوششوں میں تازگی اور جدت بھی اور اس گھٹن کا اظہار بھی تھا جو تنظیمی جبر اور پارٹی کے زیر اثر تخلیقات میں پایا جاتا تھا اور جس کی یکرنگی سے بہت سے ترقی پسند ادیب بھی بیزار تھے اسطرح انفرادیت کے عکس ادب کا رجحان پرورش پانے لگا۔ حلقہ ارباب ذوق کے ارباب ہنر نے داخلی سوز و گداز اندرونی ربط نجی علامتوں کے استعمال اور آزاد تلازمۂ خیال کے ذریعے ہیئت اور پیرایہ اظہار میں انوکھے تجربے کئے جس کا گہرا اثر اردو شاعری پر پڑا

حلقہ ارباب ذوق کے رہنماؤں میں تصدق حسین خالد ڈاکٹر محمد دین تاثیر ن۔ م راشد اور میراجی تھے جن میں میراجی اور راشد نے نمایاں مقام حاصل کرلیا خصوصاً میراجی نے نئی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا راشد اور میراجی نے اپنی نظموں کے ذریعے ہیئتی تجربوں اور فنی تکمیل کے شعور کو عام کیا آزاد نظم انہیں دو شعرا کے باوجود اپنی معنویت اور افادیت آشکار کرتی ہے۔ میراجی کی روایت کا اثر آزاد اور پابند دونوں طرح کی نظموں پر جدید تر شعرا کے یہاں ملتے ہیں نظم کے اعتبار سے حلقۂ ارباب ذوق اگرچہ ایک مقامی تنظیم تھی مگر اثرات کے لحاظ سے یہ ایک رجحان بلکہ ایک تحریک کی طرح پھیلتا گیا اور اس کی متعدد شاخیں بھی قایم ہوئیں اس کے ذریعہ انفرادیت پسندی اور علامت نگاری

کے قوی تر رجحان کی پرورش ہوئی اس نے ادب کے پرکھنے کے لئے نئے جدید زاویے اختیار کیے اور جدید نظم جدید افسانہ اور جدید تنقید کو خالص ادبی اور نفسیاتی نکتۂ نظر کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔

ان کے ادبی مقاصد میں ادب کو بذاتہ مقصد سمجھنا ادبی تجربے اور تخلیق میں علم نفسیات کی مدد لینا، ادب کو اشاراتی اور رمزیاتی بنانا، داخلیت اور لاشعور وغیرہ پر زور دینا اور ادب میں ذات کو اہمیت دینا شامل تھا

حلقۂ ارباب ذوق کا ابتدائی نام "بزم داستان گویاں" تھا مگر بعد میں یوسف ظفر کی تجویز پر اس کا نام تبدیل کرکے حلقہ ارباب ذوق رکھا گیا اس حلقے کے شاعروں میں نمایاں نام میراجی کا ہے جنہوں نے اپنی نظموں اور تنقیدی مضامین کے ذریعے نئی شعری روایت کو مستحکم کیا۔ میراجی کی نظموں کا مجموعہ میراجی کی نظمیں ہے۔ جس کا دیباچہ ان کے شعر و ادب پر انوکھے خیالات کا عکاس ہے۔ دوسرے بڑے شاعر ن م۔ راشد تھے جنکے بارے میں ڈاکٹر شمیم حنفی کا خیال ہے کہ "راشد حلقۂ ارباب ذوق کے شعور کی حیثیت رکھتے تھے اور میراجی اس کے قلب کی"[1] یہ دونوں ترقی پسند تحریک کو اشتراکی ادبی تحریک سمجھتے تھے اور ادب میں جماعتی جبر کے خلاف تھے۔ دونوں نے داخلیت اور انفرادیت پر زور دیا اور تلاش ذات کی حمایت کی۔ دونوں نے اندرونی کرب کے اظہار کے لئے علامتوں اور اشارتی زبان کا استعمال کیا اور راست بیانی کی مخالفت کی مگر میراجی نے تحلیل نفسی سے زیادہ کام لیا اور راشد نے مغربی شعرا کے اثر سے ایسی علامتوں کا استعمال کیا جن میں ابہام اور پراسراریت کم تھی ان کے علاوہ قیوم نظر، مختار صدیقی، مجید امجد، حفیظ ہوشیارپوری، تابش صدیقی، یوسف ظفر امجد الطاف، نظیر صدیقی، ضیا جالندھری، شہرت بخاری، انجم رومانی، مبارک احمد صفدر میر، سراج منیر اور منیر نیازی جیسے شعرا اس سے متعلق رہے جن کی شعری اور نثری تخلیقات اردو ادب میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

نشاۃ ثانی اسلوب اور موضوع کے احیا کا رجحان بھی اس عہد میں پھیلا

۱۔ نئی شعری روایت۔ از ڈاکٹر شمیم حنفی ص ۶۸

اگرچہ روایت قدیم ہی سے چلی آتی تھی مگر اس عہد میں اس نے ایک قومی رجحان کی صورت اختیار کرلی۔ ۱۹۲۳ء کے شروع میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے اردو شاعری اور بلینک ورس کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اس کے آخر میں اردو نظم و نثر میں اصلاح کے لئے آئندہ کا پروگرام بھی درج کیا۔ جس میں اردو سے عربی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ کے اخراج اردو نظم کو ہندی وزنوں میں منتقل کرنے اور اردو شاعری میں ہندی تشبیہات اور تلمیحات اور ہندوستانی واقعات کے استعمال پر خاص زور دیا گیا تھا مولانا نے حلقۂ ارباب علم کے ذریعہ گیتوں اور گیت نما نظموں کے فروغ میں حصہ لیا اس طرح سے اردو گیتوں کو ایک صنف کا درجہ ملا اس رجحان کی پرورش میں ہر طرز فکر کے شاعروں نے خصوصاً حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا نے حصہ لیا حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، اختر شیرانی، میراجی، قتیل شفائی، محمد دین تاثیر، قیوم نظر، ناصر شہزاد، فراب اختر، خاطر غزنوی، مجید امجد، ابن انشا تاج سعید، وقار انبالوی، عشرت رحمانی، سیف الدین سیف، ندا فاضلی، منیر نیازی، شہاب جعفری، نگار صہبائی، بیکل اتساہی، زبیر رضوی، شکیل بدایونی اور کرشن موہن وغیرہ نے گیتوں اور بھاشائی اسلوب اور موضوع سے متعلق نظموں سے اردو کے شعری ادب کو مالامال کردیا بعض کے گیتوں میں علاقائی زبان کا رنگ و آہنگ نمایاں تھا اور بعض کے یہاں ان کی شکل گیت نما نظموں کی تھی ان غنائی نظموں اور گیتوں کو بہت عوامی مقبولیت ملی اور انہیں گیتوں اور گیت نما نظموں پر مشتمل متعدد شعری مجموعے اردو شعر و ادب کو ملے اس رجحان کی مقبولیت سے اردو میں دوہے بھی لکھے گئے اور مقبول ہوئے

علامہ اقبال کی شاعری میں اسلام کے تصور انسانیت کی ہمہ گیریت اور جامعیت جس طرح بیان ہوئی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہی اقبال کے نزدیک مشرق و مغرب کی کشمکش اور کمزوریوں کا واحد حل تھا اقبال کی شاعری میں مذہبی احیائیت جس حسن و خوبی اور جس پرمدانہ چابکدستی سے نمایاں ہوئی تھی اس کا سب سے زیادہ اثر تحریک ادب اسلامی پر پڑا اور ایک پوری تحریک ادب میں اسلامی اقدار کی عکاسی کے اصول کے ساتھ چل پڑی۔ اگرچہ یہ ایک کمزور تحریک تھی مگر تحریک کے معیار اور میزان پر پوری اترتی تھی اس تحریک کی

پشت پناہی ہند و پاکستان دونوں حکومتوں پر دونوں حکموں کی جماعت اسلامی نے کی۔ اس تحریک نے لٹریچر، اخبار، رسائل اور ادبی نشستوں کے ذریعے بہت سے مسلمان شاعروں اور ادیبوں میں اپنی جگہ بنالی۔ چنانچہ اس کی متعدد شاخیں اور برانچیں قائم کی گئیں اور متعدد مجموعے چھپے۔ مضامین اور مقالے لکھے گئے افسانے اور ناول بھی تخلیق ہوئے۔ یہ تحریک اب بھی کسی نہ کسی حیثیت میں چل رہی ہے۔ مگر اب وہ پہلے جیسا جوش و ولولہ نہیں ہے۔

تقسیم ہند کے خونیں واقعات میں ڈوب کر جب نئی نسل ابھری تو مذہبیت اور انسانیت پر سے اس کا اعتماد متزلزل ہوگیا تھا سائنسی ترقیوں اور صنعتی ماحول نے ایک طرف تو مشینی آسائش مہیا کی تو دوسری طرف مہلک، تباہ کن اور زہریلے ہتھیاروں کے بھیانک انجام نے اسے اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کردیا مزید یہ کہ ہندوستانی سماج کی نفسا نفسی اور معاشی اور جنسی گھٹن کی فضا میں اس نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا ادب میں اجتماعیت کے تصور کی افادیت میں اس کا شک بڑھتا گیا اور چونکہ نظریہ، عقیدہ، نصب العین، آدرش وابستگی اور نئی صبح کی بشارتوں اور خوابوں کا طلسم بکھر رہا تھا۔ اس لئے کسی طے شدہ راستے پر اس کا چلنا ممکن نہ رہا اس لئے اس نے ادبی اجتماعیت پسندی اور کسی طے شدہ ہی راستے سے وابستگی اور وفاداری کو یکسر رد کردیا حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں اور ادیبوں نے جو مشعل جلائی تھی وہ ان کے لئے رہنما بنگئی۔ اسی طرح سنہ ۵۰ء تک جو ادبی رویہ ناقابل اعتنا تھا ساٹھ ستر تک آتے آتے اس نے زور پکڑلیا جون ٦٦ء میں "شب خون" الہ آباد کے اجرا نے نئے رویے کے پھیلنے میں مدد دی۔ اس طرح نیا طرز احساس نیا لب و لہجہ، ابہام اور دوہری علامتوں کا استعمال اور نئے زمانے کی تراکیب اور نئے الفاظ کثرت سے نظموں اور غزلوں میں پائے جانے لگے نئے رجحان کے علم برداروں نے اپنی جدت بیداری کا مظاہرہ عجیب و غریب طریقے سے کیا جو ابتدا میں چونکانے کا سبب بن گیا مگر بعد میں جب چھان پھٹک کی گئی تو اس سیل ابہام میں اچھے شعروں کی شمعیں لو دیتی نظر آئیں

حلقہ اربابِ ذوق کے بیشتر شعرا اس نئے رجحان کے پیش رو تھے مگر افتخار جالب احمد ہمیش، قاضی سلیم، باقر مہدی، بلراج کومل، وزیر آغا، ظفر اقبال، ناصر کاظمی، عمیق حنفی، ساقی فاروقی، شہریار، کمار پاشی، شمس الرحمن فاروقی، محمد علوی، عادل منصوری، ندا فاضلی، مانی ایم اے۔ اور حکیم منظور کی آوازوں میں خاص انفرادیت تھی۔ ان کی شعری لے میں نیاپن تھا نیا طرزِ احساس اور نیا ڈکشن تھا اس لے کو عتیق اللہ، زبیر رضوی، مصحف اقبال توصیفی، بدیع الزماں خاور، رشید افروز، صادق، راج نرائن راز، غلام مرتضیٰ راہی اور صلاح الدین پرویز وغیرہ نے اور تیز کیا انہوں نے نئے اور انوکھے طرزِ اظہار اور علامتوں کے دوہرے اور پیچیدہ استعمال سے اپنی شاعری کو اپنے سے پہلے کے نئے شعرا سے ممیز کر لیا یہی وہ شاعری تھی جسے جدید تر شاعری یا نئی شاعری کہا گیا

نئی شاعری تحریک نہیں ہے مگر ایک ایسا ذہنی رویہ، طرزِ احساس اور جدیدیت کی ایسی رو ضرور ہے جو کسی تقلید کسی اصول اور کسی ضابطے کی قائل نہیں ایک آزادانہ احساس کا آزادانہ اظہار ہے۔ جدید حسیت اور ایسی نئی قدروں کی تلاش کی کوشش ہے جو انسان کے باطن کے زنگ کو دور کر کے اس کو ظاہر کی طرح صاف و شفاف بنا دے اس میں عصری حقائق براہِ راست تخلیقی سطح پر برتے جاتے ہیں۔ الفاظ کی نئی معنویتیں اور جہتیں پیدا کی جاتی ہیں فلسفہ وجودیت، خود بینی اور خود پسندی کی ایسی کیفیت ہے جو اپنے سے قدیم شعری سرمائے کی ڈپلی کیٹ نہیں اس میں اضافہ ہے اسی طرح نئی شاعری ایک میلان بھی نہیں مختلف میلانوں کا عطر مجموعہ ہے جس میں بنیادی اشتراک نئے طرزِ احساس نئے لب و لہجے اور نئے ڈکشن کا ہے

نئی شاعری میں نہ صرف یہ کہ پرانے الفاظ کا استعمال کم ہوا ہے بلکہ پرانے لفظوں کو نئے معنی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور موجودہ عہد کے انگریزی وغیرہ کے وہ الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو عموماً گفتگو میں بولے جاتے ہیں۔ مثلاً پینٹ، شمیز، بل اور کوالٹی بار پرسر، روم، بیر، ریل، کیلنڈر، ٹیکسیاں، بسیں، ٹیریلین ریڈیو، ٹیلیویژن، ہارن، بریکیں، ٹاور گھڑی، تھیٹر، بلب، ہوٹل، کار وغیرہ۔

نئے شاعروں نے احساس نقش ورنگ، سفر انجماد، خوف رخ دشمن جانی ریت کا زرد سمندر، رحم کی خوشبو، حصار رنگ عکس بے جادہ، خون تشنہ شام سار ہوائے زرد، آب حسنت اور کہرآلود نظر جیسی بہت سی ترکیبیں گھڑیں اور استعمال کیں. چند انوکھے شعر مثالاً پیش کئے جاتے ہیں

مکھی کی دم کی سوچ میں میں جھومتا رہا
مکھی اگرچہ ہاتھ ہلاتی رہی تو کیا (حبیب منذر)

نہ رستے میں کوئی سواری دیکھی
نہ گھوڑے ملے ہنہناتے ہوئے
چیل نے انڈا چھوڑ دیا
سورج آگرا چھت پر (محمد علوی)

نئی شاعری کے بہت سے مجموعے چھپے جس میں سے کچھ نہایت دیدہ زیب ہیں۔ بلاشبہ اردو شاعری میں یہ اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نئی شاعری کی طرح نیا افسانہ بھی اسی نئی نسل کی دین ہے ان افسانوں میں علامتی اور تجریدی آرٹ کا استعمال ملتا ہے اس نسل نے افسانوں کے مروجہ حصار سے قدم باہر نکالا ہے. ان افسانہ نگاروں نے افسانے کے فارمولوں سے اعتراض کیا کردار علامتی رکھے اور کہیں کہیں کہانی کو بھی غیرضروری سمجھکر تجرید کا عمل کرڈالا. اس طرح آج کا افسانہ نگار افسانے کے رخ کو خارج کے بجائے اندر کی طرف کردیتا ہے. وہ انسان کی داخلی دنیا کی سیر کراتا ہے اور اس کے تمام اوپری چہروں کو نوچ کر اس کے حقیقی خدوخال سامنے کردیتا ہے. اس سلسلے کے ممتاز افسانہ نگاروں میں بلراج مین را، سریندر پرکاش، انور سجاد انتظار حسین، قمر احسن، اکرام باگ، انور قمر اور سلام بن رزاق اور کمار پاشی وغیرہ قابل ذکر ہیں. انتظار حسین کا ناول «بستی» انور سجاد کا طویل افسانہ کونپل ناول «خوشیوں کا باغ» اور افسانوں کا مجموعہ استعارے ہے. «دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم» سریندر پرکاش کا افسانوی مجموعہ ہے. قمر احسن کے مجموعے آگ اور صحرا میں ایک ناولٹ اور کئی افسانے ہیں کمار پاشی کا مجموعہ «پانی پر بنا ہوا مکان» ہے. اس کے علاوہ ان افسانہ نگاروں نے بہت سی نئی کہانیاں فیچر اور ڈرامے لکھے اور اس طرح اردو کے ادبی ارتقا میں نمایاں رول ادا کیا۔

• • •

پروفیسر عنوان چشتی
صدرِ شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ نئی دہلی - ۲۵

ابر احسنی کا نظریۂ فن اور اصلاح سخن

فنِ اصلاح سخن پر ابر احسنی کی تین کتابیں ملتی ہیں۔ یعنی (۱) اصلاح الاصلاح (۲) میری اصلاحیں حصہ اول اور (۳) میری اصلاحیں حصہ دوم۔ اگرچہ اصلاح الاصلاح کو اولیت حاصل لیکن ابر صاحب نے میری اصلاحیں حصہ اول اور دوم میں اپنے تنقیدی نظریات کو پیش کیا ہے۔ اور انکی روشنی میں اصلاحوں کا جائزہ لیا ہے نیز اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں دی ہیں۔ ابر احسنی کا نظریۂ تنقید عربی و فارسی شعریات پر مبنی ہے اور فنِ اصلاح سخن سے ماخوذ ہے۔ عربی میں قدامہ کی کتاب نقد الشعر اور ابن رشیق کی کتاب کتاب العمدہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ فارسی میں عروضی سمرقندی کی کتاب چہار مقالہ اور شمس الدین محمد بن قیس رازی کی کتاب «المعجم فی معائر اشعار العجم» بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُردو کے قدیم اساتذۂ سخن نے اپنے شعری نظریات کی بنیاد انہیں کتابوں پر رکھی ہے۔ اس لئے انھوں نے بدیع، بیان اور معانی کے اصولوں سے استفادہ کیا ہے۔ اور زبان و بیاں اور قواعد کی صحت پر خاص طور سے اصرار کیا ہے علاوہ ازیں انھوں نے عروض اور علم قوافی کا خاص اہتمام کیا ہے۔ فائز دہلوی نے اپنی کلیات کے مقدمہ میں اپنے تنقیدی نظریات کی بنیاد صحتِ زبان پر رکھی ہے۔ محمد باقر آگاہ نے اپنے دیوان کے دیباچے میں اصنافِ سخن پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے بعد اس روایت کو تذکرہ نگاری نے پروان چڑھایا ہے۔ آگے چلکر اردو تنقید کی یہ کلاسیکی روایت دہلی میں شاہ نصیر اور ذوق نیز لکھنؤ میں ناسخ کی شکل میں ایک واضح شکل اختیار کرلیتی ہے۔ ادبی معرکوں اور اصلاح سخن

نے اس روایت کو ایک دستان کی شکل عطا کی ہے۔ کلب علی خان نادر کی کتاب «تلخیص معلٰی» اور حسرت موہانی کی «نکاتِ سخن» اس دستان نقد کی بوطیقا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اردو تنقید کے اس کلاسیکی دستان کی بنیادوں کو داغ و امیر اور انکے شاگردوں نے مضبوط کیا ہے۔

اسرا حسی گنوری اردو تنقید کے کلاسیکی دستان کے ایک اہم رکن ہیں۔ جیسا کہ لکھا جاچکا ہے کہ فن اصلاح سخن پر ان کی تین کتابیں ہیں۔ جن سے انکے تنقیدی اصولوں کا پتا چلتا ہے اور اصلاحوں کی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔

اسرا حسی گنوری نے میری اصلاحیں حصہ دوم میں اصلاح سخن کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرنے کے بعد اپنے تنقیدی نظریات کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ان کی تشریح کی ہے (۱) محاسن سخن اور (۲) معائبِ سخن۔ محاسن سخن میں علم معانی، بیان اور بدیع کے بنیادی نکات پیش کئے ہیں۔ خاص طور پر صنعتوں پر زور دیا ہے جو ہئیت کے لئے جمال آفرین ہیں۔ معائب سخن میں زبان قواعد، عروض اور قافیے کے ان عیوب کی نشاندہی کی ہے جن سے شعر کا صوری حسن مجروح ہوتا ہے۔ انھوں نے عیوب شعر میں شتر گربہ، غلو، حشو، تعقید، ذم ابتذال، ضعف تالیف، غرابت، اخلال، تکلّف، تکرار، اہمال، تطویل، اتصال، اثقال تنافر، تقدیم و تاخیر، عدول، (قطع، تخفیف، تشدید، قصر، مد، اسکان، تحریک وصل، منع صرف، منع نحو) تعبیر، توانائی اضافت، مخالفتِ قیاسِ لغوی، حروف علت کا گرنا، شکستِ ناروا، اجتماع ردیفین، ناموزونیت اور عیوبِ قوافی (ایطا وغیرہ) کو خاص طور پر شامل کیا ہے اور ۴۷ متروکات کی فہرست پیش کی ہے۔[1] ان معائبِ سخن کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ہئیت کے حسن کو مجروح کرتے ہیں۔ یہی انداز فکر متروکات اور مختارات کی بنیاد بھی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسرا حسی کے نظریۂ تنقید کی بنیاد زبان بیان، قواعد، عروض، بدیع اور معانی کی صحت پر ہے۔ دوسرے وہ عیوب ہیں جن سے شعر کا داخلی حسن متاثر ہوتا ہے۔ ان کی تعداد کم ہے اس زمرے میں تعقید

---

۱ میری اصلاحیں (حصہ دوم) ناشر (مصنف) گنور ضلع بدایوں ص ۴۰ تا ۱۰۳

معنوی، استدلال اور دم کو رکھا جاسکتا ہے البتہ توجیہات میں معنوی پہلو بھی زیر بحث آیا ہے اردو تنقید کے قدیم علم بردار اس نکتہ سے باخبر تھے کہ غزل کی جمالیات میں ہیئت کے حسن کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ہیئت کا حسن اس کے عناصر کی صحت، توازن اور ہم آہنگی پر منحصر ہے۔ اس لئے امرا حسنی گنوری نے اپنے تنقیدی نظریات میں ہیئت کے عناصر کی صحت پر خاص زور دیا ہے ذیل میں امرا حسنی کے بعض بنیادی تنقیدی نظریات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ جن کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) عروضی پہلو (۲) فنی پہلو اور (۳) لسانی پہلو ذیل میں ان پہلوؤں پر کچھ اشارے کئے جاتے ہیں۔

عروضی پہلو

اس دائرے میں خاص طور سے تین عیوب کا شمار کیا ہے (۱) ناموزونیت (۲) سقوط حروف علت (۳) شکست ناروا۔

(۱) ناموزونیت - ناموزونیت کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ (الف) اختلاف بحور (ب) خارج از بحر (ج) سقوط حروف صحیح

(الف) اختلاف بحور۔ اگر کسی شعر کے دو مصرعے الگ الگ اوزان و بحور میں ہوں یا کسی نظم کے دو اشعار میں اختلافِ بحور و اوزان ہو تو اس عیب کو اختلاف بحور کہتے ہیں۔ مثلاً ؎

دل ایک ہی فتنہ ہے لیکن بیدار نہیں تو کچھ بھی نہیں
بحر متدارک
ہاتھ میں کس بل لاکھ سہی، تلوار نہیں تو کچھ بھی نہیں
بحر متقارب (یاس یگانہ چنگیزی)

ایک غزل کے ایک ہی شعر میں بحر متدارک اور بحر متقارب کے دو اوزان کا اجتماع جائز نہیں ہے ماہرین عروض نے اس کلیے میں بعض استثنائی صورتوں کا ذکر کیا ہے مگر ان کا اطلاق زیر بحث شعر پر نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض شاعروں نے بحر ہزج اور بحر رمل کے مشابہ اوزان کا اجتماع کرکے عروض کے بنیادی

اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔

(ب) خارج از بحر — ان مصرعوں کو خارج از بحر قرار دیا ہے جو بحر و وزن سے آزاد ہوتے ہیں مثلاً ؎

ایک جھلک ہی دکھلادے تو دور سے جھک کر سلام کروں
ناموزوں
اس پار جگت کے ہوگا کوئی، اس پار نہیں تو کچھ بھی نہیں
بحر متدارک (یاس یگانہ چنگیزی)

اس شعر کا پہلا مصرع قطعاً ناموزوں ہے لیکن دوسرا بحر متدارک میں ہے اسلئے پہلے مصرعے میں ناموزونیت کا عیب ہے۔

(ج) سقوط حروف صحیح — عروض کے ماہرین نے حروف صحیح کے سقوط کو عیب قرار دیا ہے مثلاً ؎

چہرے کا رنگ اسطرح بدلا کہ موج عشق زنجیر ہورہی ہے ہیائے شکستہ رنگ
(شاہ نصیر)

اس شعر میں طرح کی ح (حروفِ صحیح) ساقط ہے۔ اسی طرح عین اور دوسرے حروف صحیح ساقط ہوجاتے ہیں، یہ مناسب نہیں۔

ناسخ نے سقوط حروف صحیح کو معیوب قرار دیا ہے۔ اصغر علی خاں اعجاز شاگردِ ناسخ نے عون و محمدصلعم کے حال میں ایک مرثیہ لکھا تھا جس کا ایک شعر ہے ؎

کہا کچھ عذر نہ باقی رہا، ہوا میں تباہ چلے ہیں شام کی بدلی میں میرے غیرت ماہ

ناسخ نے اس پر اس طرح اصلاح دی۔

کہا کہ عذر نہ باقی رہا، ہوا میں تباہ چلے ہیں شام کی بدلی میں میرے غیرت ماہ

اور اس پر یہ نوٹ لکھا

«سبحان اللہ! جناب مصرع ناموزوں فرمودن ہم خوب می دانند. بندہ نمی دانست.»[۱]

چونکہ مصرع اولیٰ میں «غدر» کا عین گرتا تھا۔ اس لئے کہا کچھ کی جگہ کہا کہ بنایا گیا اور مصرع کو عین کے سقوط سے بچالیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناسخ کے دور میں حروف صحیح کے سقوط کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔

اس مسئلہ پر لکھتے وقت ابرا حسنی صاحب نے غلط زحاف یا غلط رکن کے استعمال پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا اگرچہ وہ اس اصول کو تسلیم کرتے تھے کہ اوزان و بحور کے دائرے میں حتیٰ آزادی ہے، اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے لیکن آزادی کے نام پر بے جا توسیع پسندی کا رجحان غلط ہے۔ عروض کا قاعدہ ہے کہ حشوین میں مفاعلن کی جگہ مفاعلان نہیں آسکتا یعنی مفاعلن پر عروض و ضرب میں تسبیغ اور اذالہ کے عمل سے مفاعلان حاصل کیا جاسکتا ہے اور اس کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حشوین میں اس رکن پر تسبیغ اور اذالہ دونوں زحافات کا عمل کرکے مفاعلان حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ عروض کا یہ ایک نازک مرحلہ ہے مثلاً ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں رُولائے کیوں

اس شعر میں خشت کی «تے» اور بار کی «رے» اس امر کی شاہد ہیں کہ غالب نے یہاں غلط رکن استعمال کیا ہے یا غلط زحاف کا استعمال کیا ہے۔ اصولاً یہاں «مفاعلن» ہے۔ جس کی جگہ مفاعلان رکھا ہے۔ حشوین میں مفاعلن کی جگہ مفاعلان جاسکتا (اس سلسلہ میں «دیوان غالب کا عروضی تجزیہ» اور «اصغر کی شاعری کا نہیں لایا عروضی تجزیہ» میں مفصل گفتگو کی جاچکی ہے) ابرا حسنی صاحب نے اپنے تنقیدی اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس نکتہ کو فراموش کردیا ہے۔

ابر صاحب نے الفاظ کی صحت پر خاص زور دیا ہے۔ بعض شاعر صحت

---

۱ مشاطۂ سخن (جلد دوم) ص ۲۱

الفاظ کا خیال نہیں کرتے جس کی وجـــہ سے مصرعے ناموزوں ہوجاتے ہیں۔ مثلاً رنگ کو رگ کیے، رنگوں کو رگوں (فعل) کے وزن پر لکھنا صحیح نہیں ہے۔ مثلاً

قوس قزح جو سات رنگوں میں ہے جلوہ گر

یہاں رنگوں فعلن وزن پر نہیں ہے۔ بلکہ رگوں فعل کے وزن پر ہے۔ اگر مصرع کو صحت لفظ کے ساتھ پڑھا جائے تو ناموزوں ہوجاتا ہے۔

(۲) سقوط حروف علت :- ابر صاحب نے حروف علت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کے حروف علت۔ جن کا سقوط جائز قرار نہیں دیا مثلاً

(۱) ہمارا مدعا دنیائے دوں سے کچھ بھی نہیں
(۲) گیسو تم نے عبث بکھیر دئے
(۳) یعنی یہاں بھی کچھ نہیں اور وہاں بھی کچھ نہیں

ان مصرعوں میں مدعا کا الف گیسو کا واؤ اور یعنی کی یے ساقط ہوگئی ہے۔ ابر صاحب عربی فارسی اور ترکی حروفِ علت کے سقوط کو معیوب سمجھتے ہیں لیکن ہندی کے حروف علت کا سقوط روا رکھتے ہیں مثلاً

(۱) تم نے کس دل سے دل دہی کی ہے
(۲) اس کو دیکھا تو زندگی آئی
(۳) ان کا دامن ہے اور میرا ہاتھ

ان مصرعوں میں نے کی یے کو کا واؤ اور کا کا الف ساقط ہے۔ ابر صاحب ہندی کے حروف علت کے سقوط کو روا رکھتے ہیں اس سلسلے میں انھوں نے ایک اور نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے جو بے حد اہم ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بعض ہندی الفاظ کے حروف علت ایسے ہیں، جن کا گرانا فصاحت کلام کو سخت نقصان پہنچاتا ہے جیسے کیا، کیوں وغیرہ۔ ابر صاحب کا خیال ہے کہ کیا کو ک کے وزن

پر اور کیوں کو ک کے وزن پر لکھنا غلط ہے ۔ امیر مینائی نے اس نکتہ کو اپنی اصلاح میں اس طرح واضح کیا ہے زاہد سہارن پوری کا شعر ہے

وہ جو رنگ رنگ کے قصر تھے وہ عمارتیں جو عجیب تھیں
وہاں صرف اب ہیں کھنڈر پڑے نہ وہ نقش ہے نہ نگار ہے

امیر مینائی نے دوسرے مصرع میں اس طرح اصلاح کی۔

کھنڈر اب وہاں نظر آتے ہیں ، نہ وہ نقش ہے نہ نگار ہے

توجیہہ میں لکھا ہے کہ «الفاظ ہندیہ میں آخر کا حروف گرتا ہے بیچ کا نہیں گرتا لہذا وہاں کی تصحیح کردی گئی»[1]

اسی طرح سقوط حروف علت (ہندی) کی حسب ذیل صورتیں بھی ہئیت کے حسن کا خون کرتی ہیں مثلاً ؎

لاتا ہم تک بھی کوئی نیند سے بوجھل آنکھیں
آتا ہم کو بھی مزہ خواب میں ڈر جانے کا
(شہر یار)

اس شعر میں لاتا اور آتا کا الف بُری طرح دبتا ہے اساتذۂ فن ایسی صورتوں کو جائز سمجھنے کے باوجود محتاج ثانی تصور کرتے ہیں۔

امیر مینائی کی اصلاح سے واضح ہوتا ہے کہ اساتذۂ سخن ہندی کے حروف علت اگر آخر میں ہوں تو ضرورت شعری کے تحت ساقط کرتے ہیں لیکن درمیان میں ہوں تو ساقط نہیں کرتے ۔ آخر میں بھی انھیں حروف علت کا سقوط روا رکھتے ہیں جو خلاف فصاحت نہ ہوں ۔ اگرچہ امیر مینائی نے توجیہہ میں صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ لیکن زاہد سہارن پوری کے مصرع میں تعقید کا عیب بھی ہے یعنی «وہاں صرف اب ہیں کھنڈر پڑے» میں فعل کھنڈر پڑے ہیں کی جگہ «ہیں کھنڈر پڑے» استعمال

---

۱ مشاطۂ سخن ص ٦۳

ہوا ہے ۔ «کھنڈر اب وہاں نظر آتے ہیں» اصلاح سے دونوں عیب دور ہوگئے ۔ رہی یہ بات کہ آتے کی ے دبتی ہے تو یہ جمہور اساتذہ کے نزدیک جائز ہے ۔

سقوط حـــروفِ علت کے سلسلے میں ناسخ اور اشک سے اب تک تمام اساتذۂ سخن کا یہی مسلک ہے کہ ہندی کے حروف علت کا سقوط ضرورت شعری کے تحت جائز ہے لیکن عربی فارسی اور ترکی الفاظ کے حروف علت کا سقوط جائز نہیں۔ اس سلسلہ میں رشید حسن خان کا خیال ہے کہ چونکہ جن اساتذہ نے اس قاعدہ کو تسلیم کیا ہے ان سے بھی اسکی پابندی نہیں ہوسکی اس لئے عربی و فارسی کے حروف علت کا سقوط جائز ہے ۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حروف علت کے سقوط کی بنیاد زبانوں کو نہیں بلکہ لفظ کے محل استعمال ، لہجے کے تقاضے اور ذوق سلیم کو بنانا چاہئے ۔[1] اس دلیل میں وزن ہے لیکن قاعدہ ایک چیز ہے اور اس پر عمل کرنا دوسری چیز ۔ اگر کوئی شخص نظریاتی طور پر سچ کو ایک نیکی تصور کرتا ہے مگر کبھی کبھی جھوٹ بولنے کا مرتکب بھی ہوجاتا ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ سچ ایک نیکی یا قدر نہیں ہے ۔ یا سچ کو بطور ایک نیکی یا قدر تسلیم نہیں کرنا چاہئے ۔ رہی ذوق سلیم کی بات تو عروض و قواعد کے مسائل کو معروضی بنیادوں پر حل کرنا چاہئے ورنہ ذوق سلیم تو ایک ذاتی اور شخصی خصوصیت ہے جس کا تعین بہت سے خارجی اسباب و محرکات کرتے ہیں۔ مثلاً ایک دیہاتی کا ذوق سلیم ایک شہری کے ذوق سلیم سے جدا ہوتا ہے ۔ حسن کا جو معیار مشرق میں ہے کیا وہی مغرب میں ہے؟۔ اس لئے اصولی معاملات میں ذوقِ سلیم سے زیادہ معروضی انداز نظر کام آتا ہے سقوط حروف علت کے سلسلہ میں ماہرین زبان عروض نے جو قاعدہ بنایا ہے وہ ٹھوس بنیاد پر قائم ہے ۔ شمس الرحمن فاروقی بھی رشید حسن خاں کے ہم نوا ہیں۔ انھوں نے حروفِ علت کے سقوط کو آوازوں کی تخفیف کا مسئلہ بناکر پیش کیا ہے ۔ انھوں نے عربی و فارسی نیز ہندی کے حروف علت کی تقسیم کو تسلیم نہیں کیا اور لکھا ہے۔

«الف ساکن کے تخفیف کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کی تخفیف

---

۱ زبان اور قواعد - ۱۹۷۸ء ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ص ۲۷۱ تا ۲۸۷

بہت کم صورتوں میں بس گــــوارا اور بہت سی صورتوں میں قطعاً نامناسب ہے ۔ »[1]

انھوں نے اپنے زاویــــۂ نگاہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے سبب اور وتــــد کی بنیاد پر ایسے الفاظ کی تقسیم کی ہے جن کا الف ساکن ہے ۔ فـاروقی صاحب نے اگرچہ اپنے مفروضے کو اصول کی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے مگر انکے اصول کی تہ میں ذوق سلیم کا اصول کار فرما ہے ۔ فاروقی صاحب نے اپنے مقـالـہ بعنوان «دستور الاصـــــلاح اور اصلاح الاصلاح» میں لکھا ہے یہ قاعدہ کسی قدیم استاد نے نہیں بتایا کہ ہندی کے حروف علت کا گرانا درست ہے اور غیر ہندی حروف علت کا گرانا غلط ہے ۔ اسی مضمون میں آگے چل کر خود اپنی بات کی نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ باتیں بعد والوں نے خاندان ناسخ اور خاندان میر عشق کی روایتوں سے قیاس کرلیں فاروقی صاحب کے اس مضمون سے پہلے رشید حسن خـان کا مضمون سقوطِ حروف علت شائع ہوچکا تھا سچ تو یہ ہے کہ فاروقی صاحب کے یہاں رشید حسن خان کے مضمون کی آواز بازگشت ہے ۔ فاروقی صـاحب نے یہ نہیں لکھا کہ وہ قدیم استاد کس کس کو تصور کرتے ہیں ، رشید خان نے اپنے مضمون میں حسرت موہانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ناسخ نے بھی اس قاعدے کو تسلیم کرلیا تھا ۔ اور انھوں نے ناسخ کے ایک شاگرد کلب حسین خان نادر کا قول انکی کتاب «تلخیص معلاً» کے حوالے سے رقم کیا ہے ۔

«حروف علّت جو آخر الفاظ عربی وفارسی میں آتے ہیں ان کا حوف واضح ہونا تلفظ میں چاہئیے تنگی کے ساتھ دب کر زبان پر نہ آئیں ۔ مگر الفاظ ہندی میں خصوصاً (نہ) مقام جمع مضائقہ نہیں ۔ »[2]

اس سلسلے میں خواجہ وزیر کے کلام پر ناسخ کی ایک اصلاح اور اسکی توجیہہ پیش کی جاتی ہے جس سے ناسخ اور دبستان ناسخ کا موقف واضح ہوتا ہے ۔ خواجہ وزیر کا ایک شعر ہے ـــــــ

---

۱ شب خون ـ ستمبر ، اکتوبر ، نومبر ص ۹

۲ زبان اور قواعد ص ۲۷۴

غضب ہوا کہ کسی سنگ دل پہ دل آیا ـــ الٰہی خیر کہ شیشہ گرا ہے پتھر پر

ناسخ نے اس طرح اصلاح کی۔

غضب ہوا کہ بت سنگ دل پہ دل آیا
خدا بچائے کہ شیشہ گرا ہے پتھر پر

> پہلے مصرع میں سنگ دل کی رعایت سے بت کا لفظ اور دوسرے مصرع میں بجائے «الٰہی خیر» کے «خـــدا بچائے» بنادیا۔ حالانکہ «الٰہی خیر» سے بھی وہی مفہوم ادا ہوتا تھا مگر «خدا بچائے» نے ایک قسم کی دلآویزی پیدا کردی اور الٰہی کی یے دب کر ادا ہوتی تھی یہ نقص بھی رفع ہوگیا۔»[1]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ناسخ کے دور میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی یے کا سقوط معیوب تصور کیا جاتا تھا اور آج تک اساتذۂ فن کی کـــثیر تعداد اسی اصول پر کاربند ہے۔ انرا حسنی کا بھی یہی مسلک ہے۔

اس سلسلے میں بار بار کہا جاتا ہے کہ سقوط حروف علت کی مثالیں اساتذۂ سخن خاص طور پر اساتـذۂ قـدیم کے کلام میں ملتی ہیں۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ پہلے غلطی سرزد ہوتی ہے اور اس کے بعد اس غلطی کا عرفان ہوتا ہے۔ غلطی کا یہی عرفان اصول اور قاعدہ وضع کرنے کا محـرک بنتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر شعرائے قدیم کے یہاں سقوط حـروف علت کی مثالوں سے غلطی کا عرفان ہوا ہے ان کے بعد کے اساتذہ نے ان غلطیوں کا سـدباب کرنے کے لیے قاعدے بنائے ہیں بہرحال سقوط حروف علت کے سلسلے میں دو واضح نظریات ہیں۔ ایک معروضی ہے اور دوسرا شخصی یا ذاتی انـرا حسنی گوری کا مسلک یہ ہے کہ ہندی حروف علت کا سقوط جائز ہے اگر یہ سقوط خلافِ فصـاحت ہو اور مصرع کے دروبست اور غنائیت کو منفی انداز سے متاثر کرتا ہو تو مکروہ ہے اور اس سے اجتنـاب لازم ہے۔ اس میں یہ اشارہ پوشیدہ ہے کہ مکروہ کو

---

۱ مشاطۂ سخن (بار اول) ص ۳۳

مباح بنانے کے لیے اس پر نظر ثانی کرلینا چاہئیے۔ لیکن ان کے نزدیک عربی فارسی اور ترکی الفاظ کے حروف علت کا سقوط قطعاً جائز نہیں۔ اس اصول کی بنیاد ایک مفروضی انداز نظر پر ہے محض ذوق سلیم پر نہیں حسرت موہانی نے سقوطِ حروفِ علت اور نقص روانی پر جو بحث کی ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ہندی حروف علت کا سقوط جائز ہے لیکن جہاں خلاف فصاحت ہو یا اس سے نقص روانی پیدا ہو وہاں اس کو قبول نہیں کرنا چاہئیے۔[1] یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ادب میں جو لوگ مہذب، محتاط اور منظم (اصولی) رویہ اختیار کرتے ہیں انہیں کا کلام مستند سمجھا جاتا ہے۔ اور استناد کا کام کرتا ہے۔ جو لوگ زبان و ادب کے نام پر غیر محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں ان کے اقوال و اشعار کو اعتبار و استناد حاصل نہیں ہوتا

(۳) شکست ناروا :- ابراحسنی گنوری نے عروضی عیوب میں شکست ناروا کو شامل کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

> متعدد بحریں ایسی ہیں جو پورے دو ٹکروں سے بنی ہیں ایسی حالت میں ایک ہی مصرعے کے پورے پورے دو ٹکڑے ہوجاتے ہیں جیسے متفاعلن متفاعلن/متفاعلن متفاعلن[2]

اس میں شک نہیں کہ بعض بحریں یا اوزان دو برابر حصوں میں منقسم ہوجاتے ہیں اور درمیان میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ عروضی وقفہ شعر کی لسانی سطح پر بھی باقی رہنا چاہئیے۔ یہ وقفہ کہیں معمولی اور غیرمحسوس ہوتا ہے کہیں غیرمعمولی اور بہت محسوس ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر شکست ناروا کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جہاں معمولی وقفہ ہوتا ہے اور لسانی سطح پر شاعر اس کو باقی رکھنے میں ناکام ہوتا ہے وہاں اس کو شکست ناروائے خفی کہتے ہیں۔ جہاں یہ وقفہ غیر معمولی ہوتا ہے اور شاعر اس کو باقی رکھنے میں کامیاب نہیں رہتا وہاں اس کا نام شکست ناروائے جلی ہے یہ دو نیم بحروں میں واقع ہوتا ہے ابر احسنی گنوری نے

---

۱ نکات سخن کراچی ص ۱۰۰ تا ۱۱۰

۲ میری اصلاحیں (حصہ دوم) ص ۷۸

ایسے ۱۲ اوزان کی فہرست بھی درج کی ہے جس میں شکست ناروا وارد ہوتا ہے مثال کے طور پر اقبال کا یہ شعر ہے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر|نظر آ لباس مجاز میں
متفاعلن متفاعلن | متفاعلن متفاعلن

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے|ہیں مری جبین نیاز میں
متفاعلن متفاعلن | متفاعلن متفاعلن
بحر کامل مثمن سالم

اس شعر میں دوسرے متفاعلن کے بعد وقفہ ہے۔ دوسرے مصرعے میں یہ وقفہ تڑپ رہے اور ہیں کے درمیان واقع ہوتا ہے جس سے فعل (تڑپ رہے + ہیں) دو ٹکڑوں میں منقسم ہوکر ایک حصہ مصرعے کے نصف اول میں اور دوسرا حصہ مصرعے کے نصف آخر میں شامل ہوگیا ہے۔ اسی طرح مندرجہ ذیل اشعار میں بھی ایطائے جلی ہے۔

جماہیاں سی لے رہے|ہیں آسمان پر نجوم
سنا رہی ہے زندگی|فسانے کتنی رات کے
(فراق)

عشق ہے اپنا پائیدار|تیری وفا ہے استوار
ہم تو ہلاک ورزش|فرض محال ہوگئے
(جون ایلیا)

معنی پہلو

ابر احسنی کے نظریۂ تنقید میں معنی پہلو کو نمایاں اہمیت حاصل ہے اس کے دائرہ میں الفاظ کا انتخاب، اور ان کا فنکارانہ استعمال شامل ہے۔ انھوں نے الفاظ کی صحت پر تو زور دیا ہی ہے، ان کے محل استعمال اور موزوں ترین ترتیب کا لحاظ بھی رکھا ہے۔ انھوں نے ہر اس بات کو معیوب قرار دیا ہے جس سے شعر کی روانی، چستی اور فصاحت میں خلل پڑتا ہو۔ شاعری کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ بہترین الفاظ میں بہترین طریقہ سے بہترین خیالات کو ادا کرنے کا،

شاعری ہے اس تعریف میں بہترین الفاظ اور بہترین خیالات سے قطع نظر جس بہترین طریقہ کا ذکر ہے اس کو اسلوب کہا جاسکتا ہے ۔ جس کا تعلق ترتیب الفاظ اور فنکارانہ چابکدستی سے ہے ۔ دراصل ابرا حسنی اس نکتہ سے بخوبی آگاہ ہیں کہ غزل کی جمالیات میں ہیئت کے حسن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔ اس لیے انھوں نے زبان اور بیان کی صحت ، توازن اور ہم آہنگی پر زور دیا ہے ۔ فنی پہلو کے ضمن میں انھوں نے تعقید ، ضعف تالیف ، غرابت ، اخلال ، تکلف ، حشو ، تطویل انفصال اور تنافر کے ذیل عنوانات کے تحت اظہار خیال کیا ہے ۔ ان عیوب کے فقدان سے شاعری میں فصاحت اور اسلوب میں ندرت پیدا ہوتی ہے ۔

۱۔ تعقید :- اگرچہ تعقید کے معنی گرہ پڑنے کے ہیں مگر کبھی کبھی وزن قافیے اور ردیف کی مجبوری سے متصل الفاظ ایک دوسرے سے دور ہوجاتے ہیں اور ان کے درمیان دوسرے الفاظ آجاتے ہیں اس عیب کا نام تعقید ہے مثلاً ؎

بہت مدت ہوئی یہ آرزو کرتے ہوئے ہم کو
کبھی منظر کبھی ہم کوئی ان دیکھا ہوا دیکھیں (شہر یار)

اس شعر میں منظر اور دیکھیں کے درمیان بہت فاصلہ ہے منظر دیکھیں ہونا چاہیے تھا ۔ یہی تعقید ہے ۔ اسکے علاوہ اس شعر کے مصرع ثانی میں ایک لفظ "ہوا" بھرتی کا یعنی حشو ہے ۔

۲۔ ضعفِ تالیف - اسکی کئی صورتیں ہیں (۱) کلام میں فصحا کے خلاف تراکیب لانا ۔ (۲) اردو فارسی الفاظ میں عطف و اضافت لانا ۔ (۳) محاورے میں تحریف کرنا (۴) زبان کا روز مرہ کے خلاف استعمال کرنا وغیرہ ضعف تالیف ہے ۔

۳۔ غرابت :- اس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً (۱) غیر مانوس اور غیر متعارف الفاظ کا استعمال کرنا ۔ (۲) مغلق الفاظ کا استعمال کرنا ۔ غرابت میں لفظ اور اس کا استعمال دونوں صحیح ہوتے ہیں اس لیے غرابت کوئی عیب نہیں ۔ ایک لفظ ایک شخص کے لیے غیر معروف یا مغلق ہوسکتا ہے دوسرے کے لیے نہیں ۔ اس لئے ابر احسنی نے بجا طور پر لکھا ہے

«میری رائے یہ ہے کہ غرابت کو عیوب شعر کی فہرست سے نکال دینا چاہیے ۔ کیونکہ جب لفظ صحیح ہے اور اس کا استعمال بھی مناسب ہوا ہے تو اسے عیب کیوں سمجھا جائے ۔»[1]

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اثرا حسنی کا نظریۂ تنقید معروضیت پر قائم ہے ۔

۴۔ اخلال :۔ کبھی کبھی شاعر اپنے شعر میں کسی ایسے لفظ یا الفاظ کو محذوف کردیتا ہے جن کا شعر میں ہونا اصول صرف و نحو کی رو سے ضروری ہوتا ہے اس عیوب کو اخلال کہتے ہیں ۔ مثلاً ،

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے   بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
(غالب)

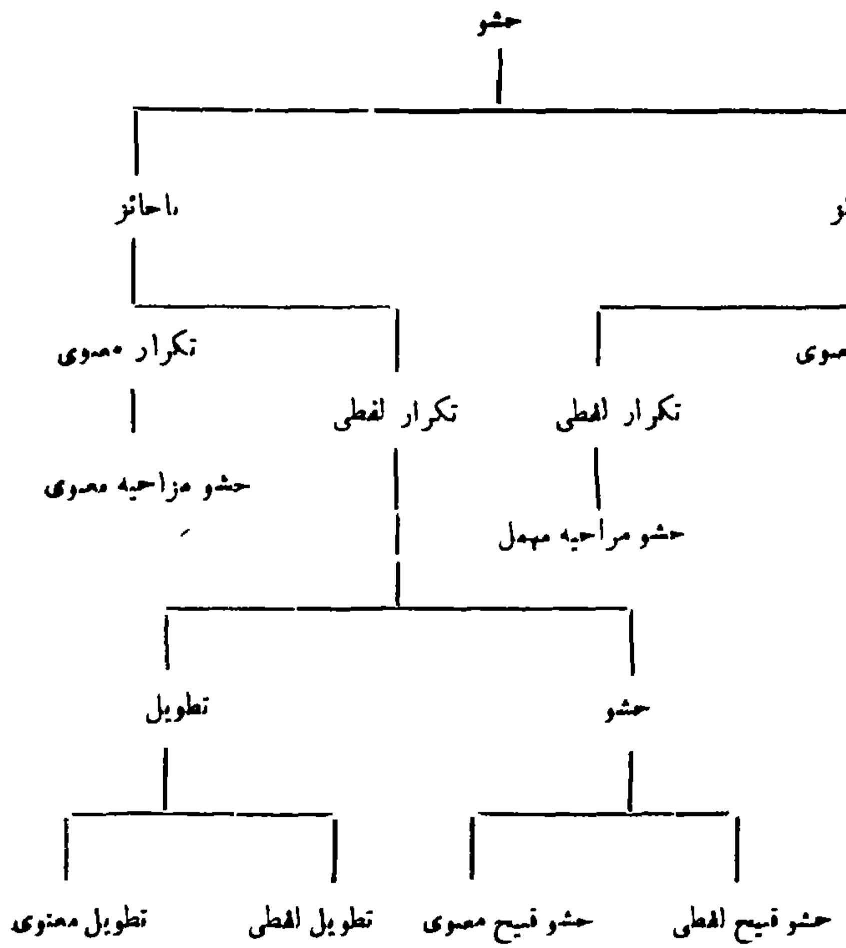
بھوں کے پاس ہونا چاہیے تھا ۔ مصرعے میں «کے» محذوف ہے ۔ جس کے فقدان سے شعر میں اخلال کا عیب وارد ہوتا ہے ۔

۵۔ تکلّف :۔ اگرچہ تکلف کے لغوی معنی تکلیف اٹھانا ہے، لیکن اصطلاح میں ایسے الفاظ کے استعمال کو تکلف کہتے ہیں جو خلاف صرف و نحو ہوں ۔ اور زبان اور قواعد کے ضابطوں کے خلاف ہوں اس عیب سے وہ الفاظ مستثنیٰ ہیں جنھیں فصحانے جائز قرار دے دیا ہے ۔ لیکن اس عیب کا اطلاق ان الفاظ پر ہوتا ہے جو فصحا کے نزدیک صحیح نہیں ہیں مثلاً لمالب کی جگہ ملب اور شغل کی جگہ مشغول لکھنا، سراسر تکلف ہے ۔

٦۔ تکرار - اگرچہ تکرار کے لغوی معنی دوبارہ وارد ہونے کے ہیں ۔ لیکن اصطلاح میں ایسے الفاظ تراکیب یا فقروں کو تکرار کہتے ہیں جو شعر میں دوبارہ آجاتے ہیں اگر یہ تکرار شعر کے ظاہری یا باطنی حسن میں اضافہ کرتی ہے تو جائز بلکہ مستحسن ہے اور اگر یہ شعر کے حسن میں اضافہ نہیں کرتی بلکہ اس کی ہئیت کو مجروح کرتی ہے تو عیب ہے ۔ تکرار کی دو قسمیں ہیں ۔ تکرار لفظی اور تکرار معنوی ۔ تکرار کی قسموں کو ایک جدول کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے

---

۱ میری اصلاحیں (حصہ دوم) ص ۵۸



اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ تکرار مفید عیب نہیں ہے لیکن تکرار قبیح و غیر مفید معیوب ہے اور اس کی تمام لفظی اور معنوی صورتیں شعر کی ہیئت اور معنویت کو متاثر کرتی ہیں ۔ اس لیے عیوب سخن میں شمار کی جاتی ہیں ۔

۷۔ اتصال :۔ ہم مخرج حروف کے اجتماع کو اتصال کہتے ہیں ۔ یعنی جب ایک حرف پہلے لفظ کے آخر اور دوسرے لفظ کے آغاز میں آتا ہے اس صورت حال کا نام اتصال ہے ۔ اتصال عیب ہے نہ ہنر بلکہ اسکا انحصار محل استعمال پر ہے ۔ اگر اتصال حروف سے فصاحت پر منفی اثر نہیں ہوتا اور زبان ٹھوکر نہیں کھاتی تو اتصال عیب نہیں ہے ۔ اگر زبان رگڑ کھاتی ہے یا فصاحت مجروح ہوتی ہے تو عیب

ہے مثلاً خوددار اور شک کرنا میں اتصال حروف (دال اور کاف) ہے۔ مگر مخل فصاحت نہیں لیکن راسخ خیال اور عمیق قائم میں اتصال حروف (خ اور قاف) ناگوار سماعت اور مخل فصاحت ہے۔ نیز زبان رگڑ کھاتی ہے اس لیے عیب ہے۔ اس سلسلے میں اثر احسنی صاحب کا مسلک یہ ہے۔

> «سننا، منانا، جاننا، پہچاننا غرض ایسے سیکڑوں الفاظ ملیں گے جن سے بچاؤ نہیں جاسکتا، نہ زبان سے یہ الفاظ خارج کیے جاسکتے ہیں لہٰذا اتصال کو عیب ماننا زبان کو دانتوں سے کاٹنا ہے۔»[1]

اتصال کی دو بہت واضح صورتیں ہیں۔ (۱) اتصال اضافی مثلاً یادِ دوست اور شمع علم وغیرہ (۲) اتصال بعد سقوط حرف مثلاً «جو جگر کے پار ہوتا» میں جو واو گر کر جُگر باقی رہتا ہے۔ بعض علمائے بلاغت نے اتصال حروف کو انقال کا نام دیا ہے جس سے شعر میں ثقالت پیدا ہوتی ہے بعض نے اس کو تنافر کہا ہے۔ اثر احسنی اتصال حروف کو تنافر حروف قرار نہیں دیتے بلکہ اسکی جملہ صورتوں کو معمولی استثنا کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ مثلاً

شام ہوتے ہی کھلی سڑکوں کی یاد آتی ہے
سوچتا روز ہوں میں گھر سے نہیں نکلوں گا
(شہر یار)

اس شعر میں سڑکوں کی میں واؤ اور نون غنّہ کے سقوط کے سبب سڑکُ کُ آواز پیدا ہوتی ہے جو ناگوار سماعت ہے۔

۸۔ انقال :- اگرچہ انقال کے لغوی معنی بوجھ لادنے کے ہیں مگر اصطلاح شاعری میں دو ایسے حروف کے اتصال کو انقال کہتے ہیں جن کا مخرج ایک دوسرے کے خلاف ہو اور جن کی ادائیگی میں تکلف ہوتا ہو مثلاً ک کے بعد ث یا ت کا لانا ق کے بعد ک کا استعمال کرنا ہے

حق کا بیان ہو نہیں سکتا زباں سے

میں حق کے بعد کا ہے یعنی قاف کے بعد کاف کی آواز ادا کرنے میں زبان تکلف

---

۱ میری اصلاحیں (حصہ دوم) ص ٦۲

محسوس کرتی ہے۔ اور ثقل پیدا ہوتا ہے۔ اثقال کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) اثقال سادہ اور (۲) اثقال بعد سقوط۔ اثقال سادہ کی مثال سطور بالا میں پیش کی جاچکی۔ اثقال بعد سقوط سے یہ مراد ہے کہ شعر میں حروف علت یا کسی دوسرے حرف کے گرنے سے ادھر اُدھر کے دو حرفوں کا مل کر ایک نامعی آواز پیدا کرنا اثقال بعد سقوط کہلاتا ہے۔ مثلاً

دل گیا دل کی بے کلی نہ گئی　　جھینکنا جس کا تھا وہی نہ گئی

دوسرے مصرع کا کا الف گرکر ک تھا (کتھا) کی آواز پیدا کرتا ہے۔ جو نامعی لفظ ہے اس طرح کی صورت حال کو اثقال کہا جاتا ہے۔

۹۔ تنافـــر :- اگرچہ تنافر کے لغوی معنی نفرت کرنا ہے لیکن اصطلاح شاعری میں اس کا اطلاق کئی صورتوں پر ہوتا ہے۔ (۱) ایک حرف کا اس طرح لگاتار آنا کہ صوتی کراہت پیدا ہوجائے مثلاً

کڑے کو کپڑے سے کٹایا گیا

میں کاف کی مسلسل تکرار صوتی کراہت پیدا کرتی ہے (۲) قریب المخرج یا بعید المخرج حروف کا اسطرح آنا کہ ان سے صوتی کراہت پیدا ہو۔ صوتی کراہت کا انحصار محل استعمال پر ہے۔ اگر واقعی تکرار حروف سے معنویت مجروح ہوتی ہو اور صوتی حسن مجروح ہوتا ہو تو اس کو عیب شمار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس بات کا فیصلہ شعر کی ہئیت اور معنویت کے پس منظر میں کیا جاسکتا ہے۔

دراصل تکرار، اتصال، اثقال اور تنافر کا فیصلہ شعر کے پورے در و بست اور معنویت کے پورے کینوس کے مطابق کرنا چاہیے۔ یہ بظاہر آسان مگر بیحد اہم مقامات ہیں۔ جن میں شعری جمالیات میں زبان، اسلوب اور ان کی نزاکتوں اور لطافتوں کے پس منظر میں دیکھنا اور پرکھنا چاہئے۔

<u>لسانی پہلـــو</u>

ادرا حسی کموری کے نظریۂ تنقید میں زبان کی صحت کی خاص اہمیت ہے۔

وہ الفاظ تراکیب روز مرہ اور محاورے کی صحت پر اصرار کرتے ہیں۔ اس پہلو پر انھوں نے کئی اصطلاحوں کے تحت اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے «عدول از جادۂ صواب» کے تحت لکھا ہے کہ اگرچہ اسکے معنی صحیح راہ سے بھٹک جانے کے ہیں لیکن اصطلاح شعراء میں اُس غلط تعبیر کو «عدول از جادۂ صواب» کہتے ہیں جس میں انھوں نے حرکت، سکون، تخفیف، تطویل، تشدید، قصر، مد، اسکان تحریک، منع صرف اور منع نحو کے ذیلی عنوانات کے تحت مثالوں سے اپنے لسانی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔[1]

۱۔ وصل ۔ اصل لفظ میں ایک حرف کا غلط یا غیر ضروری اضافہ مثلاً آخر کی آخرش اور پروا کی جگہ پرواہ لکھنا

۲۔ قطع ۔ لفظ کے کسی حرف کو غلط طور پر کم کرنا مثلاً دستخط کی جگہ دسخط استعمال کرنا۔

۳۔ تخفیف ۔ کسی لفظ کے حرف مشدّد کو غیر مشدّد لکھنا مثلاً کفّارہ کو کفارہ۔ اس اصول سے ایسے الفاظ مستثنیٰ ہیں جو عربی میں مشدّد ہیں مگر اردو میں غیر مشدّد استعمال ہوتے ہیں۔

۴۔ تشدید ۔ لفظ میں غیر مشدّد حرف کو مشدّد کرنا مثلاً ندی کو ندّی اور غیور کو غیّور بنانا۔

۵۔ قصر ۔ الف ممدودہ کو الف مقصورہ بنانا مثلاً قرآں کو قراں لکھنا اور مولانا۔

٦۔ مد ۔ الف مقصورہ کو الف ممدودہ بنانا مثلاً اراضی کو آراضی اور اسامی کو آسامی لکھنا۔

۷۔ اسکان ۔ متحرک حرف کو ساکن کرلینا مثلاً حرکَت (بر وزن عمَلَن) کو حرکت (بر وزن عملن) لکھنا۔

---

۱ میری اصلاحیں (حصہ دوم) ص ٦۷ تا ۷۲

۸۔ تحریک ۔ حرف ساکن کو متحرک کرلینا مثلاً شمع کو شمَع (فَعَل کے وزن پر) لکھنا۔

۹۔ منع صرف ۔ الفاظ کا اصول صرف کے خلاف استعمال کرنا مثلاً پھنسایا کی جگہ پھانسا استعمال کرنا۔

۱۰۔ منع نحو ۔ کسی لفظ کا اصول نحو کے خلاف استعمال کرنا مثلاً اس کے سوا کی جگہ سوائے اس کے لکھنا۔

ابر احسنی گنوری صاحب نے ان اصولوں پر واضح گفتگو کی ہے۔ اور وصل قطع، تخفیف، تشدید، قصر، مد، اسکان، تحریک کی جگہ ان صورتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جو جائز ہیں۔ اور جنھیں فصحائے ادب نے سندِ اعتبار عطا کردیا ہے اور اب یہ صورتیں اُردو میں اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ انھیں الگ نہیں کیا جاسکتا لیکن ان صورتوں کو معیوب قرار دیا ہے جن کا ذکر اجمالاً سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابر احسنی کے نظریۂ فن میں عروضی اور فنی چابکدستی کے علاوہ صحت زبان و بیان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جس سے ہئیت میں جمال آفرینی کے عناصر کا اضافہ ہوتا ہے۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ابر احسنی گنوری کا نظریۂ فن اردو شعریات پر مبنی ہے۔ اور اساتذۂ فن کی تحریروں اور تجربوں سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ اساتذۂ فن کی کثیر تعداد ان اصولوں اور قاعدوں پر کاربند رہی ہے لیکن ابر صاحب نے اپنی تحریروں اور اصلاحوں میں اس کا خاص التزام کیا ہے۔ اس نظریے کو ادبی معرکوں اور اپنی اصلاحوں میں عملی جامعہ پہنایا ہے۔ ابر احسنی گنوری اردو تنقید کے کلاسیکی دبستان کا ایک اہم نام ہے۔ اور ان کی تحریریں بیر اصلاحیں اصلاح سخن کی روایت کے ارتقا میں ایک اہم سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

اُردو میں اصلاح سخن کا سلسلہ نیا نہیں۔ ابتدائی دور ہی سے شمالی ہند میں اس کے نقوش ملتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں اردو شاعروں کے ادبی معرکوں اور تذکروں کو پیش کیا جاسکتا ہے لیکن اس فن پر پہلی کتاب صفدر مرزا پوری کی

«مشاطۂ سخن معروف بہ شمع سخن وری» ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۳۶ ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں صفدر مرزا پوری نے متعدد اساتذہ کی اصلاحیں مع توجیہات یکجا کی ہیں۔ انھوں نے اصلاحوں کی افادیت کے بارے میں لکھا ہے۔

> «مختصر یہ کہ فصاحت، بلاغت، تاثیر زبان، محاورہ، تعقیدِ لفظی و معنوی ترکیب، بندش، چستی، نشستِ الفاظ، روانی، سلاست، متروکات اور جملہ ظاہری و باطنی عیوب و محاسن سب ہی باتیں اصلاح کے وقت دیکھی جاتی ہیں۔»[1]

چنانچہ مشاطۂ سخن کی اصلاحوں سے بڑی حد تک اس مقصد کی تکمیل ہوتی ہے اساتذۂ سخن کا شاعری کے بارے میں جو نظریہ تھا، اصلاحوں اور ان کی توجیہوں نے اس کا عملی ثبوت مہیا کیا ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری کتاب شوق سندیلوی کی «اصلاح سخن» ہے، جس میں انھوں نے اپنی کچھ غزلوں پر اُس دور کے تقریباً تمام اساتذۂ سخن کی اصلاحیں مع توجیہات پیش کی ہیں اس کتاب سے اصلاح سخن کی روایت ایک نئی منزل سے آشنا ہوتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعر یا غزل پر متعدد اساتذۂ سخن کا ردِّ عمل کیا ہے؟ انھوں نے کن پہلوؤں پر توجہ کی ہے۔ یہ کتاب تقابلی اصلاح کا منظرنامہ پیش کرتی ہے۔ اس کتاب پر ناطق لکھنوی نے ۱۹۲۹ع «معصر» میں تنقیدی تبصرہ کیا۔ جس کا جواب بیخود موہانی نے تحریر کیا۔ جو ان کی کتاب گنجینۂ تحقیق میں بھی شامل ہے بیخود نے ناطق لکھنوی کے محاکمہ پر اپنا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے اس میں کو اہم لسانی، عروضی، فنی اور دیگر اہم مسائل زیر بحث آئے ہیں اس محاکمے میں صرف ان غزلوں کو شامل کیا ہے جو «رندانِ تمنّا» اور «بیابانِ تمنّا» کی ردیف میں ہیں مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ مشاطۂ سخن کے بعد اصلاح سخن نے اس فن کو آگے بڑھایا اور فن اصلاح سخن پر ایک نئے انداز سے سوچنے اور اس پر تنقیدی نظر ڈالنے پر آمادہ کیا۔

---

۱ مشاطۂ سخن (بار اول) مطبع میتھوڈسٹ پبلشنگ ہوس لکھنو ص ۱۸

فن اصلاح سخن پر تیسری اہم کتاب سیماب اکبرآبادی کی «دستور الاصلاح» ہے اس کتاب کے بعض حصے ماہنامہ شاعر آگرہ میں شائع ہوچکے ہیں. اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ع میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۴ع میں شائع ہوا کئی ادیبوں اور شاعروں نے «دستور الاصلاح» کا جواب لکھا. ابرا حسنی نے اس کا جواب ماہنامہ «رہنمائے تعلیم لاہور» میں لکھنا شروع کیا اور جنوری ۱۹۴۹ع میں اس کو اصلاح الاصلاح کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا. ابرا حسنی نے اصلاح الاصلاح میں لکھا ہے کہ دستور الاصلاح کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۴ع میں نہیں بلکہ ۱۹۴۶ع میں شائع ہوا ہے دستور الاصلاح کے دونوں ایڈیشنوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیماب نے ابراحسنی کی تنقیدوں کی روشنی میں دوسرے ایڈیشن میں بعض ترمیمات کی ہیں.

دستور الاصلاح میں سیماب اکبر آبادی نے اساتذۂ قدیم و جدید کی اصلاحیں مع توجیہات پیش کی ہیں. ان پر محاکمہ کیا ہے اور بعض اساتذہ کی اصلاحوں کو رد کرکے اپنی اصلاحیں اور ان کی توجیہات پیش کی ہیں. اس کتاب سے اصلاح سخن کی روایت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے. جس میں اصلاحوں پر اصلاحیں دی گئی ہیں اور توجیہات کو تنقید کی کسوٹی پر کسا ہے. اس عمل کو شمس الرحمان فاروقی نے «خود ستائی» کا نام دیا ہے. اگر اس اصول کو درست تسلیم کرلیا جائے تو خود فاروقی صاحب کا مضمون «دستور الاصلاح اور اصلاح الاصلاح» اور ان کی تنقید کا ایک حصہ اس اعتراض کی رد میں آتا ہے. اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے اپنے محاکمہ میں جو طریقۂ کار اپنایا ہے وہ سیماب اکبر آبادی کے طریقۂ کار سے زیادہ مختلف نہیں ہے [1] سیماب اکبر آبادی نے اصلاح سخن کے جواز میں لکھا ہے

> «اصلاح سے لسانی فنی اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کسی استاد کا شاگرد ہونے سے ایک خاص ادارۂ خیال (اسکول) سے نسبت ہوجاتی ہے اور ایک ہموار راستہ چلنے کے لئے مل جاتا ہے جو

---

۱ شب خون ستمبر تا نومبر ۸۲ع ص ۷

شاعر کسی کا شاگرد نہیں، وہ زبان اور محاورے کے اختلاف میں ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے۔ اسالیب وتراکیب کے استعمال کے لیے اسکے پاس کوئی سند نہیں ہوتی۔ اور وہ متروکات ومختارات کی عہد بہ عہد تبدیلیوں سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔»[1]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سیماب اکبر آبادی نے اصلاح سخن کا مقصد عروضی لسانی فنی (بیان، بدیع اور معانی) اغلاط کی تصحیح قرار دیا ہے اور اساتذہ کی اصلاحوں کو تنقید کی زد پر لاکر دائـــرہ اصلاح و توجیہہ کو وسیع کیا ہے۔ اور فن اصلاح سخن پر غیر تقلیدی انداز سے سوچنے کی دعوت دی ہے۔

اس سلسلے کی چوتھی اہم کتاب ابرا حسنی صاحب کی «اصلاح الاصلاح» ہے جو بنیادی طور پر «دستور الاصلاح» کا جواب ہے۔ اس کتاب میں ابرا حسنی نے اسطرح اظہار خیال کیا ہے۔

«شعریت ایک وجدان یا افتاد طبع ہے جس کا تعلق براہ راست میلان ذہن سے ہے۔ شعر سے مراد تک بندی نہیں۔ نہ محض وزن وقافیہ اور ردیف کی ورزش سے اچھا شعر وجود میں آسکتا ہے۔ بہترین شعر تخیل، تصور، فکر اور فن کے عناصر اربعہ کے امتزاج سے تخلیق پاتا ہے»[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرا حسنی شاعری کو ذوقی اور وجدانی شے تصور کرتے ہیں۔ جو تخیل، تصور فکر اور فن کے عناصر اربعہ سے تخلیق پاتی ہے۔ انھوں نے وزن وبحر نیز ردیف وقوافی کی وررش کو مسترد کرکے شاعری کو اعلی ذہنی جذباتی اور تخیئلی قوتوں کا اظہار قرار دیا ہے شاعری کے معنوی پہلو پر اصرار کرنے کے باوجود ابرا حسنی نے شاعری کے فنی یا ہیئتی پہلو سے صرف نظر نہیں کیا ہے انھوں نے لکھا ہے۔

۱۔ دستور الاصلاح - جولائی ۱۹۴۴ ع قصر الادب دفتر شاعر آگرہ ص ۴۳

۲۔ اصلاح الاصلاح مرتضی پریس رام پور ص ۹

"فن زبان میں (شاعر) اظہار خیال کرتا ہے وہ قدرت کی نازل کی ہوئی نہیں بلکہ انسانوں کی بنائی ہوئی ہے اور انسانوں کی مصنوعات کو ہر حالت میں سیکھنا ہی ہوگا اس کے صرف ونحو کی بھی کافی گردانیں کرنی پڑیں گی محاورات کی صحت کی تحقیق اور انکے بر محل استعمال میں کافی محنت برداشت کرنی ہوگی۔ زبان کے نکات اور فن کے رموز سیکھنے اور پرکھنے کے لئے لامحالہ کسی صاحب نظر استاد کی امداد حاصل کرنی ہوگی"[1]

ابر احسنی نے اس کتاب کی شان نزول کے بارے میں واضح طور پر دو باتیں کہی ہیں ایک یہ کہ اس کے مطالعہ سے زبان اور اسکے صرف ونحو سے واقفیت حاصل ہوگی اور دوسرے فن کے اسرار ورموز سے آگہی ملے گی۔ یہ دونوں چیزیں کتابوں کے علاوہ اصلاح سخن سے حاصل ہوسکتی ہیں انھوں نے ایک اور جگہ اصلاح کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے

"پس استاد کی حقیقی ڈیوٹی ہے کہ وہ شعر کا عیب دور کردے اور زیادہ سے زیادہ حصۂ شعر شاگرد کا باقی رہے اگر خیال عامیانہ ہے تو شعر قلم رد کردے خیال میں کمزوری ہے تو اسکو طاقتور بنادے مصرعے اگر بے ربط اور الجھے ہوئے ہوں تو مربوط بناکر سلجھادے مگر یہ سب کچھ اسی (شاگرد) کے الفاظ یا خیال کے ماتحت ہونا چاہئے"[2]۔

ان بیانات سے ایک طرف ابر احسنی کا نظریۂ فن سامنے آتا ہے اور دوسری طرف اصلاح سخن کی افادیت کا پتا چلتا ہے مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ابر احسنی کا بھی وہی ادبی مسلک یا نظریۂ فن ہے جو اساتذۂ قدیم کا ہے اور جو ارتقا کے عمل سے گذر کر بڑی مہذب صورت میں ابر احسنی تک پہنچا ہے۔ انھوں نے کم وبیش اصلاح سخن کی وہی ضرورت اور اہمیت بتائی ہے جس پر ان سے پہلے

۱- اصلاح الاصلاح ص ۱۱

۲- میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ۲۱

کے اساتذہ اصرار کرتے رہے ہیں۔ اس لیے ابرا حسنی اساتذہ کے قافلے کے ایسے رکن ہیں جو لسانی، فنی اور عروضی نکات کی روشنی میں شاعری کے محاسن ومعائب کو پرکھتے ہیں اور جنھوں نے اپنے نظریۂ فن کی روشنی میں اصلاح سخن کا فرض انجام دیا ہے۔ ابرا حسنی گنوری کی اصلاحوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) سیماب اکبر آبادی کے جواب میں اساتذۂ قدیم کی اصلاحوں کے جواز کا جائزہ (۲) سیماب اکبر آبادی کی اصلاحوں پر اصلاحیں اور ان کی توجیہات کا جائزہ (۳) ابرا حسنی کی ان کے شاگردوں کے کلام پر اصلاحوں اور ان کی توجیہات کا جائزہ۔ ذیل میں اسی ترتیب سے ابرا حسنی کے ادبی معرکوں اور اصلاحوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱- اساتذہ کی اصلاحوں پر سیماب اکبر آبادی کے اعتراضات اور ابرا حسنی کے جواب کا جائزہ

خاکسار کا شعر ہے ؎

خاکسار اسکی تو آنکھوں سے کھنچے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

میر تقی میر کی اصلاح ہے

خاکسار اس کی تو آنکھوں سے کھچے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں نے گرفتار کیا

یہ اصلاح نکات الشعراء سے ماخوذ ہے اس کی توجیہہ میں میر نے لکھا ہے کہ «میر متبع این فن پوشیدہ نیست کہ بجائے بیمار کیا، گرفتار کیا می بایست» سیماب اکبر آبادی کا خیال ہے کہ چشم محبوب کی رعایت سے قافیہ «بیمار» ہی صحیح تھا۔ اپنی آنکھوں کا ذکر ہوتا تو گرفتار کہنا حق بجانب تھا ابرا حسنی گنوری نے جواباً لکھا کہ «محبوب کی آنکھیں عاشق کو بیمار کرتی ہوں یا نہ کرتی ہوں مگر ایک طالب کو گرفتار محبت ضرور کرایتی ہیں اور عاشق کا خانۂ دل خراب کر دیتی ہیں » اسر صاحب کے خیال میں اس اصلاح میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ حسن

کی گرفتاری ہوتی ہے اس کا گھر بھی لٹتا ہے اس لیے اصلاح اپنی جگہ بالکل درست اور سیماب کا اعتراض غلط ہے۔[1] شمس الرحمان فاروقی نے اس پر ایک نئے انداز سے اظہار خیال کیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مصرعے اولی کا موجودہ متن صریحاً غلط ہے کیونکہ "گھنے لگنا" یا "آنکھوں سے گھنے لگنا" کوئی محاورہ یا روز مرہ نہیں اس جگہ محمود الہٰی نے نکات الشعراء کے مرتب کی حیثیت سے "آنکھوں کے کہے مت لگیو" لکھا ہے جو موجودہ متن سے بہتر ہے فاروقی صاحب نے پھر اپنے قیاس کی بنیاد پر لکھا ہے کہ "کے کہنے مت لگیو" ہوگا۔[2] میرا خیال یہ ہے کہ "گھنے مت لگیو" اپنی جگہ درست ہے۔ یو پی کے مغربی اضلاع اور مضافات دہلی میں گھنا کثرت اور زیادہ کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ جو آج بھی بول چال کی زبان میں مستعمل ہے۔ گھنے لگنا بمعنی زیادہ لگنا۔ محبوب کی آنکھوں سے زیادہ پیار کرنا، ان کی محبت میں زیادہ گرفتار ہونا۔ خاکسار کے شعر میں میر نے بیمار کی جگہ جو گرفتار بنایا ہے وہ اسی لفظ (گھنے) کا منطقی نتیجہ ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے خاکسار تو اپنے محبوب کی آنکھوں سے زیادہ نہ لگیو، ان سے زیادہ پیار مت کیجو، کیونکہ یہ عاشق کو گرفتار کر لیتی ہیں گرفتاری سے بچنا ہے تو آنکھوں سے زیادہ محبت نہ کرنا اس لیے فاروقی صاحب کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ "گھنے لگیو" صریحاً غلط ہے۔ فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ گھنے لگیو محاورہ ہے نہ روز مرہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر فقرہ روز مرہ ہو یا محاورہ ہو۔ کیا وہ تخلیقی زبان کا کوئی دوسرا عنصر یا صرف تخلیقی لفظ ترکیب یا فقرہ نہیں ہوسکتا؟ محمود الہیٰ صاحب نے "گھنے مت لگیو" کو "کہے مت لگیو" بنایا ہے اس سے بھی شعر کا مفہوم وہی نکلتا ہے جس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی آنکھوں کے کہے میں نہ آنا۔ اسکی باتوں میں نہ آنا ورنہ گرفتار ہوجاؤ گے۔ لیکن فاروقی صاحب نے جو قیاسی تصحیح کی ہے اور لکھا ہے یہاں "کہ کہے مت لگیو" ہوگا تو یہ کسی طرح قابل قبول نہیں ایک تو یہ کہے مت لگیو کی بھونڈی شکل ہے "کہے مت لگیو" یا گھنے مت لگیو میں جو روانی اور

۱- اصلاح الاصلاح ص ۳۹

۲- شب خون ستمبر تا نومبر ۸۲ع ص ۸

فصاحت ہے وہ « کے کہے مت لگیو » میں نہیں ہے۔ اگرچہ « ک کہے » میں اتصال حروف سے ہلکا سا صوتی تاثر مجروح ہوتا ہے مگر فاروقی صاحب کے « ک کہں » میں تو یہ اتصال تنافر کی حد کو چھولیتا ہے۔ پھر اس ٹکـــڑے میں « ک کہن » بنانے سے جو کا حسن بری طرح خون ہوتا ہے وہ بھی قابل غور ہے مجھے تسلیم ہے کہ ہندی کے حـــــروف علت کو گرانا جائز ہے مگر جہاں ان کے گرانے سے صوتی تنافـر پیدا ہو یا مصرع کی روانی، چستی اور فصاحت متاثر ہو وہاں اس کو معیوب ہی قرار دینا صحیح ہے۔ فاروقی صاحب نے بیمار پر گرفتار کو فوقیت دیتے ہوئے ایک دلیل تو اثر صاحب کی اپنائی ہے۔ اثر صاحب نے لکھا تھا کہ جس کی گرفتاری ہوتی ہے اس کا گھر بھی لوٹ لیتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے اس دلیل کا انکار کرتے ہوئے اسی دلیل کو یہ لکھکر قبول کیا کہ « جو شخص گرفتار ہوگیا اس کا گھر تو برباد ہوگا ہی » یہ الفاظ کا الٹ پھیر ہے ورنہ بات وہی ہے جو اثـــر صاحب نے لکھی ہے۔ انھوں نے دوسری دلیل یہ فراہم کی کہ آنکھوں کو حلقۂ زنجیر سے مشابہت ہے۔ اس لیے گرفتار بیمار سے بہتر ہے۔ یہ بھی دور کی کوڑی ہے۔ لیکن کسی حـد تک قابل قبول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مباحث میں مصرع کے در وبست پر کم سے کم غور کیا گیا ہے۔ مصرع ہے۔

مجھ کو ان خانہ خرابوں نے ہی بیمار کیا

اس میں ہی بری طرح کھٹکتا ہے بلکہ حشو معلوم ہوتا ہے اور مصرع کی بندش کو سست کرتا ہے۔ میر کی اصلاح سے ایک طرف « گھنے مت لگیو » یا کہے مت لگیو کا جواز فراہم ہوتا ہے اور دوسری طرف مصرع میں روانی اور فصاحت پیدا ہوتی ہے۔ خانہ خرابوں کی مناسبت بھی گرفتار پر دلالت کرتی ہے۔ اس لیے خاکسار کے شعر پر مـیر کی اصلاح درست ہے سیمـاب اکبر آبادی کا اعـتراض نے جا اور اثر حسنی کا جواب صحیح ہے مگر فاروقی صاحب کی دلیلیں محض تاویلیں ہیں۔

آتش کا شعر ہے ؎

درماں سے درد اور ہمارا ہوا دوچند
مرہم سے زخم سینہ میں ناسور پڑگیا

مصحفی کی اصلاح ہے -

درماں سے درد اور ہمارا ہوا دوچند

مرہم سے داغ سینہ میں ناسور پڑگیا

اس کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زخم اور داغ میں نازک فرق ہے استاد نے زخم کی جگہ داغ بناکر شعر کو ترقی دی ہے.[1] اس پر سیماب نے لکھا کہ ناسور زخم ہی میں پڑتا ہے . درد بھی زخم ہی میں ہوتا ہے . اس لیے شعر محتاج اصلاح نہ تھا . انرا حسنی کا خیال ہے کہ درد داغ اور زخم دونوں میں ہوتا ہے . داغ سے زخم اور زخم سے ناسور بنتا ہے . انہوں نے لکھا کہ سینہ میں داغ پڑنا مسلماتِ شعراء سے ہے اور یہاں سینہ دل کا استعارہ ہے اور یہ اشارہ دل کی طرف ہے . اور دل کو عام طور پر داغ دار باندھا جاتا ہے . اس توجیہہ سے انر صاحب کی مراد یہ ہے کہ «داغ» سے ایک طرف مسلماتِ شعراء کا حق ادا ہوتا ہے دوسرے دل کی داغ داری کی توثیق ہوتی ہے ، جو اردو شاعری میں عام ہے . اس کے علاوہ داغ سے زخم اور زخم سے ناسور سے کا عمل ایک تدریجی عمل ہے جہاں تک درد کا تعلق ہے وہ داغ، زخم اور ناسور تینوں سے وابستہ ہے اس دلیل کی بنیاد پر انرا حسنی گنوری نے لکھا ہے کہ اصلاح درست ہے .[2] شمس الرحمن فاروقی نے حسب معمول انر صاحب کی توجیہہ پر یہ اعتراض کیا کہ «ایک طرف وہ (انرا حسنی) یہ کہتے ہیں کہ سینے میں داغ پڑنا مسلمات شعراء سے ہے تو دوسری سانس میں کہتے ہیں کہ داغ دراصل سینے پر نہیں بلکہ سینے کے اندر یعنی دل پر ہے . اس کا ثبوت وہ یہ دیتے ہیں کہ شاعر نے لفظ «سینے میں» استعمال کیا ہے «سینے پر نہیں»[3] واقعہ یہ ہے کہ انر صاحب کا یہی منشا ہے اس میں کوئی تضاد نہیں لیکن فاروقی اسکو دوراز کار تاویل قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ زخم سینے کے اوپر ہے اور داغ کو مرہم سے اس قدر الرجی ہے کہ مرہم پڑتے ہی

۱ مشاطۂ سخن ص ۲۴

۲ اصلاح الاصلاح ص ۴۰ ، ۴۱

۳ شب خون ستمبر تا نومبر ۸۲ع ص ۹

داغ کھل کر زخم بن گیا اور پھر مرہم نے وہ غضب ڈھایا کہ زخم بگڑ کر ناسور بن گیا فاروقی صاحب نے بہت سامنے کی تاویل کی ہے عشق و محبت کے پس منظر میں داغ سینہ سے داغ دل ہی مراد ہوتا ہے جیسا کہ اثر صاحب نے لکھا ہے کہ معنی اندر اس پر دلالت کرتا ہے کہ زخم سینہ کے اوپر نہیں بلکہ اندر بھی دل میں ہے۔ اس کے علاوہ فاروقی صاحب نے جس طرح داغ کو زخم اور زخم کو ناسور بنایا یہ سارا التزام تو اثر صاحب کی توجیہہ میں موجود ہے جس کا اعتراف خود فاروقی صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ (اثر اجیسی) نے یہ ضرور لکھا ہے کہ شعر کا مطلب نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے داغ کو زخم بنایا جائے پھر اس میں ناسور فرض کیا جائے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب نے اثر صاحب کے نکتہ پر اپنی توجیہہ کی بنیاد رکھی ہے مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ بقول سیماب شعر اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ بقول اثر اصلاح سے شعر کے مدارج بلند ہوتے ہیں لیکن فاروقی صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ شعر میں محض سینے کے اوپر کے زخم کا معاملہ ہے اور بس

آتش کا شعر ہے ؎

داغ دل خون جگر ہے نعمت الوان عشق
سیر اپنی جان سے ہوجاتے ہیں مہمان عشق

مصحفی کی اصلاح ہے

داغ دل، زخم جگر ہے نعمت الوان عشق
سیر اپنی جان سے ہوجاتے ہیں مہمان عشق

توجیہہ میں لکھا ہے کہ استاد نے خون جگر کی جگہ زخم جگر بنایا ہے۔ خوان نعمت میں پینے کی چیز سے کھانے کی چیز زیادہ موزوں ہوتی ہے اس لیے خون سے زخم بہتر ہے۔[1] اس اصلاح پر سیماب اکبر آبادی نے لکھا ہے کہ آتش نے الوان عشق پر دو چیزیں رکھی تھیں۔ ایک کھانے کی اور ایک پینے کی داغ کھانا

---

۱ مشاطۂ سخن ص ۲۴

اور خون جگر پینا محاورہ ہے مگر اصلاح کے بعد دونوں چیزیں کھانے کی ہوگئیں۔ سیماب نے دوسرے مصرع پر یہ اعتراض بھی کیا اس میں «جانے» کی ے دبتی ہے تیسری بات یہ کہی کہ مہماں عشق واحد ہے اور فعل «ہوجاتے ہیں» صیغۂ جمع کا ہے اس لیے شعر اس طرح ہونا چاہیے تھا

داغ دل، زخم جگر ہے نعمت الوان عشق
سیر اپنی جان سے ہوتا ہے ہر مہمان عشق[1]

ابرا حسنی گنوری نے لکھا کہ مشرقی تہذیب میں دسترخوان پر کھانے کی چیزیں ہی رکھی جاتی ہیں پانی کو دسترخوان پر چنا نہیں جاتا داغ کھانا اور زخم کھانا دونوں مسلمہ محاورے ہیں اس لیے مصحفی کی اصلاح درست ہے۔ انھوں نے سقوط حروف علت (یے) کے بارے میں تحریر کیا جب قائدہ متقدمین یہ حق دیتا ہے کہ حروف علت ہندی (الف، واؤ، یے) کا گرانا جائز ہے تو ان کے گرانے پر اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے سیماب کے اصلاح کردہ میں «ہے» کی یے کے سقوط کی طرف توجہ دلائی اور لکھا کہ یہ کیوں دب رہی ہے؟۔ لیکن انھوں نے سیماب اکبر آبادی کے تیسرے اعتراض پر خاموشی اختیار کی یعنی مہماں عشق واحد کے ساتھ «ہوجاتے ہیں» صیغۂ جمع کا فعل کیوں لایا گیا ہے شمس الرحمن فاروقی نے ان دونوں کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھا کہ تنوع کا تقاضا بہرحال یہ تھا کہ مشروب اور ماکول دونوں طرح کی چیزوں کا ذکر ہو اس نکتہ پر وہ سیماب کی تائید کرتے ہیں فاروقی صاحب نے لکھا کہ احتیاط کا تقاضا تھا کہ دوسرے مصرع میں فاعل (مہماں) اور فعل (جاتے ہیں) دونوں ایک ہی صیغے کے نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اچھا تھا، مگر اساتذۂ متقدمین کے طریقے اور عمل سے یہ ثابت ہے کہ واحد فاعل کے ساتھ فعل بصیغۂ جمع لایا جاسکتا ہے۔ جس میں پہلی صورت عام ہے مگر دوسری کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں مثلاً

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
(آتش)

---

۱ دستور الاصلاح ص ۶۰

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ سیماب اکبر آبادی کا اعتراض اور فاروقی صاحب کی کی تائید دونوں کی حیثیت برائے بحث سے زیادہ نہیں۔ فاروقی نے سقوط حروف علت کے اعتراض پر خامہ فرسائی کی کہ "حقیقت حال یہ ہے کہ سیماب کا اعتراض اور ابرا حسنی کا جواب دونوں غلط ہیں" سیماب کا اعتراض تھا کہ مصرع ثانی میں "جاتے ہیں" کی "یے" دبتی ہے۔ ابرا حسنی کا جواب ہے کہ ہندی کے حروف علت کو از روئے قاعدہ گرایا جاتا ہے اس لیے اعتراض غلط ہے۔ فاروقی صاحب نے سیماب کے اعتراض کو اس بنیاد پر غلط ٹھہرایا کہ خود سیماب نے ہندی الفاظ (افعال) کی یے کا گرانا درجنوں جگہ روا رکھا ہے یہ دلیل اس بنیاد پر غلط ہے کہ عروضی، فنی اور لسانی قاعدے طویل تجربوں کے بعد متعین ہوئے ہیں۔ کسی ایک شخص کا عمل ان قاعدوں کو پرکھنے کا معیار نہیں بنایا جاسکتا پھر سیماب نے ہندی حروف علت کو گراکر کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ فاروقی صاحب نے ابر صاحب کے اعتراض کو اس بنیاد پر غلط ٹھہرایا کہ یہ قاعدہ کسی قدیم استاد نے نہیں بتایا کہ حروف علت ہندی کا گرانا درست ہے۔ اور حروف علت غیر ہندی کا گرانا غلط اور یہ کہ اس قسم کے دوسرے، نام نہاد قاعدوں کا سراغ پرانے شعراء کے یہاں نہیں ملتا۔[1] فاروقی صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ ان کی نگاہ میں قدیم استاد کون ہے؟۔ اصول یہ ہے کہ پہلے غلطی سرزد ہوتی ہے پھر اس کا عرفان ہوتا ہے اس کے بعد اس غلطی کا تدارک کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں حاتم، ناجی، شاکر یا آرزو اور ان کے معاصرین سے یہ توقع غیر ضروری ہے کہ وہ حتمی قاعدے وضع کرتے۔ جبکہ اس دور میں زبان تشکیلی مرحلے میں تھی۔ اس کے باوجود حاتم نے دیوان زادے میں اور خان آرزو نے اپنی تحریروں میں بعض اصلاحات پیش کیں۔ جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ میر وسودا کے دور میں اگرچہ زبان دھندلکے سے نکل چکی تھی اور شاعری بھی روشنی میں آچکی تھی اس لیے اس دور کے شعراء کے یہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے لیکن قاعدہ سازی کی معراج لکھنؤ میں ناسخ کے یہاں اور دہلی میں شاہ نصیر اور ذوق کے یہاں نظر آتی ہے۔ ماضی کے تمام تجربوں (غلطیوں) کی روشنی میں

1 شب خون - ستمبر تا نومبر ۸۲ع ص ۱۰

ناسخ ونصیر نے جو قاعدے وضع کیے ہیں ان میں زبردست صداقت ہے فاروقی صاحب کو جدا جانے یہ کیوں وہم ہے کہ ہی اور لسانی قاعدے ناسخ نے نہیں ان کے شاگردوں نے بنائے ہیں اگر یہ بات صحیح بھی ہوتی تو بھی اس سے استاد (ناسخ) کے فیضان نظر کو منہا نہیں کیا جاسکتا معاملہ چونکہ سقوط حروف علت کا ہے اس لیے ناسخ کے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے ان کی ایک اصلاح پیش کی جاتی ہے

خواجہ وزیر کا شعر ہے

عجب ہوا کہ کسی سنگ دل پہ دل آیا		الٰہی خیر کہ شیشہ گرا ہے پتھر پر

ناسخ کی اصلاح ہے

عجب ہوا کہ بت سنگ دل پہ دل آیا		خدا بچائے کہ شیشہ گرا ہے پتھر پر

توجیہہ میں اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ الٰہی کی ی دب کر ادا ہوتی تھی اصلاح سے یہ نقص رفع ہوگیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ناسخ اس اصول پر کار بند تھے کہ شعر میں عربی فارسی اور ترکی الفاظ کے حروف علت کا سقوط جائز نہیں ہے۔ ہندی الفاظ کے حروف علت کا سقوط بعض استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر روا ہے زیر بحث شعر میں دوسرے مصرع میں سیر اپنی جان سے ہوجاتے ہیں مہمان عشق کو اگر یوں بنادیا جاتا کہ « سیر ہوجاتے ہیں اپنی جان سے مہمان عشق » تو زیادہ روانی آجاتی، اگرچہ اس مصرع میں جاتے کی ے کا سقوط از روئے قاعدہ صحیح ہے مگر اس میں ذرا سا نقص روانی ہے اس لیے ذرا سی تبدیلی سے اس میں روانی پیدا ہوگئی ہے حروف علت کے سقوط پر استاد داغ کا فیصلہ یہ ہے

عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں - حرف علت کا برا ان میں ہے گرنا دبنا
الف وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں - لیکن الفاظ میں اردو کے یہ گرنا ہے بجا

صبا اکھنوی کا شعر ہے

نہ جیب میں نہ گریباں میں تار باقی ہے
یہ سن رہا ہوں کہ فصل بہار باقی ہے

آتش کی اصلاح ہے

نہ جیب کا ہے ، نہ داماں کا تار باقی ہے

جنوں کا جوش ہے فصل بہار باقی ہے

توجیہہ میں لکھا ہے کہ «جیب و گریباں» کی جگہ «نہ جیب کا نہ داماں کا» بنایا دوسرے مصرع میں جنوں کا جوش بڑھایا. جیب و دامن کو چاک کرنے کے لیے جوش جنوں کی ضرورت تھی. اور فصل بہار میں جوش جنوں کا ہونا لازم ہے [1]

سیماب اکبر آبادی نے آتش کی اصلاح پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصلاح کے بعد مصرع اولی کی شکل مسخ ہوگئی ہے. اگر پہلے مصرع میں «کا» لانا ہی تھا تو اس کو یوں بنا دیتے

نہ جیب کا نہ گریباں کا تار باقی ہے

اس پر ابراحسنی گنوری نے لکھا تھا کہ جیب اور گریباں ہم معنی ہیں جن میں سے ایک حشو ہے. اس لیے اصلاح صحیح ہے.[2] اس جواب کے بعد سیماب اکبر آبادی نے دستور الاصلاح کے دوسرے ایڈیشن کی توجیہہ میں لکھا کہ آتش نے یہ اصلاح غالباً اس خیال سے دی ہے کہ جیب کے معنی گریباں کے بھی ہیں کہا جاسکتا ہے کہ سیماب نے ابراحسنی کے جواب کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے مگر سیماب نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ دوسرے مصرع میں «جنوں کا جوش ہے» کچھ اچھی اصلاح نہیں. بہار خود سبب جوش جنوں ہوتی ہے اور اس شعر پر دوبارہ اس انداز سے اصلاح دی

نہ جیب ہی کا نہ دامن کا تار باقی ہے   ہنوز شورش فصل بہار باقی ہے [3]

سیماب نے پہلے مصرع میں محض ایک لفظ کی تبدیلی کی تھی یعنی «میں» کی جگہ «کا» بنایا تھا ابراحسنی کے اعتراض کے بعد آتش کے اصلاح شدہ مصرع کو ذرا سے تغیر کے بعد اپنا لیا ہے امیر صاحب نے آتش کی اصلاح کی مزید وضاحت

---

۱ مشاطۂ سخن ص ۲۷

۲ اصلاح الاصلاح ص ۴۵

۳ دستور الاصلاح (طبع دوم) ص ۲۴

کرتے ہوئے لکھا کہ یہاں "میں" بمعنی "اندر" کا شبہ ہوتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ جیب میں (کے اندر) اور گریباں (کے اندر) کوئی تار باقی نہیں ہے لیکن میں کی جگہ کا بنانے سے اس قسم کا شک پیدا نہیں ہوسکتا۔ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ جیب ہی سلامت ہے نہ دامن، دونوں کی تار تک باقی نہیں ہیں اسرا حسنی گوری نے سیماب اکبر آبادی کی دوسرے مصرع کی اصلاح کے بارے میں لکھا کہ فصل بہار کی شورش اور جوش جنوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے یہ اصلاح فضول ہے۔ اس شعر کی بندش پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر زیر بحث خواجہ آتش کی اصلاح کے بعد چار برابر حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے یہ اجزائے خیال بھی ہیں اور اجزائے زبان بھی، شعر اس طرح ہے۔

نہ جیب کا ہے، نہ داماں کا تار باقی ہے جنوں کا جوش ہے، فصل بہار باقی ہے

شعر کے اجزائے خیال و زبان ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور تکملہ بھی کرتے ہیں جس سے زبان کی سلاست اور بیان کی فصاحت نمایاں ہے سیماب اکبر آبادی نے اصلاح کے بعد مطلع اس طرح بنایا

نہ جیب ہی کا نہ دامن کا تار باقی ہے ہنوز شورش فصل بہار باقی ہے

اس میں اگرچہ اجزائے زبان و خیال الگ الگ باقی نہیں ہیں لیکن وہ ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے ہیں جس سے شعر میں روانی اور چُستی پیدا ہوگئی ہے اور شعر کا صوتی آہنگ زیادہ نمایاں ہوگیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر کے مفہوم اور خیال کے تحت شعر کی مجموعی ہیئت کا تاثر کیا ہونا چاہئیے۔ چونکہ اس شعر میں دیوانگی کے المیہ کا اظہار ہے کہ جیب و داماں کا تار تک باقی نہیں ہے اس لیے اس مفہوم کے ادا کرنے کے لیے نرم لب و لہجہ اور سبک رو آہنگ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آتش کی اصلاح اس ضرورت کو پورا کرتی ہے دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اگر فصل بہار کے جنوں یا شورش کو بنیادی حیثیت دی جائے تو پھر بندش کی چستی، لہجے کی بلند آہنگی کی ضرورت ہے۔ مخصوص طور پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آتش کی اصلاح صبا لکھنوی کے شعر کی مجموعی فضا سے ہم آہنگ ہے۔

افسر امروہوی کا شعر ہے

اپنی حیات چند نفس ہے رہائے میں　　گدرے قفس کے گوشے میں یا آشیانے میں

شوق کی نگاہ میں یہ شعر درست ہے اس لئے انھوں نے اس پر صاد سا دیا۔ لیکن سیماب اکبر آبادی نے اعتراض کیا کہ شوق نے اس شعر کو علی حالہ چھوڑ دیا انھوں نے لکھا کہ دوسرے مصرعے میں گوشے کی "یے" دبتی ہے اس لیے مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا۔

گدرے قفس میں یا ہو بسر آشیانے میں[1]

ابرا حسنی گنوری نے لکھا کہ گوشہ فارسی زبان کا لفظ ہے اگر اس کا املا «ہ» سے (گوشہ) مانا جائے تو ایسے الفاظ میں «ہ» کا گرانا ہی عین فصاحت ہے اور اگر گوشے کا املا «ے» (گوشے) کریں تو یہ لفظ اردو یا ہندی بن جاتا ہے اور اردو ہندی حروف علت کا گرانا جس میں «یے» بھی شامل ہے متفقہ طور پر جائز ہے[2] واقعہ یہ ہے کہ سیماب اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہیں تو وہ اردو ہندی حروف علت کے سقوط پر اعتراض کرتے ہیں اور کہیں ان کے سقوط کو جائز تصور کرتے ہیں۔ سیماب اکبر آبادی کے کلام میں سقوط حروف علت ہندی اور سقوط حروف علت فارسی و عربی کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن انھوں نے افسر کے مصرع میں گوشے کی «یے» کے سقوط پر اعتراض کیا ہے۔ سیماب اکبر آبادی کے استاد داغ دہلوی سے ناسخ تک اساتذۂ فن کا وہی اصول رہا ہے جس کو ابسر صاحب نے بیان کیا ہے اور صاحب نے لکھا ہے کہ گدرے «ذال» سے ہے سیماب صاحب نے «گزرے» «رے» سے لکھا ہے جو غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گذران، گذشتن اور گذاشتن اور ان کے مشتقات کو دال سے لکھنا صحیح ہے مثلاً گدشتہ، گدرگاہ، درگدر وغیرہ۔ لیکن گزاردن اور اس کے مشتقات کو رے سے لکھنا صحیح ہے مثلاً گزارش، خدمت گزار وغیرہ گذرے کا تعلق گذاردن سے ہے اس لیے گدرے کو دال سے لکھنا درست ہے اساتذۂ قدیم کے عمل سے اس کی توثیق ہوتی ہے مثلاً

ایسا تیرا رہ گدر نہ ہوگا　　ہر گام پہ جس میں سر نہ ہوگا　　(میر)

۱　دستور الاصلاح　ص ۸۹
۲　اصلاح الاصلاح　ص ۵۴

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب (غالب)

ساحر بیتھوی کا شعر ہے

حذفِ اُلفت دیکھیے آخر نہ ان سے ضبط ہوا
وہ پریشان ہوگئے سن کر پریشانی میری

احسن مارہروی کی اصلاح ہے

حذفِ الف دیکھیے آخر ہوا ان سے نہ ضبط
وہ پریشان ہوگئے سن کر پریشانی میری

پہلے مصرع میں ضبط کی «ط» ساقط ہوگئی تھی۔ احسن مارہروی نے الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے یہ عیب دور کردیا۔ سیماب اکبرآبادی نے اپنے محاکمہ میں اس بات کو تسلیم کرلیا کہ پہلے مصرع میں ضبط کا «طوئے» ساقط تھا اس لیے اصلاح درست ہے لیکن اس پر اپنی اصلاح بھی پیش کی ہے

حذفِ الف دیکھیے آخر نہ ضبط ان سے ہوا

احسن نے «آخر ہوا ان سے نہ ضبط» بنایا تھا سیماب نے ذرا سے رد و بدل کے ساتھ «آخر نہ ضبط ان سے ہوا» بنادیا لیکن دستور الاصلاح کے دوسرے ایڈیشن میں اصلاح حذف کردی اس کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے احسن مارہروی کی اصلاح کو تسلیم کرلیا ہے سیماب صاحب نے اس اصلاح پر اظہار خیال کرتے ہوئے عاجز پر طنز کیا تھا کہ تعجب ہے کہ جو شخص شعر کہہ سکتا ہے وہ یہ کیوں نہیں جانتا کہ مصرع میں کون سا حرف گر رہا ہے' اثر احسنی گوری نے لکھا کہ کسی مبتدی سے یہ توقع رکھنا کہ اس کو عروضی اور فنی نکات پر قدرت حاصل ہوگی ایسا ہی ہے جیسے کسی بچہ سے جو بولنا سیکھ رہا ہو صرف و نحو کے علم کی توقع کی جائے[۱] ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیماب نے اثر احسنی کے جوابی سلسلے کے بعد دستور الاصلاح کے دوسرے ایڈیشن میں ترمیم کی ہے۔

---

۱ اصلاح الاصلاح ص ۶۴

(۲) سیماب اکبر آبادی کی اصلاحوں پر ابر احسنی کی اصلاحیں اور ان کا جائزہ

سیماب اکبر آبادی نے اساتذۂ فن کی اصلاحوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے جہاں اصلاحوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کی تھی۔ وہیں انھوں نے اساتذہ کی اصلاحوں پر اصلاحیں بھی پیش کی تھیں اگرچہ یہ بات عجیب و غریب تھی کہ دوسروں کے کلام پر بے طلب اصلاح دی جائے لیکن اس عمل سے سیماب اکبر آبادی کا نظریۂ فن اور قدرت کلام دونوں کا اندازہ ہوجاتا ہے ابر احسنی گنوری نے سیماب کی اصلاحوں پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے یہی رویہ اپنایا ہے انھوں نے سیماب کی اصلاحوں اور ان کی توجیہوں کا جائزہ لیا اور ان کی اصلاحوں پر اپنی اصلاحیں پیش کیں ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جس سے ابر احسنی گنوری کی فنکارانہ اور نکتہ رس طبیعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے

کیفی جام پوری کا شعر ہے؎

ہر موجۂ صبا میں ہے روح شگفتگی ہر قطرہ ایک آذر لستاں ہے آج کل

سیماب اکبر آبادی کی اصلاح ہے

ہر موجۂ صبا میں ہے روح شگفتگی ہر قطرہ ایک ابر زمستاں ہے آج کل

سیماب نے توجیہہ میں لکھا کہ آذر کو لستاں سے اور قطرہ کو آذر سے کوئی تشبیہ تھی نہ مناسبت۔ نہ آذر سے شگفتگی کا کوئی مفہوم پیدا ہوتا تھا اب قطرہ کو ابر زمستاں بناکر ترقی دی تو اس سے یک گونہ شگفت پیدا ہوگئی ہے ابر احسنی گنوری نے اپنی تنقید میں توجیہہ کو تسلیم کیا کہ ابر زمستاں اور قطرے میں مناسبت ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ شعر میں آذر سے قطرے کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اصلاح سے یہ عیب واقعی دور ہوگیا مگر انھوں نے اصلاح پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ اصلاح میں ایک اور زمستاں دونوں حشو ہیں گویا «ہر قطرہ ایک آذر ہے» لکھنا کافی تھا پھر خود ہی جواب دیا کہ «زمستاں» کو بضرورت قافیہ تسلیم کیا جاسکتا ہے ایک، دو، تین ابر نہیں ہوتے اس لیے اصلاح میں لفظ ایک حشو ہے میرا خیال ہے کہ ہر قطرہ کے ساتھ ایک ابر مناسب ہے۔

یہ حشو قبیح نہیں۔ اساتذہ کے کلام میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کو حشو متوسط قرار دیا جاسکتا ہے۔ ابر صاحب نے اصلاح شدہ مصرع سے ایک نکالنے کے لیے اس طرح اصلاح دی

ہر قطرہ ابر فصل بہاراں ہے آج کل[1]

اس میں شک نہیں کہ مصرع سے «ایک» خارج ہوگیا۔ اور اصلاح سے مصـــرع مزید چست ہوگیا مگر اس میں بھی وہی صورت ہے جو سیماب کے اصلاح کردہ مصرع میں تھی وہاں ایک حشو نظر آتا تھا۔ یہاں «فصل» پر اس کا گمان ہوتا ہے۔ «ابر بہاراں» کافی ہے «ابر فصل بہاراں» اور ابر بہاراں میں کوئی فرق نہیں لیکن اس مصرع میں «ایک» کی طرح فصل حشو قبیح نہیں ہے۔ بہاراں اور «فصل بہاراں» دونوں مستعمل ہیں اور ہماری شاعری اور زبان کا جزو لاینفک ہیں۔ البتہ ابرا حسنی کی اصلاح کے بعد مصرع زیادہ صاف اور واضح نظر آتا ہے۔ ابراحسنی گنوری نے اس شعر پر تنقید کرتے ہوئے «املا» کا مسئلہ اٹھایا اور اور اعتراض کیا کہ کیفی نے اپنے شعر میں اور سیماب نے اپنی توجیہہ میں آدر کو ذال سے (آذر) لکھا ہے۔ آذر (ذال سے) کے معنی رومی مہینے کے ہیں۔ اس شعر میں آزر زے سے ہے یہ اعتراض صحیح ہے۔ آزر حضرت ابراھیمؑ کے والد کا نام ہے جس کا املا زے سے ہے۔ اس لفظ کی تمام ترکیبوں میں زے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً خانۂ آزر صنعت آزری وغیرہ

نقش پا کی صورتیں وہ دل فریب تو کہے بت خانۂ آزر کھلا
(غالب)

بوسہ روا نہ ہر طریق، سجدہ وفرق ہر طریق
سنگ در اس کا اک صنم رشک بتان آزری
(مومن)

الم مظفر نگری کا شعر ہے

---

۱ دستور الاصلاح ص ۱۱۹

دیدۂ محفل سے پنہاں ہے مآل سوز و ساز
یعنی وہ عالم جو پروانے کی خاکستر میں ہے

سیماب کی توجیہہ ہے کہ یعنی سے صرف مآل سوز و ساز کی تشریح ہوتی ہے۔ پانے سے اس مفہوم میں کوئی فرق نہ آیا اس میں رومان بھی پیدا ہوگیا۔ امراحسن گنوری نے اعتراض کیا کہ اس شعر کے دوسرے مصرع میں یعنی کی «ی» ساقط ہے۔ اگرچہ سیماب صاحب نے یعنی کو نکال دیا۔ لیکن توجیہہ میں یہ بھی لکھا کہ ی ساقط ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الم اور سیماب دونوں کو ی کے سقوط کا علم نہیں۔ سیماب کی اصلاحیں اور کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی و فارسی الفاظ کے حروف علت کے سقوط کو یا تو اصولاً صحیح سمجھتے تھے یا اس اصول پر کاربند نہ تھے۔ امرا حسن کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ « عالم خاکستر پروانہ» مآل سوز تو ہے ساز کیونکر ہوا۔ اس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ پروانہ جو شمع پر جل کر خاکستر ہے وہ اس سوز کے نتیجے میں ہے جو محبت کی بدولت اس کی سرشت میں شامل ہے۔ یا جلنے میں سوز ہوتا ہے لیکن پروانے کی خاکستر ساز کا نتیجہ کس طرح ہوسکتی ہے چنانچہ امر صاحب کو یہ لفظ «ساز» حشو معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے مصرع سے حشو نکالنے کے لئے اس طرح اصلاح دی

« دیدۂ محفل سے پنہاں ہے مآل سوز عشق»[1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امر صاحب کو اصلاحی لفظ پانے (بجائے یعنی) تو پسند ہے لیکن انہیں سوز پر اعتراض ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک لفظ کی تبدیلی (ساز کی جگہ عشق) سے یہ عیب دور ہوگیا ان مباحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اساتذۂ فن خیال اور لفظ نیز لفظ اور خیال کی شدید ترین ہم آہنگی کے قائل ہیں اور ہئیت کو نکھارنے اور سنوارنے پر شدید ریاضت کرتے ہیں۔

الم مظفر نگری کا شعر ہے۔

گوشے گوشے کو چمن کے آشیاں کا ذکر کیا لے اڑوں گا ایک دن وہ زور بال و پر میں ہے

---

۱ اصلاح الاصلاح ص ۸۱

سیماب کی اصلاح ہے

آشیاں و دام کا کیا ذکر سارے باغ کو لے اڑوں گا ایک دن وہ زور بال و پر میں ہے

سیماب نے توجیہہ میں لکھا کہ اس شعر میں ناگوار تعقید ہے اس میں دورائیں نہیں کہ الم کے شعر میں تعقید لفظی ہے۔ اصولاً اس کی نثر یوں ہوتی کہ میرے بال و پر میں وہ زور ہے کہ آشیاں کا ذکر نہیں بلکہ چمن کے گوشے گوشے کو لے اڑوں گا لیکن شعر میں گوشے گوشے کو چمن کے اور لے اڑوں گا کہ درمیان «آشیاں کا ذکر کیا» فقرہ ہے جس سے کلمات متصل ایک دوسرے سے دور ہیں اور ان کے درمیان ایک ایسا ٹکڑا ہے جس کو وہاں نہیں ہونا چاہئے اس طرح تعقید لفظی کا عیب ہے لیکن تعقید کبھی کبھی شعر کے لئے ناگزیر ہوتی ہے اگر وہ شعر کی ہئیت اور اس خیال پر اثر انداز نہ ہو تو عیب نہیں ہے۔ انر صاحب نے اس سے اتفاق کیا کہ واقعی اس شعر میں تعقید کا عیب تھا۔ لیکن ان کا اعتراض ہے کہ اصلاح شدہ مصرع میں «کو» حشو ہے اگر مصرعے سے اس کو نکال دیں تو نفس شعر اور مصرع کی ہئیت میں کوئی کمی نہیں رہتی۔ یعنی آشیاں و دام کا ذکر نہیں میں سارا باغ لے اڑوں گا پر بات مکمل ہوجاتی ہے۔ اس لئے یہاں «کو» حشو قبیح ہے پھر انہوں نے اپنی اصلاح پیش کی اور لکھا کہ مصرع یوں ہوسکتا ہے

آشیان و دام کیسے گلشن و صیاد بھی

اس مصرعے سے خیال کی ترقی ہوتی ہے۔ یعنی میرے بال و پر میں وہ زور ہے کہ میں آشیان و دام ہی نہیں بلکہ گلشن اور صیاد کو بھی لے اڑوں گا اس کے علاوہ کا کیا میں جو اتصال نے ہلکا سا تنافر پیدا کردیا تھا وہ بھی دور ہوگیا

اعجاز صدیقی کا شعر ہے

میرا قصور ہے کہ نہیں طرف سوز عشق نے اعتبار تیری نظر کو بناؤں کیا؟

سیماب کی اصلاح ہے

میرا قصور ہے کہ نہیں ظرف کیف عشق بے اعتبار تیری نظر کو بناؤں کیا؟

سیماب نے توجیہہ میں لکھا ہے کہ حسن کی نظر سے کیف پیدا ہوتا ہے۔ سوز پیدا نہیں ہوتا نگاہ عشق پُر سوز اور نگاہ حسن پر کیف ہوتی ہے اررا حسنی گنوری

نے اس اصلاح کی تعریف کی اور لکھا کہ « سوز » کی جگہ کیف مناسب ہے لیکن یہ اعتراض بھی کیا کہ مصرع ثانی میں « نظر کو بے اعتبار بتاؤں » کہنے کا محل تھا بے اعتبار بناؤں فصحا کی زبان نہیں اس لیے مصرع اس طرح ہوسکتا ہے [1]

بے اعتبار تیری نظر کو بتاؤں کیا

سوال یہ ہے کہ جب مجھے طرف کیف عشق حاصل نہیں ہے تو میں تیری نظر کو کیا بے اعتبار بناؤں ؟ کہا جائے یا جب مجھے طرف کیف عشق حاصل نہیں ہے تو میں تیری نظر کو کیا بے اعتبار بتاؤں (ٹھہراؤں کے مفہوم میں) کہا جائے اثر سے یہ بات واضح ہے کہ ظرف کیف عشق حاصل نہ ہونے کی صورت میں محبوب کی نظر کو کیا بے اعتبار بتاؤں کا ہی محل ہے . محبوب کی نظر کو بے اعتبار بنایا نہیں جاسکتا. اس لیے اثر احسنی کی اصلاح درست معلوم ہوتی ہے

اثر اکبرؔ آبادی کا شعر ہے

اڑا پھرتا ہوں میں جبریل بن کر آسمانوں میں
وہ مجھکو اس سے زیادہ اور بھی آزاد کیا کرتے

سیماب نے توجیہہ میں لکھا کہ زیادہ ، پیادہ ، پیالہ ، نہ اعلان یا فصیح ہیں (یعنی ان الفاظ کو مفعولن کے وزن پر لکھنا اور بولنا چاہئیے .) اثر احسنی گنوری نے اعتراض کیا کہ یہ لفظ زیادہ (بروزن فعلن) غلط ہے . اور فعولن کے وزن پر صحیح ہے اس لیے اس لفظ کو یہاں غیر فصیح نہیں بلکہ غلط کہنا چاہئیے . ان کی دلیل یہ ہے کہ زیادہ کی « یے » حروف معتبرہ میں سے ہے . جس کا گرانا سخت غلطی ہے . اثر صاحب کا خیال ہے کہ اردو کے بعض الفاظ میں یا کا اعلان کرنا یا نہ کرنا فصیح اور غیر فصیح ہوسکتا ہے . مثلاً پیار بروزن حمار (فعول) غیر فصیح ہے لیکن بروزن جار (فاع) فصیح ہے ان کی حتمی رائے یہ ہے کہ چونکہ زیادہ فارسی کا لفظ ہے اس لیے یا کا اعلان ضروری ہے اس لیے یہاں معاملہ فصیح اور غیر فصیح کا نہیں بلکہ غلط اور صحیح کا ہے اثر صاحب کی رائے صحیح ہے کہ زیادہ کا صحیح تلفظ فعولن کے وزن پر ہے زیادہ بروزن فعلن غیر فصیح نہیں

---

۱ اصلاح الاصلاح ص ۸۷

بلکہ غلط ہے۔ اس کے بعد اثر صاحب نے اس شعر کے مصرع اولی پر چند اعتراضات کیے۔ (۱) کیا جبریل بن کر آسمانوں پر اڑتے پھرنا حد درجہ کی آزادی ہے ؟ کیا جبریل کی قوت پرواز دوسرے فرشتوں سے زیادہ ہے، جو اس سے تشبیہ دی گئی ہے ؟ کیا «اڑتا پھرتا ہوں» کی جگہ «اڑا پھرتا ہوں» کہنا صحیح ہے ؟ ان سوالوں کے بعد انھوں نے پہلے مصرع میں اس طرح ترمیم کی [1]

فضاؤں سے گزر کر اڑ رہا ہوں آسمانوں پر

واقعہ یوں ہے کہ اثر کا پہلا مصرع بہت کمزور تھا اڑے پھرنا اور اڑتے پھرنا میں نازک فرق ہے دونوں کا محل استعمال الگ الگ ہے پھر جبریل بن کر اڑتے پھرنے سے کیا فائدہ اثر صاحب کے اصلاح شدہ مصرع نے اس شعر کو شعر بنا دیا اس میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ میں فضاؤں سے گزر کر آسمانوں پر اڑ رہا ہوں۔ اس کے بعد ان سے آگے بھی اڑوں گا اس میں آزادی کا وسیع تصور پوشیدہ ہے اور اس کے پورے امکانات بروئے کار آنے کی بشارت بھی ہے۔

سری کرشن فدا پٹیالوی کا شعر ہے۔

لپٹے ہے ہر بگولہ ہمارے مزار سے جیسے کہ سوگوار ملے سوگوار سے

سیماب کی اصلاح ہے

لپٹتا ہے یوں بگولہ ہمارے مزار سے جس طرح سوگوار ملے سوگوار سے

سیماب میں توجیہہ میں لکھا کہ «لپٹے ہے» متروک زبان ہے۔ ایسے موقع پر «لپٹا ہے» لکھا جاتا ہے اس کے علاوہ جیسے کے بعد «کہ» زائد ہے اثر احسن گنوری نے اس توجیہہ سے اتفاق کیا اور کہا کہ اصلاح صحیح ہے مگر انھوں نے سوال اٹھایا کہ بگولہ ہمارے مزار سے کیوں لپٹتے ہے جب مزار سے بے وجہ لپٹنا ضروری ہے تو پھر بگولہ کی ہی کیا خصوصیت ہے ؟ ہر چیز لپٹ سکتی ہے لیکن فدا نے لپٹنے کی وجہ سوگواری بتائی ہے «یعنی جس طرح سوگوار سوگوار سے لپٹتا ہے» لکھا ہے اثر صاحب نے لکھا کہ بالفرض مزار کو سوگوار مان بھی لیا جائے تو بگولہ کو سوگوار نہیں مانا جاسکتا۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں

---

1 اصلاح الاصلاح ص ۹۲ - ۹۳

میں کوئی قرینہ ہونا چاہئے تھا۔ یہاں وجہ شبہ (شبہ اور شبہ بہ کے درمیان) ظاہر نہیں ہے۔ اس لیے بقول اثر پہلے مصرع میں اس طرح تبدیلی ہوسکتی ہے۔

لپٹا ہے یوں نگولہ غریب الدیار سے

غریب الدیار کے ثبوت میں اثر صاحب نے لکھا کہ نگولہ بے دیار ہوتا ہے غریب الدیار بے دیار ہوتا ہی ہے اس لیے دونوں بے دیاری کے سبب سوگوار ہیں اور اسی سوگواری نے نگولہ اور غریب الدیار کو سوگواری کے انداز میں ملنے پر مجبور کیا نگولہ کے مزار سے لپٹنے اور غریب الدیار سے لپٹنے میں جو لطیف اور نازک امتیاز ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔

سیماب کی اصلاحوں اور توجیہات نیز ان پر اثر صاحب کی اصلاحوں اور تنقیدوں کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیماب اکبر آبادی اور اثر صہبائی اگرچہ ایک ہی دبستان فن سے وابستہ ہیں لیکن دونوں کے فنی شعور میں فرق ہے اثر صہبائی کا شعور فن سیماب کے شعور فن سے زیادہ بالیدہ ہے۔ لیکن اس سے سیماب اکبر آبادی کی قادر الکلامی اور فنکارانہ فتوحات پر حرف نہیں آتا۔

(٣) شاگردوں کے کلام پر اثر صہبائی کی اصلاحیں اور ان کا جائزہ

سیفی پریمی کا شعر ہے

بہار شوخی لٹی ہوئی ہے نظر سے حیرت برس رہی ہے
میں اپنی ہستی تباہ کردوں تم آج اتنے اداس کیوں ہو

اثر صہبائی کی اصلاح ہے

بہار شوخی لٹی ہوئی ہے نظر سے حسرت برس رہی ہے
میں اپنی ہستی نثار کردوں تم آج اتنے اداس کیوں ہو

توجیہہ میں اثر صاحب نے لکھا کہ شعر میں حیرت کا محل نہیں حسرت کا ہے[١] محبوب اداس ہے، اس کی بہار شوخی لٹی ہوئی ہے اور نظر سے حسرت برس رہی ہے۔

١ میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ١٦٩، ٢٧٠

محبوب کو اس عالم میں دیکھ کر شاعر کہتا ہے کہ میں تم پر اپنی ہستی نثار کرنے کو تیار ہوں۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم آج اتنے اداس کیوں ہو؟ محبوب کی اداسی کی نسبت سے حسرت برمحل ہے۔ اور دوسرے مصرع میں ہستی تباہ کرنے کا محل نہیں بلکہ شعر کے سیاق و سباق میں ہستی نثار کرنے کا محل ہے۔

عروج زیدی کا شعر ہے

در جنت پہ میں پہنچا تو یہ مجھ کو پیام آیا
جہاں پہلے یہاں کہانی تھی ٹھوکر وہ مقام آیا

اثرا حسنی کی اصلاح ہے

در جنت پہ میں پہنچا تو یہ غیبی پیام آیا
جہاں پہلے یہاں کہانی تھی ٹھوکر وہ مقام آیا

اثر صاحب نے توجیہہ میں لکھا ہے کہ جنت کے دروازے پر پہنچنے پر دنیا سے رشتہ منقطع ہوجاتا ہے اور آخرت میں کسی سے دوستانہ یا رشتہ نہیں اس لیے پیغام آنے کا امکان نہیں۔[1] اس لیے «مجھ کو» نکال کر «غیبی» بنایا تاکہ در جنت پر پیغام ملنے کا جواز پیدا ہوجائے۔ پہلے مصرع میں میں اور مجھ کو دو الفاظ ہیں جن میں سے مجھ کو حشو ملیح ہے «مجھ کو» کی جگہ «غیبی» رکھنے سے یہ عیب دور ہوگیا۔

یوگیندر پال صابر کا شعر ہے

ظلم کا ظلم جفاؤں کا جفاؤں سے جواب شان انصاف سہی، شان محبت تو سہی

اثرا حسنی کی اصلاح ہے

ظلم کا ظلم سے نخوت کا تکبر سے جواب شان انصاف سہی، شان محبت تو سہی

اثر صاحب نے توجیہہ میں لکھا کہ اہل زبان کی صحیح بول چال کی رو سے ظلم کا ظلم سے اور جفاؤں کا جفاؤں سے ہونا چاہیے جس میں دوسرے ظلم کے بعد

---

۱ میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ۲۶۳ - ۲۶۴

«سے» محذوف ہے۔ اس کے علاوہ ظلم اور جفا تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔[1] واقعہ یہ ہے کہ اصلاح سے شعر میں تنوع پیدا ہوگیا ہے اور ترقی کے عناصر کا اضافہ ہوا ہے۔ ظلم کا ظلم سے ایک بات ہے اور بحوت کا تکبر سے جواب دینا دوسری بات ہے اصلاح سے شعر کی ہیئت بھی دلکش ہوگئی ہے اور تہ داری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

پرکاش ناتھ پرویز کا شعر ہے

کس کے چہرے پہ غم کی دھول نہیں　　　　کون سا دل ہے، جو ملول نہیں

ابرا حسنی کی اصلاح ہے

فصل گل ہے، مجھے قبول نہیں　　　　کون سا دل ہے، جو ملول نہیں

ابر صاحب نے توجیہہ میں دو باتیں کہی ہیں «دھول» (قافیہ) کریہہ ہے۔ اور شعر دو لخت ہے[2] میرا خیال ہے کہ کسی لفظ کو اس کے سیاق و سباق سے ہٹاکر کریہہ نہیں کہا جاسکتا کراہت کے دو پیمانے ہیں ایک معروضی اور دوسرا ذوق سلیم ان دونوں اصولوں کی روشنی میں «دھول» کو کریہہ نہیں کہا جاسکتا اس مسئلہ میں ابر صاحب ابن رشیق، قدامہ اور شبلی کے نظریۂ لفظ و معنی کے علم بردار نظر آتے ہیں البتہ ابر صاحب کی دوسری بات بالکل صحیح ہے کہ شعر دولخت ہے بلکہ دونوں مصرعوں میں تقریباً ایک ہی بات کہی گئی ہے ہر شخص کے چہرے پر غم کی دھول ہونا اور ہر شخص کا دل ملول ہونا ایک ہی جذبے کے دو مترادف اظہار ہیں۔ اصلاح سے یہ عیب بھی دور ہوگیا اور شعر کا معنوی کینوس وسیع ہوگیا۔ اب یہ معنی روشنی کی پھوار بن کر ظاہر ہورہے ہیں چونکہ ہر شخص کا دل ملول ہے اسلیے مجھے یہ قبول نہیں ہے کہ یہ فصل گل ہے فصل گل آزادی خوشحالی اور نشاط کی علامت ہے

مختار ہاشمی کا شعر ہے

اب ان کا جواب ان کو دکھانا ہی پڑے گا
اک پردہ ہے دل کا، سو اٹھانا ہی پڑے گا

۱　میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ۲۴۱
۲　میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ۲۲۷

ابرا حسنی کی اصلاح ہے

اب ان کا جواب اُن کو دکھانا ہی پڑے گا
آئینۂ دل سامنے لانا ہی پڑے گا

ابر صاحب نے توجیہہ میں لکھا کہ دل پردہ نہیں ہے۔ مختار نے دل کو پردہ قرار دے کر اس کو اٹھانے کی بات شاید اس لیے کی تھی کہ دل زندگی کا استعارہ ہے۔[1] اس کو اٹھا کر یعنی مر کر محبوب کو جواب دیا جاسکتا ہے لیکن اس سے کوئی بات نہیں بنتی۔ ابر صاحب نے محبوب کے جواب کے لیے آئینۂ دل کو سامنے لانے کی تجویز پیش کی ہے۔ آئینۂ دل محبوب کے مقابل ہے۔ اس میں محبوب کی صحت کے ساتھ عکس بھی اسی کا ہوگا۔ اصلاح سے نہ صرف یہ کہ شعر کی ہیئت حسن آفریں ہو گئی ہے بلکہ اس کی معنویت اور تغزل دونوں میں بھرپور اضافہ ہو گیا ہے۔

شوق اثری رام پوری کا شعر ہے

کوئی سنتا نہیں زمانے میں ایسی کیا بات ہے فسانے میں

ابرا حسنی کی اصلاح ہے

کوئی سنتا نہیں زمانے میں بات کیا ہے مرے فسانے میں

ابر صاحب نے توجیہہ میں لکھا کہ لوگ ہر ایک افسانے کو سننے سے انکار نہیں کرتے بلکہ عام طور پر لوگ دوسروں کے قصوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔[2] دوسرے مصرع میں «مرے» شامل کیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ میرے افسانے میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جس کی وجہ سے زمانے میں کوئی اسکو سننا نہیں چاہتا۔ ثابت ہوا کہ الرجی افسانے سے نہیں «میرے افسانے» یعنی «مجھ» سے ہے۔ اصلاح سے شعر بلند تر ہو گیا ہے

سلطان نظامی رامپوری کا شعر ہے

تو لاکھ مہرباں ہو، مگر باغباں نہیں
مٹنے کا میرے دل سے غم آشیاں نہیں

---

١ میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ٢١٥
٢ میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ٢٠٣

ابرا حسنی کی اصلاح ہے

میں اتنا خود غرض تو مرے باغباں نہیں
گلـــزار کا ہے رنج، غم آشیاں نہیں

توجیہہ میں ابر صاحب نے کئی باتیں لکھی ہیں مثلاً (۱) پہلے مصـــرع کی ردیف بیکار ہے۔ (۲) دوسرے مصرع میں تعقیـد ہے (۳) تخیئل میں ندرت نہیں [1] اس شعر میں شاعر کی تخیئل کی اصلاح کی ضرورت ہے، وطن دوستی بڑی چیز ہے اس میں شک نہیں کہ مصرع کا دروبست اور الفاظ کی ترتیب بیحد کمزور ہے۔ پہلے مصرع میں ردیف «نہیں» بیکار ہے اور دوسرے مصرعے میں تعقید یوں ہے «مٹنے کا» اور «غم آشیاں» کے درمیان میرے دل سے کا ٹکڑا ہے۔ یہ دونوں ہئیت اور اسلوب کے عیوب ہیں جنھیں دور کرکے مصرعوں کو سانچے میں ڈھالا گیـا ہے اس شعر کی آخری بات یہی اہم ہے جس میں شاعـر کی تخیئل کی درستی اور وطن دوستی کی بات کہی گئی ہے۔ شاعر کا مفہوم یہ تھا کہ اے باغبـاں چاہے تو مجھ پر لاکھ مہرباں ہو مگر میرے دل سے غم آشیاں دور نہ ہوگا اس سے ایک طرف بقول ابرا حسنی جذبۂ حب الـوطنی پر آنچ آتی ہے اور دوسری طرف انسان کی بلند حوصلگی اور عالی ظرفی پر حُرف آتا ہے۔ اصلاح سے یہ تمام صوری اور معنوی عیوب دور ہوگئے۔

ظہیر غازی پوری کا شعر ہے

زندگی موت کے سانچے میں ڈھلا کرتی ہے صبح ہونے کے لیے شام ہوا کرتی ہے

ابر صاحب کی اصلاح ہے

غم کی ظلمت ہی مسرت کی ضیا کرتی ہے
صبح ہونے کے لیے شام ہوا کرتی ہے

ابرا حسنی گنوری نے توجیہہ میں دو باتیں لکھی ہیں۔ (۱) قوافی میں ایطا ہے۔ (۲) دونوں مصرعے آپس میں بے ربط ہیں۔[2] چونکہ قوافی کے اصل الفاظ «ڈھل» اور

---

۱ میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ۱۸۰
۲ « « « « ۱۵۰

«ہو» ہیں۔ دونوں ناممعی ہیں اور ہم قافیہ بھی نہیں ہیں۔ دونوں میں الف ماضی مطلق کا ہے یعنی اس پر تکرار حروف متحد المعنی کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے اس مطلع میں ایطا ہے ظہیر نے زندگی کے موت کے سانچے میں ڈھلنے کو صبح ہونے کے لیے شام ہونا قرار دیا ہے۔ یعنی یہ کہا کہ موت کے بعد صبح زندگی نمودار نہیں ہوسکتی شعر میں ایسا کوئی قرینہ نہیں جس سے یہ بات واضح یا ثابت ہوسکے۔ انر صاحب نے اصلاح سے یہ سقم دور کیا اور مطلع کو زیادہ چست اور مربوط بنایا۔ اصلاح شدہ مطلع کا مفہوم صاف ہے جس میں غم کی ظلمت کو شام اور مسرت کی ضیا کو صبح کہا ہے اصلاح کے بعد شعر صوری اور معنوی حسن کا پیکر ہوگیا ہے۔

عزیز اندوری کا شعر ہے

غم کی آسودگی کا نام نہ لو یعنی تم نے بسی کا نام نہ لو

انرا حسنی کی اصلاح ہے

دل کی آسودگی کا نام نہ لو اس جہاں میں خوشی کا نام نہ لو

انرا حسنی گنوری نے توجیہہ میں لکھا کہ «غـــم کی آسودگی» بے معنی بات ہے۔ دوسرا مصرع بھی مہمل ہے سوال یہ ہے کہ بے بسی کا نام کیوں نہ لیا جائے؟ غم کی آسودگی سے بے بسی کیسے دور ہوسکتی ہے؟ غم آسودہ ہوگا تو بے بسی اور بڑھے گی۔[1] اس لئے دونوں مصرعے محتاج اصلاح ہیں۔ انر صاحب نے «غم» کی جگہ «دل» بنایا۔ یعنی «دل کی آسودگی کا نام نہ لو» اور دوسرے مصرع میں «یعنی تم بے بسی» نکال کر «اس جہاں میں خوشی» رکھا جس سے پہلے مصرع کا مفہوم نہ صرف واضح ہوگیا بلکہ اس کا تدریجی ارتقا بھی نظر آتا ہے اس کے علاوہ یعنی (جو فارسی لفظ ہے) کی ی ساقط تھی جس کا گرانا غلط ہے اصلاح سے یہ عیب بھی دور ہوگیا اصلاح سے نہ صرف یہ کہ صوری عیوب دور ہوگئے بلکہ معنوی جھول بھی غائب ہوگئے ہیں۔

بدیع الزماں خاور کا شعر ہے

---

۱ میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ۱۲۱

زندگی نکھرتی ہے جنوں میں بہانے سے
یہ خبر نہیں اب تک زندگی شماروں کو

ابر احسنی کی اصلاح ہے

زندگی نکھرتی ہے جنوں میں بہانے سے
یہ خبر نہیں اب تک عشرتوں کے ماروں کو

ابر صاحب نے توجیہہ میں لکھا کہ «زندگی شمار» مہمل بات ہے اگر اس کا کوئی مفہوم نکال بھی لیا جائے تو یہاں اس کا محل نہیں [1] عشرت کے مارے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنی زندگی وقف عیش کردیتے ہیں چونکہ دنیا میں تمام کارہائے نمایاں محنت، جاں فشانی اور ظلم برداشت کرنے کے بعد ہوتے ہیں۔ اس لیے محنت کے بغیر انسان کو راحت میسر نہیں ہوتی ابر صاحب نے زندگی شماروں کی جگہ «عشرتوں کے ماروں» لکھ کر شعر کے صوری اور معنوی عیوب دور کردیے ہیں۔ اور شعر کو صحیح معنی میں شعر بنادیا ہے۔

فرحت قادری کا شعر ہے

عشق بے پرواہ کیے، سارے حوصلے پامال ہیں
اب جنون شوق کی موجوں میں طغیانی کہاں

ابر احسنی کی اصلاح ہے

عشق بدقسمت کے سارے حوصلے پامال ہیں
تم نہیں تو شوق کی موجوں میں طغیانی کہاں

ابر صاحب نے توجیہہ میں لکھا ہے کہ عشق بے پروا نہیں ہوتا۔ یہ صفت حسن کی ہے ابر صاحب نے ایک اور نکتہ یہ اٹھایا کہ شعر میں محض دعوی ہے، دلیل نہیں [2] «تم نہیں تو» کے ٹکڑے نے دلیل فراہم کردی۔ اب اس کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ محبوب سامنے (یا پاس) نہیں اس لیے شوق کی موجوں میں طغیانی نہیں ہے

۱ میری اصلاحیں (حصہ اول) ص ۱۲۰
۲ میری اصلاحیں (حصہ دوم) ص ۱۴۲

اور بدقسمت عشق کے سارے حوصلے پامال ہیں محبوب کے سامنے نہ ہونے اور شوق کی موجوں میں طغیانی نہ ہونے سے عشق کی بدقسمتی اور اس کے حوصلوں کی پامالی کا راز سمجھ میں آتا ہے

شہود عالم آفاقی کا شعر ہے

اٹھتی ہے ہوک دل میں جلن اک جگر میں ہے
تم کیا گئے حیات بھی زیر و زبر میں ہے

ابرا حسنی کی اصلاح ہے

اٹھتی ہے ہوک دل میں جلن سی جگر میں ہے
تم کیا گئے حیات قضا کے اثر میں ہے

ابرا حسنی نے توجیہہ میں لکھا کہ (۱) مصرع اولیٰ میں اک حشو ہے۔[۱] اک کی جگہ سی بنانے سے واقعی یہ عیب دور ہوگیا اور مصرع میں پہلے سے زیادہ روانی بھی پیدا ہوگئی ہے انہوں نے مصرع ثانی کے بارے میں لکھا کہ «زیر و زبر میں ہے» غلط زبان ہے اس ٹکڑے کو نکال کر «قضا کے اثر میں ہے» لکھا اس سے لسانی غلطی بھی دور ہوگئی اور شعر معنوی اعتبار سے بھی بلند ہوگیا۔ مفہوم یہ ہے کہ محبوب کے جانے کے بعد دل میں ہوک سی اٹھتی ہے اور جگر میں جلن سی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہماری زندگی قضا کے اثر میں آگئی ہے۔ ہجر کے لمحات کی تکلیف کو قضا کی تکلیف قرار دینا جذبے کی شدت کا مظہر ہے۔

ذاکر عثمانی راوبری کا شعر ہے

وہ پھول سے چہرے پر جب زلف سی لہرائی
گلشن کی بہاروں پر اے دوست گھٹا چھائی

ابرا حسنی کی اصلاح ہے

---

۱ میری اصلاحیں (حصہ دوم) ص ۱۵۵

جب پھول سے چہرے پر زلف آپ کی لہرائی
گلشن کی بہاروں پر گھنگھور گھٹا چھائی

اسرا حسی گوری نے توجیہہ میں لکھا کہ (۱) مصرع اولی میں «وہ» اور «سی» دونوں الفاظ حشو (۲) اے دوست کا مخاطبہ بھی خوشگوار نہیں۔[1] اس میں شک نہیں کہ اسر صاحب کی توجیہہ صحیح ہے۔ اصلاح سے نہ صرف یہ کہ صوری اقسام دور ہوگئے ہیں۔ بلکہ شعر میں روانی اور سلاست بھی پیدا ہوگئی ہے۔ اے دوست کی جگہ «آپ کی» نے لے کر شعر کے حسن کو بڑھا دیا ہے۔ دونوں مصرعے باہم مربوط اور چست ہوگئے ہیں۔

کیلاش چندر نار کا شعر ہے

حسن گلشن کو چاہنے والو　جوں دل سے بہار آتی ہے

اسرا حسی کی اصلاح ہے

حسن گلشن سنوارنے والو　جوں دل سے بہار آتی ہے

اسرا حسی صاحب نے توجیہہ میں لکھا کہ حسن گلشن کے چاہنے والوں کو یہ جتانا کہ جوں دل سے بہار آتی ہے، بے جوڑ سی بات ہے۔ اس کے علاوہ دونوں مصرعوں میں ربط و تعلق کی کمی بھی ہے[2] «کو چاہنے والو» کی جگہ «سنوارنے والو» رکھنے سے یہ عیب دور ہوگیا ہے۔ «سنوارنے والو» کہنے میں لہجے میں طنز کا عنصر پیدا ہوگیا۔ جس سے شعر کی بلاغت میں اضافہ ہوا ہے اس کے علاوہ مصرع اولی میں، گلشن کے بعد «کو» حشو ملیح تھا۔ اصلاح سے یہ عیب بھی جاتا رہا

اسرا حسی نے جو اصلاحیں اپنے شاگردوں کے کلام پر دی ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریات پر قائم رہے۔ اور انہیں کی روشنی میں اصلاح سخن کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان اصلاحوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اصلاح الفاظ و اسلوب ہی نہیں کی بلکہ اصلاح خیال و افکار بھی کی ہے۔

۱　میری اصلاحیں (حصہ اول)　ص ۱۷۷

۲　میری اصلاحیں (حصہ اول)　ص ۱۸۴ - ۱۸۵

اس تجزیے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

(۱) اساتذہ فن نے اپنے تنقیدی نظریات کی بنیاد ایک طرف عربی و فارسی شعریات پر رکھی ہے اور دوسری طرف اپنے شعری سفر میں اردو زبان اور اس کے شعری مزاج کا خاص خیال رکھا ہے چنانچہ عروضی اور فنی مسائل کے سلسلے میں انھوں نے رفتہ رفتہ قاعدہ سازی کی ہے۔ انھوں نے غلطیوں کے عرفان کے بعد، انکے سد باب کے لئے عروضی، لسانی اور فنی اصول وضع کیے ہیں اور ان پر اساتذۂ فن کی کثیر تعداد نے عمل کیا ہے ان اصولوں سے انحراف کرنے والوں کو ایوان شاعری میں سند اعتبار حاصل نہیں

(۲) سیماب اکبر آبادی نے اساتذۂ قدیم و جدید کی اصلاحوں کو معرض بحث میں لاکر اصلاح سخن کی روایت کو نئے تنقیدی مزاج سے آشنا کیا ہے۔ جس سے اردو شاعری میں شخصیت پرستی کے رجحان پر ضرب لگی ہے اور اصول پسندی کی فضا عام ہوتی ہے اگرچہ اعتراض اور رد اعتراض اور جوابی اعتراض کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا۔ مگر وہ ساری چیزیں بکھری ہوتی تھیں۔ سیماب اکبر آبادی نے اس میدان میں ایک شعوری اقدام کیا ہے۔ اسکو پہلی مربوط کوشش کہا جاسکتا ہے۔ لیکن سیماب کے محاکمے اور اصلاحوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے اور بعض جگہ اساتذۂ فن کے متفقہ اصولوں سے انحراف کرکے اپنے ذوق سلیم یا کسی اور جذبے کے تحت اظہار خیال کیا ہے

(۳) ابرا حسنی گنوری نے اساتذہ کی اصلاحوں نیز سیماب کی تنقیدوں اور اصلاحوں پر از سر نو غور کرکے اس نے کو تیز سے تیز تر کیا ہے، جس کا آغاز سیماب اکبر آبادی نے کیا تھا ابرا حسنی گنوری نے اپنے ان تنقیدی اصولوں پر جامعیت سے بحث کی ہے، جو اساتذۂ فن نے مرتب کیے ہیں اس لیے انھوں نے اپنی بحثوں اور تنقیدوں کو زیادہ اصولی اور تجزیاتی بنایا ہے جن کے اثر سے سیماب اکبر آبادی نے اپنے اعتراضات کو واپس لیا ہے اور اپنی رائے میں ترمیم کی ہے۔ بقول ابرا حسنی

"یہ تبدیلیاں تین قسم کی ہیں۔ اول توجیہہ کی عبارت جو گستاخانہ تھی، اس میں ترمیم کی گئی۔ دوسرے توجیہ میں اعتراضیہ لہجے کو تعریف میں بدل دیا۔ سوم اپنے شاگردوں کی اصلاحیں تبدیل کردیں"[1]

اس بات سے ایک طرف اگر یہ ظاہر ہے کہ ابر صاحب کی تنقیدیں بڑی حد تک برمحل تھیں، تو دوسری طرف یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سیماب صاحب ایک وسیع القلب شاعر اور فنکار تھے، جنھوں نے بعض صحیح تنقیدوں کو قبول کیا۔

(۴) ابر صاحب نے سیماب کی اصلاحوں پر جو اصلاحیں دی ہیں اور توجیہات پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کے پس پشت اگرچہ بعض غیر ادبی رجحانات کارفرما ہیں (سیماب نے بھی ایسے ہی رجحانات کے تحت اساتذۂ فن کی اصلاحوں پر اصلاحیں دی تھیں) پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابرا حسنی کا رویہ ادبی اور فنی ہے۔ انھوں نے اپنی تنقیدوں میں بعض اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ اساتذۂ فن کے قائدوں پر عمل کیا ہے۔ اور انہیں کی بنیاد پر اصلاح پر اصلاح دی ہے۔ جس سے ہئیت اور معنویت دونوں کے معائب و محاسن زیر بحث آئے ہیں۔ ابرا حسنی کی اصلاحوں میں چابک دستی اور فنکاری نظر آتی ہے۔ اور ان کی توجیہات کا انداز بھی علمی ہے

(۵) ابر صاحب نے اپنے شاگردوں کے کلام پر جو اصلاحیں دی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے انھوں نے اپنے تنقیدی، فنی، لسانی اور عروضی نظریات پر سختی سے عمل کیا ہے۔ انھوں نے اصلاح کے عمل میں ایک طرف زبان اور اسلوب پر توجہ کی ہے اور دوسری طرف خیال اور افکار کی اصلاح بھی کی ہے۔ ان کی نگاہ بہت دور رس ہے۔ جو دور تک صوری اور معنوی نقائص کا احاطہ کرتی ہیں ان کا فنکارانہ شعور بہت بیدار ہے، جو دور تک شاہ راہ فن پر روشنی بکھیرتا ہے۔ دراصل ابرا حسنی گنوری ایک ایسی شخصیت ہیں، جنھیں ایک دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ ابھی تک اصلاح سخن کی روایت پر تحقیقی کام نہیں ہوا ہے اس لیے ابرا حسنی کی ادبی، فنی، لسانی، عروضی اور شعری خدمات بھی پوری طرح روشنی میں نہیں آسکی ہیں۔

---

۱ اصلاح الاصلاح ص ۱۲۶/۳

• • •

پروفیسر کلیم سہسرامی
صدر شعبۂ السنہ، راجشاہی یونیورسٹی
راجشاہی - بنگلادیش

«دیوان ہاشم»

بنگلا دیش میں خصوصاً ڈھاکہ یونیورسٹی کا کتب خانہ قلمی نسخوں کے لئے بہت اہم ہے، یہاں تصوف سے متعلق اب تک جتنے قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں ویسے تو مختصر سے بہت سارے منظوم نسخے میری نظر سے گزرے ہیں لیکن «دیوان ہاشم» واحد نسخہ ہے جس کی ضخامت کافی ہے اور ہر طرح مکمل کہا جاسکتا ہے، اس دیوان کا یہ نسخہ دنیا کے قدیم ترین نسخوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، یہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی ملکیت ہے اور قلمی نسخوں کی فہرست میں اس کا نمبر (۲۸۶) ہے، اس کے دو اور نسخوں کا پتا انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطہ نمبر (۲۸۹۸) اور روسی مستشرق ایوانوف کی فہرست مخطوطات کے نمبر (۷۴۷) سے چلتا ہے، نسخۂ زیر بحث کے آغاز و اختتام پر بعض مہریں لگی ہوئی ہیں، جن میں ایک مہر کی تاریخ ۱۰۸۳ ھ - ۱۶۷۲ع درج ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ انڈیا آفس لائبریری کے نسخے (مکتوبہ ۱۰۸۷ ھ - ۱۶۷۶ ع) سے چار سال پہلے تحریر کیا گیا، لیکن ایوانوف نے جس نسخے کا تذکرہ کیا ہے اس پر سنہ کتابت (۱۰۶۶ ھ - ۱۶ ع) درج ہے، یعنی ایوانوف سے کوئی اکیس سال بعد ترتیب دیا گیا گویا ایوانوف اور انڈیا آفس لائبریری کے نسخوں کی درمیانی مدت میں یہ نسخہ لکھا گیا ہے، یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس نسخے پر کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے،

اس نسخے میں کل ۱۹۸ ورق یعنی ۳۹۶ صفحے ہیں، دیدہ زیب نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے، سرخ و سیاہ جدولیں بنی ہوئی ہیں، بعض جگہ کرم خوردہ لیکن مرمت شدہ ہے شاعر کے حالات کی تفصیل اس میں نہیں ملتی، البتہ اس کا نام یوں درج ہے «خواجہ محمد ہاشم ابن محمد قاسم الکشمی البدخشانی برہان پوری

اس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ شاعر کا تعلق «بدخشان» سے تھا ، اور یہ خاندان وہاں سے ہجرت کرکے «برہان پور» (ہند) میں سکونت پذیر ہوگیا تھا ، اس امر کا داخلی ثبوت خود اس کے ان شعر سے ملتا ہے ۔

زنقش آن صنم برگشت ہاشم ، بر سر مویم
بہندوستان ندانم تاکجا بتخانہ خواہم شد

بہرکیف ، دیوان سے شاعر کے ایک بھائی محمد اسحاق کا بھی پتا چلتا ہے جس کی وفات پر اس نے مرثیے لکھے ہیں ۔ موجودہ نسخے کے شروع میں شاعر کی تاریخ وفات کا جو قطعہ درج ہے اس پر «بیکار عاصی» کے دستخط ہیں ، اور اس ۱۰۴۳ھ یعنی ١٦٣٣ع نکلتے ہیں ۔ قطعہ ملاحظہ ہو :

آن قطب زمانہ خواجہ ہاشم در کشور ملک خورمی شد
تاریخ وصال گفت ہاتف گو ، فرد رسول ہاشمی شد

ایک اسپر نگر کے خیال میں خواجہ ہاشم ۱۰۵٦ھ مطابق ١٦٤٦ع میں زندہ تھے ۔

دیوان کی ورق گردانی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو مختلف اصناف سخن پر عبور تھا ، آغاز دیوان میں اس نے پیر طریقت خواجہ بہاء اللہ نقشبندی ، سلطان الانبیا وغیرہ کی منقبت میں قصیدے لکھے ہیں ، اور حضرت شیخ احمد فاروقی (مجدد الف ثانی) کے روحانی شجرے کی تفصیل پیش کی ہے ، اس کے بعد ترجیع بند اور ایک ساقی نامہ مسمّٰی بہ «سبعہ سیارہ مرغان آتشخوار» ہے ۔ اور سبعہ سیارہ کی تفصیل اختر اول سے اختر ہفتم تک درج ہے ۔ اس کے بعد غزلیات کا حصہ شروع ہوتا ہے ، پھر رباعیات و فردیات اور تاریخی قطعات ہیں ، حصۂ غزلیات کا آغاز ، اس غزل سے ہوتا ہے جس کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

بسمل دلہا بود ، بسم اللہ عنوان ما مایۂ دیوانگی ، موی سر دیوان ما
ہست ہر سطری زما ، ابروی معشوق سخن گوشۂ ابرو ، اشارتہای بی پایان ما

ہر کہ دید آن خندۂ پنہاں، بمکہای دگر ــ یا مد از راز بہمت و قصــۂ پنہان ما
رشح کاگ ماست ہاشم، سیل ودولہا پرکاہ ــ کافر از مومن ندانند، موجۂ طوفان ما

اس امر کی وضاحت بیجا نہ ہوگی کہ خواجہ ہاشم کو سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھی، اور اپنے پیر طریقت حضرت مجدد الف ثانی سے انتہائی عقیدت کی بنا پر «مکتوبات احمد فاروقی» (مجدد الف ثانی) کے عنوان سے ان کے مکتوبات کی تیسری جلد تدوین کی ہے، اور ان کی حیات سے متعلق «زبدۃ المقامات و برکات احمدیہ» کے نام سے ایک دوسری کتاب بھی ترتیب دی ہے. اس سلسلۂ بیعت کا اثر ان پر اس قدر گہرا اور پختہ ہے کہ سارا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے. اپنے پیر طریقت کی تاریخ وفات اس طرح نظم کی ہے.

تا عیسی جانہا نشد، از عالم پاک ــ دلہا شدہ، چون پیرہن یوسف چاک
چون رفت سوی روضۂ پاک بہشت ــ تاریخ وصال او بگو «روضۂ پاک»

بہار و باغ عرفاں، ابر رحمت ــ کزین گلشن، بہ تعجیل صبا رفت
مگر صبح قیامت، سر بر آورد ــ کہ از مشکوۃ دیں، شمع ہدیٰ رفت
چو شاہ اولیائی عہد خود، بود ــ خرد گفتا کہ «شاہ اولیا رفت»

«دیوان ہاشم» میں خصوصی طور پر غزلیات و رباعیات کے حصے جاندار اور قابل توجہ ہیں، شاعر کی کہنہ مشقی، قدرت کلام اور زبان و بیان پر اس کے عبور کا یہ عالم ہے کہ کوئی شعر کہیں سے پڑھیئے، ہر جگہ کلام میں یکسانی، رنگ میں پختگی اور زبان و بیان میں شگفتگی پائی جاتی ہے، شاعر نے بعض اشعار میں متبذل عربی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں لیکن اس خوبصورتی اور چابک دستی سے نبھایا ہے کہ کلام بوجھل نہیں ہوپاتا اور اس کی روانی میں فرق نہیں آتا بطور مثال چند الفاظ درج کئے جاتے ہیں: تعجیل، رشح، مستور، سبعہ، اربعین، درۃ التاج، سواد اعظم وغیرہ.

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ شاعر نقشبندی طریقۂ تصوف سے منسلک ہی نہیں

بلکہ غایت درجہ ضعف بھی رکھتا ہے اور عبادت و ریاضت میں چالیس سال گزارنے کے باوجود بھی مطمئن نہ تھا، وہ خود کہتا ہے :

چل سال رفت و رہ تحقیقت نیافتیم
زین اربعین نتیجۂ طاعت نیافتیم
بس ار بسان آہ، شکیتم قلب خویش
خوشتر ز درد، ہیچ غنیمت نیافتیم

ہاشم کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عارفانہ و صوفیانہ خصوصیات کا حامل ہے، اس میں معرفت و حقیقت اور طریقت و شریعت کے مسایل بھی ہیں۔ جذب و کیف اور درد و عشق کی باتیں بھی ہیں، کفر جنوں، آتش ایمن سینۂ صد پارہ، دل دیوانہ، سرگذشت عشق، دیدۂ بےخواب، شکست دل، صہبائے فنا، داؤد عشق، خوشتر ز درد، آب تیغ، آب زندگانی اور عمر جاودانی جیسی ترکیبیں بھی نظر سے گزرتی ہیں جن سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پرواز خیال کا مرکز ایک ہی ذات اور اس کے فکر و نظر کا محور معرفت و حقیقت ہی سے عبارت ہے، اس پر ایسی والہانہ کیفیت طاری رہتی ہے کہ شاعر خود کہہ اٹھتا ہے :

جہاں در خواب خرگوش است، ہاشم پاک دامن است
ز عشق سر زبان آوردۂ، افسانۂ خود را

ایک غزل کے مقطع میں شاعر نے یہ دعوہ کیا ہے کہ اس کا دیوان سراپا دفتر اسرار محبت ہے، میرے خیال میں «دیوان ہاشم» کا قاری اسے تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا، پوری غزل بعد میں پیش کی جائیگی، ابھی صرف مقطع سنئے ٠

دیوان تو ای ہاشم دیوانہ چہ باشد
سر تا بقدم، دفتر اسرار محبت

شاعر نے اپنے آپ کو ایک جگہ فارسی شعر و ادب کے عارف و صوفی حضرت فرید الدین عطار اور دوسری جگہ عربی زبان کے شاعر لبید سے مماثلت

ومشابہت دی ہے ، اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑتا ہوں کہ یہ محض تعلی ہے یا حقیقت
خواجہ ہاشم کی زبان میں یہ ادعا پیش کیا جاتا ہے ۔

در سخن ہاشم فرید الدین عطاری ولی   از در و بامت ، شمیم طبلۂ عطار کو

بعد از ہزار ہاشم ، اندر عجم لبید است   پیش از ہزار اگر بود ، اندر عرب لبیدی

ایک اور مقطعے میں شاعر نے اپنی غزل کے متعلق یہ اظہار خیال کیا ہے :

زُبُہ سپہر و رِدہ عقل ، برتر آمدہ عشق
زہاشم این غزل پر ھنر ، ز تحفہ بری

اب «دیوان ہاشم» سے چند منتخب غزلیں پیش کی جاتی ہیں :

(۱)

چنان دیوانہ می خواہم ، دل فرزانۂ خود را
که اندر خانۂ خود می نیابم ، خانۂ خود را
ز ہر مو صد زبان رونید و راز دل نشد روشن
مگر از شمع پرسم ، قصــۂ پروانۂ خودرا
بہر در چون گدایان ، از مراد دل سخن گفتم
هریعار آشنا نشنا ختم ، بیگانــۂ خودرا
بجز داغی تو ، گنجی نیست ، در گنجینۂ سینہ
بسی ز آماج ، ناخن کافتم ، ویرانــۂ خودرا
تو بد عہدی و من بدمست ، در عشق و دل شاعر
تو پردم شکنی پیمـان و من پیمانـۂ خودرا
جہان درخواب خرگوش است ، ہاشم پاک دمن است
زمستی بســر زبـان آوردۂ افسانــۂ خــود را

(۲)

مجروح شود گـردلـت ، از خـار محبت   گـرد دُن پر موی تـو ، گلـــزار محبت

تاسیم نریزی و ســر شکی نـه متـاتی | بـرگـــر ســبری سـود ز بـازار محبت
از نقطهٔ خالی که بر آن صفحهٔ سمین است | ســر گشـــته دلی آمـــده پـرکار محبت
دانم که محت به کسی بمست خـریـدار | امـاں بجهـاں کیست، حـــریـدار محبت
کشتم همه از سوز جگر داغ که رویـد | چون باغ بـرابیــم، گل از بـار محبت
در کهـر حـون، آتش ایمن شده مستور | ســر رشتـــهٔ شمع آمـــده ز نار محبت

دیوان تو ای ہاشم دیوانه چه باشـد
سر تا به قـدم دفـــتر اسرار محبت

(۳)

سینهٔ صـد پاره دارم، گرچه دلقم پاره نیست
جملگی چشمم و لیکن رخصت نظـاره نیست
عشق فتح اندر، شکست کار پنهاں کرده است
چارهٔ این غـم ندانـد، ہر کـه او بیچاره نیست
یک دل و یک دوست باشد، صد کتاب این سخن
گفتمت صد بار بشنو، زندگی صد پاره نیست
دیـده بکـــشوده گردون، از پئ شمع رخت
این که می بپی تو ہر شب، این مه و استاره نیست
ہمت بیت آمـــد، غزلهـای تو ہـاشم بیشتر
مر ترا این سبعه، کم از سبعهٔ سیاره نیست

(۴)

خیال کنج می بندم، مگر ویرانه خواہم شد | پری در خواب می بینم، مگر دیوانه خواہم شد
در آغاز حدیث من، خرد را خواب می آید | بمانا از شب موی کسی افسانه خواہم شد
کنون حرفی که می گویم، زباں بر خویش می پیچید | بدان ماند کزین پس، از سخن بیگانه خواہم شد
رنقش آن صنم برگشت ہاشم، ہر سر مویم | به ہندوستان ندانم تا کجا بتخانه خواہم شد

(۵)

ما زبس عقل، این دل دیوانه، پیده کرده ایم
سوی صحـــرا از متـاع خـانه پیدا کرده ایم

سرگذشت سرگذشتن عشق می گوید به گوش
دیـــدۂ بےحواب ازین افسانه پیدا کرده ایم

چاکہا افگنـــده ایم ار آه دل، سرلخت دل
گیسوی آشفتگی راشانه پیـــدا کـــرده ایم

در قفس، ای مرغ دل، فارغ نشین خوشتر باغ
کت ز اشک ماب، آب و دانه پیدا کرده ایم

دید طاعت را سی پیمان چو دل شکسته ایم
تا به صحبانی ها، پیمانـــه پیدا کرده ایم

ار شکست دل رسیـــد باشم، سخحائی درست
این گرامی کنج، ار ویرانه پیـــدا کـــرده ایم

(٦)

چهل سال رفت دراه بحقیقت بیا فتیم ربن ارمعـــین نتیجـــۂ طاعت نیا فتیم
در عـــمر نوح شیوۂ طفلی رما نرفت لقمان شـــدیم و بمض طمعیت نیا فتیم
دیدم مخلد وبس قرن را مگریه گفت ایحا فـــراغ گوشـــۂ عزلت نیا فتیم
داؤد عشق، دست بمصراب رد و گفت بـه ربن کلیـــد قفـل شریعت نیا فتیم
بس ار سال آه شکیستم قـــلب خویش خـوشـــتر ز درد ہیچ غنیمت نیا فتیم

(۷)

آب تیـغ، آب زنـــدگانی من مـرگ من، عمـر حاودانی من
آه دل، برگ تن، بحاک افگند چـــد از صرصر خرانی من
ســـر ماریک آن میان نیافت حاک بر فرق نکتـــه دانی من
اولین حرف عشق، انیست که نیست در ہمـــه کائنات ثـانی من
باشما کی مدل فتد سروکار
طی شود دوســـتر زمانی من

رباعی ایک مشکل فن ہے جس میں شعراء کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی

اور نہ ہر شاعر فنی طور پر اس سے دامن بچاکر کامیابی سے ہم‌کنار ہوسکتا ہے ، لیکن خواجہ ہاشم کی رباعیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو بلاتامل کہا جاسکتا ہے کہ شاعر نے رباعی کے تمام لوازم کو بطور احسن برتا ہے اور جہاں تک مواد و ہئیت ، زبان و اسلوب کا تعلق ہے کہیں بھی عجز بیان کا اظہار نہیں ہوتا. اس اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شاعر کو اس صنفِ سخن پر پوری گرفت اور فنی مہارت حاصل ہے ، غزلیات کی طرح شاعر نے رباعیات میں بھی کچھ خاص ترکیبیں استعمال کی ہیں جن سے اس کے مخصوص مزاج مذاق و ماحول کا پتا چلتا ہے . مثلاً مرہم جاں ، دل سوختہ ، کشت کار ، خم بادہ ، نقش تن ، دود آہ اور سایۂ امید وغیرہ .

رباعیات میں بھی ، غـــزلیات کی طرح بڑی یکسانی و روانی اور ہم آہنگی و ہمواری پائی جاتی ہے ، عارفانہ سپردگی اور دل گداختہ کی دھیمی آنچ کا احساس ہوتا ہے ، جذب وکیف کا عالم ، تصوف کی چاشنی اور شـــراب معرفت کی سرمستی و سرشاری رباعیات کے مرکزی موضوعات ہیں ، چند رُباعیوں کا انتخاب پیش کیاجاتا ہے ، لیجئے کام و دہن اور ذوق سخن کی آزمائش ہے :

(۱)

ای سرو بسجـــدہ نحل بالای ترا ؛ سر تا پای جہاں ، ســـراپای ترا
در قدرت برکمال حق ، شبہ نماند زانـــدام کہ نمود ذات والای ترا

(۲)

پیری بسر افگـــندۂ کمون سایہ مرا جز موی سپید ، نیست پیرایہ مرا
شد صرف ہوس عمر گرا مایہ مرا ای دہر نجوان کو دک صد سالہ مرا

(۳)

ای دوست رخی بہجر کیشان بنمــا وز لب نمکی بسینہ پریشــاں بنمــا
سر رشتـــۂ جمعیت دل می طلبسم یک تار ازان زلف پریشــاں بنمــا

(۴)

ای مرہم جاں ، این ہمہ آزاد چرا وی گل ز تو بربائی جگر خار چرا
ای آبحیــات کشتن خلق از چـــہ دی مہ ر تو روز ما ، شب تار چرا

(۵)

حون گشت ز مخموری من جان شراب   یکداحت ز گری شمع مستی خواب
زان سانکه چراغها ز روغن سوزد   ز آب مژه ام سوخت دل شعلهٔ تاب

(۶)

رمـــزی بشوز نو بهاران شباب   هدسیهت کر و برق سرد رسم شباب
سر گشته نم در و بحر سو چو صبا   با جامهٔ آسمـان و با چشم سحاب

(۷)

شمع شب غم، شمار کاشانهٔ تست   در کعبه ردم، قبلهٔ من خانهٔ تست
درس که دل سوخته دیوانهٔ تست   پروانهٔ آن شوم که پروانـــهٔ تست

(۸)

ای بر دوجهان قافلـــهٔ سودایت   سر رشتهٔ کار، موی عنـــبر سایت
معراج تو آنکه پاپی بر سر عرش   معراج من آنکـــه سر نم بر پایت

(۹)

ای آنکه خیالات پی تاراج من است   خاک قدم تو دُرّه التّاج من است
معراج تو صد بار بایـــزد گفتی   حرف شب معراج تو معراج من است

(۱۰)

جانان سمت قبله بجز سوی تو نیست   محراب جهانیان جز ابروی تو نیست
دیـــدم ســـواد اعظم ملّتها   سوگند بموی تو که حرموی تو نیست

(۱۱)

بسیار مگو که یک سخن بسیار است   وین خرقه بهل که دلق تن بسیار است
زنهار بصد قافلـــه این ره می پوی   کین باد به‌سخت و راهزن بسیار است

(۱۲)

چون دل نکشود، روزگار تو عبث نشگفت چو این غنچه بهار تو عبث
گردانهٔ اشکی بسزمین نفشانی ای خواجه تمام کشت کار تو عبث

(۱۳)

ای دل که مصاحب نکو خوی من سرگشتهٔ عالمی و در کوی من
شد عمر، بکار من نبرد راهی ما آن که شب و روز به پهلوی می

خواجه ہاشم کے یہاں بعض بعض جگہ عمر خیام کے رنگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا اپنا مخصوص رنگ کلام قائم و دائم رہتا ہے۔ اس رنگ کی چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔

(۱۴)

چون جان من از قید تن آزاده شود وز نقش تنم، لوح جہان ساده شود
گر یک رگ دل نجاک بکشاده شود ہر ذرهٔ خاک من، خم باده شود

(۱۵)

دل دو تہه دود آه، جاوید غنود چون خسته که زیر سایهٔ بید غنود
افسانهٔ عمر رفت و صبحی ند مید ما ما که ازین فسانه خورشید غنود

(۱۶)

زخم دل ما نجون بہا خند رسد جام می ما، بتو بہا خنده رسد
لعلت (به) شتاب، عمر پاخنده زند چون غنچه که باد صبا خنده رسد

دیوان ہاشم کی آخری رباعی یہ ہے:

(۱۷)

یاں وامق و فرہاد ستودن تاکی سرخوش بحدیث غیر بودن تاکی
بردار سراز خواب که شب آخر شد افسانه شنودن و غنودن تاکی

• •

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ڈائرکٹر، انجمن اسلام
اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی (۱)

سرسید کے تعلیمی افکار و اعمال

کسی نے سچ کہا ہے کہ اچھے دوست کی مثال ایک گھنے درخت سی ہے جب تک وہ سرسبز ہے اس کے سایہ میں راحت ملتی ہے اور اس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہوجاتا ہے تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے یہ مثل سرسید (۱۸۱۷ع - ۱۸۹۸ع) پر بھی ہر اعتبار سے صادق آتی ہے۔

سرسید احمد خان انیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے آخری ایام بھی دیکھے اور برطانوی اقتدار کی تدریجی ترقی کے آثار بھی ایسے تاریک بلکہ المناک دور میں سرسید کی رفاقت اور قیادت خصوصی طور پر مسلمانوں کیلئے ایک نعمت سے کم نہ تھی جب تک وہ حیات رہے سرسید اپنے ہاتھ، پاؤں، اور زبان کے ساتھ جان مال اور قلم سے مسلمانان ہند کی بالخصوص رہنمائی کرتے رہے اور جب اللہ کو پیارے ہوگئے تو مسلمان انکے احسانات کو یاد کرکے انکے اعمال اور افکار کا نہ صرف اعتراف کرنے لگے بلکہ ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے عمل پیرا ہونے کی آج بھی کوشش کررہے ہیں اگرچہ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرسید کی ہمہ جہت شخصیت متنازع فیہ رہی ہے۔[1] مذہبی عقائد کے لحاظ سے علمائے وقت نے انہیں کافر اور ملحد کہا تو روشن خیال گروہ نے انہیں مجتہد العصر اور امام زماں کے ناموں سے یاد کیا، تعلیمی افکار کے اعتبار سے دقیانوسی طبقہ نے انہیں اسلام کش اور انگریزوں کا پٹھو قرار دیا تو ماہرین تعلیم نے انہیں زمانہ شناس اور دور اندیش کہا اور سیاسی اعمال کی حیثیت سے ناسمجھ لوگوں نے انہیں ابن الوقت کہا تو دانشوروں نے انہیں مصلح قوم کا خطاب دیا۔ بہر کیف

---

۱ ماہنامہ الحق ۔ جولائی ۱۹۸۴ع (اکوڑہ خٹک، ضلع پشاور - پاکستان) ص ۵

انکی خدمات مذہبی ہوں یا تعلیمی ، قومی ہوں یا سیاسی اگر انہیں مصلحتِ وقت تصور کریں اور حالات حاضرہ کے پیش نظر ان کا جائزہ لیں تو پتہ چلیگا کہ ان کے احسانات قوم پر اسقدر ہیں کہ وہ کسی صورت میں بھی ان سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔

سن ستاون کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں اور انگریزوں دونوں کا جو خون خرابہ ہوا اور دونوں قومیں جس زبوں حالی کا شکار ہوئیں اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا یہ سچ ہے کہ انگریز حاکم بن چکے تھے اور ہندوستانی محکوم لیکن مسلم قوم سب سے زیادہ معتوب سمجھی جاتی تھی اس لئے کہ انگریزوں نے حکومت ان ہی سے چھین لی تھی۔ ایسے آڑے وقت میں سرسید احمد خاں نے مسیحا بن کر سب سے پہلے اسباب بغاوت ہند اور بعد میں لائل محمڈنز آف انڈیا لکھکر بڑی خوبی کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی صفائی پیش کی اور مسلمانوں کو بری الذمہ قرار دیا اور واضح طور پر افسران حکومت کی غلط کاریوں کی نشاندہی کی اور حکومت برطانیہ کو غدر کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس طرح انہوں نے ان نازک حالات میں اپنی حق گوئی ، بےباکی اور جرأت مندی کا ثبوت دیکر مسلمانوں کی زبوں حالی کا علاج تعلیم و تربیت میں بتلایا اور بقول ڈاکٹر محمد اقبال ع

اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا

مسلم معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے لئے سرسید نے جو منصوبے بنائے اور جو تحریک شروع کی اس میں تعلیم و تربیت کو بنیادی اہمیت دی بلکہ اپنے زمانے کے ہندوستان کی سماجی ، سیاسی اور معاشی خرابیوں کا واحد علاج تعلیم ہی کو قرار دیا۔ سرسید نے اس بات کی وضاحت کی کہ تعلیم انسان میں زبردست تبدیلی لاتی ہے اور انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارتی ہے۔ سرسید نے بغیر تعلیم کے انسان کی روح کو ایک چتکبرے سنگ مرمر کی چٹان کے مانند بتلایا۔ جب تک سنگتراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا اس کو تراش کر سڈول نہیں بناتا اور پالش سے آراستہ نہیں کرتا اس وقت تک اس کے جوہر اسی میں پوشیدہ رہتے ہیں اور اسکے خوبصورت بیل بوٹے اور خوش نما رنگ روپ ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ وہ کتنا ہی نیک دل ہو جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر

نہیں ہوتا اسوقت تک اسکی ہر خوبی اور اسکا ہر کمال جو اس میں چھپے رہتے ہیں اس کی مسند کے بغیر ظاہر نہیں ہوتیں مسلمانان ہند کی جہالت اور تعصب کو دور کرنے کے لئے تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے سرسید نے فرمایا میں اپنی قوم میں بھی ہزاروں خوبیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، ان میں جرأت مندی اور بے باکی پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں قومی استقلال دیکھتا ہو پر بے ڈھنگا، ان میں صبر و قناعت بھی ہے پر بے موقع، پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی انکی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوجائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لئے کیسی کچھ مفید ہوں [1]

سرسید نے زندگی کو کامیاب بنانے اور صحیح تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لئے اس بات کو بار بار دھرایاکہ انسان یہ فیصلہ کرلے کہ اس کو کیا بننا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اگر وہ بخوبی تصفیہ کرتا ہے اور اپنے تصفیے میں غلطی نہیں کرتا تو اس میں عزم جزم پیدا ہوتا ہے اور اسکو کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ کامیابی کی جڑ اسی فیصلہ میں مضمر ہوتی ہے کہ میں کیا ہونگا اور میں کیا کرونگا۔[2]

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے سرسید کے خیال میں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو جدید علوم و فنون کی فائدہ مند تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی آراستہ کریں اور مذہبی تعلیم کیلئے ذی علم اور ذی فہم اصحاب یکجا جمع ہوں اور بحث و مباحثہ کے بعد وہ ایسا نصاب مرتب کریں جو بلحاظ حالات زمانہ اور بنظر علوم و فنون جدیدہ مطابقت رکھتا ہو اور جو پرانی اور دقیانوسی تعلیم سے مختلف یعنی ترمیم شدہ ہو، ضروریات وقت کے موافق ہو اور جو مذہبی مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو [3]

سرسید مزید فرماتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کا اہتمام حکومت سے کروانا اور خود کچھ نہ کرنا بے حسی اور بے غیرتی کی بات ہے۔ اپنی مذہبی تعلیم کا ہمیں خود انتظا

---

۱ سرسید کے آخری مضامین مرتبہ امام الدین و احمد مخدومی ص ۲۳
۲ مقالات سرسید (پنجم) مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی ص ۱۴۷
۳ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق ص ۱۴۸

کرنا چاہیے کیونکہ مسلمان مذہبی تعلیم کو اپنی تعلیم کا لازمی حصہ قرار دیتے ہیں پس انکا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں تا کہ وہ اپنے بچوں کو دونوں طرح کی تعلیم خاطر خواہ دلاسکیں۔[1]

سرسید کے خیال میں نہ صرف تعلیمی ترقی کی خاطر بلکہ سیاسی، معاشرتی اور مذہبی اعتبار سے بھی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اہالیانِ ھند میں برادرانِ وطن نے اس ضرورت کو محسوس کرلیا اور انگریزی تعلیم حاصل کرکے بہرہ مند ہو رہے ہیں لیکن مسلمان انگریزی سے متنفر نظر آتے ہیں اور انکی یہ نفرت انکی ترقی کے راستے میں مزاحمت بن گئی ہے سرسید نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کی خاطر اور اسے اپنانے کے لئے یہ استدلال پیش کیا کہ حکمران قوم کی زبان سیکھنے میں ہی ترقی ہوتی ہے۔ بنوامیہ اور بنو عباس کے زمانے میں عربی زبان کا رواج تھا، ہندوؤں کے عہد میں سنسکرت براج مان تھی اور مسلمانوں کے دور حکومت میں فارسی کا دور دورہ تھا اور اب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت ہے اس لئے انگریزی زبان ترقی پر ہے۔ لیکن مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں کوتاہی کی ہے جو انکی بڑی غلطی ہے۔[2]

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مسلمان انگریزی زبان سے اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ ان کا بڑا گروہ خصوصاً علمائے وقت انگریزی کی تعلیم کو اسلام کے منافی تصور کرتا ہے سرسید نے اس خیال کی تردید میں کہا کہ اکثر ثقہ لوگ انگریزی پڑھے لکھے طبقے کو بدعقیدہ یا دہریہ کہتے ہیں۔ یہ خام خیالی ہے مگر میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو انگریزی مطلق نہیں جانتے لیکن بدعقیدہ ہیں۔ سرسید نے مزید کہا کہ جو علمائے اسلام یہ کہتے ہیں کہ انگریزی کی تعلیم اور علومِ جدیدہ میں ترقی کرنے میں مسلمانوں کے ایمان میں خلل ہوتا ہے ان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام میں اور دنیاوی عزت میں کوئی تناقض نہیں ہے۔[3]

---

۱ سفر نامۂ پنجاب (تقریر امرتسر) جنوری ۱۸۸۴ع
۲ سرسید کے آخری مضامین ص ۲۶
۳ ایضاً ص ۲۰

سرسید کے مطابق مدارس میں مغربی علوم کو دیسی زبان میں تعلیم دینا مناسب ہے۔ یہاں دیسی زبان سے مراد اردو زبان ہے لیکن اعلیٰ تعلیم کا ہندوستانی زبان کے ذریعے اہتمام کرنا خالی از فائدہ ہے۔ لہذا اعلیٰ تعلیم کو صرف انگریزی میں دینا فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اسی نظریہ کے پیش نظر جب حکومت نے کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کرکے اردو یونیورسٹی قائم کرنا چاہا تو انہوں نے فوراً کنارہ کشی اختیار کرلی کیونکہ ان کے خیال میں اس اقدام سے مسلمان انگریزی زبان سے محروم ہوجائینگے اور یہ محرومی اعلیٰ تعلیم اور علمی ترقی کے لئے نقصان رساں ہوگی۔

سرسید کی تعلیم سے دلچسپی اگرچہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوئی لیکن ان کے افکار و خیالات آہستہ آہستہ پروان چڑھنے لگے اور برسوں کے بعد ان کے تعلیمی افکار نے تعلیمی تحریک کی شکل اختیار کرلی

سرسید نے تعلیمی تحریک کا آغاز عملی طور پر ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی ذریعہ تعلیم مدرسہ سے کیا اور یہ فارسی مدرسہ تحصیلی اسکول کے قائم ہوتے ہی اس کا حصہ بنایا گیا۔ غازی پور کے اس مدرسہ میں اردو فارسی عربی کے ساتھ سنسکرت کی تعلیم کا بھی اہتمام تھا۔ یہ آج بھی وکٹوریہ اسکول کے نام سے جاری ہے اور تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر ایک مختصر کتابچہ تصنیف کیا اور اس میں حکومت کے قائم کئے ہوئے مشرقی زبانوں کے مدرسوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ یہ مدرسے وقت کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں اور یہ رائے دی کہ حکومت ان اسکولوں کا ذریعۂ تعلیم انگریزی کردے تاکہ ہندوستانی بچے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بچے کی ذہنی تربیت اور ترقی کیلئے مادری زبان زیادہ مفید ہوتی ہے۔

سرسید نے خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنے کی خاطر ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں عوام کے تعاون اور چندے سے ایک مدرسہ قائم کیا اور پرزور اپیل کی کہ اہلِ ہند تعلیم کا اہتمام خود کریں تاکہ وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوجائیں

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام غازی پور میں ۱۸۶۳ء میں عمل میں آیا جو سرسید کی تعلیمی تحریک کا دوسرا سنگِ میل ہے۔ اور غازی پور سے علیگڑھ میں تبادلہ ہوتے ہی انہوں نے اس سوسائٹی کی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۸۶۴ء میں علیگڑھ

میں رکھا اور اس عمارت میں اب طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ جاری ہے۔ اور اس طرح یہ عمارت آج بھی امراضِ انسانی کی دوا کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ادبی اور علمی کتب و رسائل انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرواکر ہندوستانیوں میں نہ صرف انگریزی ادب اور مغربی علوم کا مذاق پیدا کیا جائے بلکہ علمی اور ادبی مضامین پر تقاریر کا اہتمام بھی کیا جائے اور ساتھ ہی ایک اخبار کے ذریعے عوام کو آگاہ کیا جائے حالاتِ حاضرہ سے یہ اخبار اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہو اور اسکے مدیر ہندو، مسلمان اور انگریز تینوں ہوں تاکہ باہمی قومی مغایرت اور مذہبی تعصب آہستہ آہستہ کم ہوجائے اس ہفتہ وار اخبار کا نام علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ رکھا گیا جو ۱۸٦٦ع میں جاری ہوا کچھ عرصے کے بعد یہ اخبار سہ روزہ ہوگیا اس اخبار کا ایک کالم اردو میں اور ایک کالم انگریزی میں ہوا کرتا تھا سرسید کی تعلیمی تحریک کے بڑھاوے میں اس اخبار کی اہمیت اور افادیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔

سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد میں یہ بھی شامل تھا کہ ہندوستان میں کاشتکاری کے مروجہ طریقوں میں تبدیلی لائی جائے تاکہ ایک طرف کاشتکار اور صنعت کار کی معاشی حالت بہتر ہو تو دوسری طرف حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو [1] اور اسی کے پیش نظر مغرب کے ٹیکنکی علوم کو اردو میں منتقل کیا گیا اور بالخصوص رابرٹ اور ٹیسین کی میکانیکس کی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنا دیا اور ہندوستانیوں کو یورپ کے زراعتی اور صنعتی کلوں اور ہتھیاروں کو سمجھنے اور ان کے استعمال کرنے کی تعلیم کا اہتمام ان ترجموں کے ذریعے سے کیا گیا اور ایک کتاب بنام قدیم نظام دیہی ہندوستان میں سرسید نے تالیف کی اسکا ایک نسخہ آج بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے

سرسید نے تعلیمی تحریک کے سلسلے میں وائسرائے ہند کو ایک یاد داشت ۱۸٦۷ع میں پیش کی۔ اس میں ذیل کی باتیں درج تھیں جو وقت کی پکار کے مترادف تھیں :

---

۱ خطوط سرسید (مکتوب بنام محمد حسین آزاد) ص ۲۲

۱ مختلف علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کا دیسی زبانوں میں خاطر خواہ اہتمام کیا جائے۔
۲ امتحانات کا ذریعہ انگریزی کے ساتھ ساتھ دیسی زبانوں میں بھی تسلیم کیا جائے۔
۳ مختلف فیکلٹیوں میں جسطرح کامیاب طالب علموں کو سندات دی جاتی ہیں اسی طرح اردو ذریعہ امتحانات میں شریک ہونیوالے کامیاب طلبہ کو بھی دی جائیں۔
۴ کلکتہ یونیورسٹی میں ایک اردو شعبہ کا انتظام کیا جائے۔
۵ شمالی یا مغربی ہند کی کسی ایک یونیورسٹی کو اردو یونیورسٹی بنایا جائے۔

اس یاد داشت کے پیش نظر جب حکومت نے کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کرکے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو سرسید نے نہ صرف کنارہ کشی اختیار کرلی بلکہ اس فیصلہ کی سخت مخالفت کی حالات کا جائزہ لینے کے بعد حکومت کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنا پڑی۔

ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم پنجاب نے ۱۸۶۸ء میں سرکار پنجاب کو ایک میمورنڈم ارسال کیا جس میں یہ سفارش کی کہ حکومت لاہور میں اردو یونیورسٹی اور دہلی میں دائرۃ الترجمہ قائم کرے اور اگر دونوں صوبوں کے لئے ایک اردو یونیورسٹی قائم کرنا ہے تو اس کا مقام دہلی ہو۔

سرسید نے اعلیٰ پیمانے پر جدید قسم کی درسگاہیں اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لئے انگلستان کے سفر کو ضروری سمجھا تا کہ وہاں کی طرز تعلیم سے وہ واقفیت حاصل کریں اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے درسگاہوں کا منصوبہ بناسکیں۔ آخرکار انھوں نے انگلستان کے سفر کا مصمم ارادہ کرلیا اگرچہ انکی مالی حیثیت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی تاہم محسن الملک نواب سید مہدی علی کے الفاظ میں:

> "جب سید احمد خاں لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادے کو پورا نہ کرسکتا انھوں نے اپنے کتب خانہ کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ انھوں نے بارہا مجھ سے اس بارے میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہوسکتا جب تک میں بذات خود اس اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کرلوں۔"

الغرض یکم اپریل ۱۸٦۹ء کو وہ بنارس سے لندن کے لئے روانہ ہوگئے ۔ اور انہوں نے تمام حالات سفر کو ایک سفر نامہ کی صورت میں تحریر کیا جو تہذیب الاخلاق میں باقاعدہ شائع ہوتا رہا ۔ سرسید نے انگلستان کے طرز تعلیم کو دیکھا ، کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسیٹیوں کا خود جاکر معائنہ کیا اور وہاں کے ماہرین تعلیم سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد ایک تعلیمی منصوبہ بنایا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کارآمد اور مفید ثابت ہوا دوسرے لفظوں میں ایک کالج قائم کرنے کے لئے سرسید نے ایک اسکیم تیار کی اور یہ اسکیم صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو ارسال کی جو حکومت ہند نے بخوشی منظور کرلی اور اینگلو اورینٹل کالج قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور مسلمانوں کے آرا کے پیش نظر علیگڑھ کو مجوزہ کالج کے لئے انتخاب کیا گیا ۔ ایک کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند نے دسمبر ۱۸۷۳ء میں ابتدائی مدرسہ کے قیام کی تجویز پاس کی اور ۱۸۷۵ء میں مخالفت کے باوجود اس مدرسہ کا افتتاح ہوا اور باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی ۔[1]

سرسید نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کی اور اپنی انتھک مساعی ، اپنے فرصت کے اوقات اور اپنی تمام صلاحتیں کالج کے قیام کے لئے وقف کردیں اور ۱۸۷۷ء میں وائسرائے ہند نے اس کالج کا سنگ بنیاد رکھا جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور اردو میں مدرسۃ العلوم تجویز کیا گیا[2]

سرسید کی خواہش کے مطابق مسلمانوں نے متفقہ طور پر کالج کو یونیورسٹی کا روپ دینا منظور کیا ۔ اس تعلیمی ادارے کی بنیاد چھ نکات پر رکھی گئی جن میں سے درج ذیل اہم ہیں ۔

(۱) اس یونیورسٹی کا نظم و نسق مکمل طور پر حکومت کے دخل سے آزاد رہیگا ۔

(۲) یہ یونیورسٹی خودکفیل ہوگی اور کسی خارجی امداد کو قبول نہیں کریگی نیز اپنی سالانہ آمدنی خود پیدا کریگی ۔

---

۱ حیات جاوید از الطاف حسین حالی ص ۲۴۰

۲ ایضاً ص ۲۴۵

(۳) اس یونیورسٹی کی اقامتی زندگی اور اس کے ضابطوں کی پابندی اتنی ہی لازمی ہوگی جتنی حصولِ تعلیم ضروری اور لازمی ہوگی۔

سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے جنوری ۱۸۷۷ء کے شمارے میں یہ تحریر فرمایا کہ اس کالج کی بنیاد ایسے اسباب پر رکھی گئی ہے جو ماضی میں اس ملک کو پہلے کبھی دیکھنے کے لئے نصیب نہیں ہوئی۔ یہ کالج نے تعصبی اور ترقی کے اصول پر مبنی ہے جس کی نظیر مشرق کی تاریخ میں ہنوز نہیں پائی جاتی ہے۔

سرسید کی رائے میں یہ کالج جدید و قدیم خیالات کا سنگم بنے اور مشرق و مغرب کے درمیان پل کا کام دے۔ دوسرے مشرقی علوم کے احیاء کے ساتھ مذہبی تعلیم کی اشاعت کا اہتمام کرے اور تیسرے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے نمونے پر یہ کالج خصوصی توجہ دے اور ان میں نمایاں فرق صرف یہ ہو کہ جہاں انگریزی یونیورسٹیوں میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں اس کالج میں اسلامیات کی تعلیم دی جائے۔ آج یہ کالج مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) کے نام سے موسوم ہے اور یہ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا تعلیمی اور ثقافتی مسلم ادارہ تصور کیاجاتا ہے۔

مدرسۃ العلوم کے قیام کے بعد سرسید نے ایک کل ہند تعلیمی ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس کی اور ۱۸۸۶ء میں انہوں نے نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جو بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم ہوگئی۔ اسکے مقاصد میں مسلمانانِ ہند کے عمل میں اتحاد اور ارادوں میں ہم آہنگی پیدا ہو اور اپنی قومی تعلیم، معاشرتی ترقی اور اقتصادی استحکام کے بارے میں جمع ہوکر تبادلۂ خیال کرسکیں آج یہ کانفرنس مسلمانوں کی علمی اور تعلیمی بلکہ در پردہ تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا محور بن گئی ہے اور سرسید کی وفات حسرت آیات کے بعد بھی یہ کانفرنس روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اسی کانفرنس کی صدائے بازگشت کے طور پر ہندوستان کے مختلف مقامات پر مسلم ادارے قائم ہوئے جن میں انجمن اسلام بمبئی (۱۸۷۵ء)، انجمن حمایت اسلام لاہور (۱۸۸۵ء)، انجمن اسلام جنجیرہ (۱۹۰۷ء) اور اس قبیل کے دیگر تعلیمی ادارے قابل ذکر ہیں

اس ضمن میں ایک اور امر کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید نے تہذیب الاخلاق نامی رسالے کا اجرا کیا جو انگلستان کے ٹیٹلر، اسپیکٹیٹر اور گارجین نامی رسالوں کے طرز پر تھا۔ تہذیب الاخلاق ابن خارن کی کتاب کا نام ہے جو سرسید کو بہت پسند آئی۔ اس رسالے نے جہاں معاشرتی، اصلاحی اور لسانی حیثیت سے زبردست کام کیا ہے وہاں سرسید کے تعلیمی افکار اور اعمال کی اشاعت میں بھی معقول رول ادا کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق تین ادوار میں نکلا۔ پہلا شمارہ ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا اور ۱۸۷۶ء تک نکلتا رہا۔ بعد میں تین سال اور تیسرے دور میں بھی تین سال تک برابر جاری رہا۔ اور آج بھی کوئی پانچ سال سے برابر نکل رہا ہے جس کے لئے سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب قابل مبارکباد ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں نے اگرچہ اپنا تن من دھن سب کچھ مسلمانوں کے لئے وقف کردیا تھا مگر مسلم قوم نے انکے احساسات کو فراموش ہی نہیں کیا بلکہ ان پر غبن کا الزام لگایا جو ان کی موت کا سبب بنا ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

● ● ●

(یہ مقالہ پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر نے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی (بمبئی) کے زیر اہتمام ایک سیمینار منعقدہ اتوار ۱۶ فروری ۱۹۸۶ء بمقام انجمن اسلام جونیر کالج (جنجیرہ مروڈ) پڑھا مہاراشٹر کالج بمبئی کے پرنسپل عبد القدوس منشی صاحب نے صدارت فرمائی اور وزیر مملکت تعلیم، ریاست مہاراشٹر پروفیسر جاوید خان صاحب نے افتتاح کیا۔ دیگر مقالہ نگاروں میں مولانا محمد مستقیم صاحب، پرنسپل فاطمہ ایس صاحبہ اور جناب ابراھیم سندیلکر صاحب قابل ذکر ہیں۔ علی شمسی صاحب نے خیرمقدم کیا اور سمیع بوبیرے صاحب نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔)

ڈاکٹر شیخ فرید
ریسرچ آفیسر
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی - ۱

انجمن اسلام بمبئی اور علی گڑھ

(الف)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بعد، ملک کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ — انجمن اسلام — ہمارا قابل فخر قومی ورثہ ہے۔ یہ ایک ادارہ نہیں ایک تحریک ہے۔

۱۸۷۴ء میں اپنے قیام سے آج تک اس ممتاز ادارہ نے مسلمانوں کی گراں قدر تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں۔ عوام میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص علمی، تہذیبی اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حیات اور اخلاق کے اعلیٰ اور صالح اقدار کی تعلیم و تبلیغ کی ہے۔

۱۸۵۷ء کے «خونین انقلاب» اور «ناکام جنگِ آزادی» کے بعد مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے لئے سرسید احمد خان نے ملک کے گوشے گوشے کا سفر کر کے ان کو تحصیل علم و فن کی ترغیب و تحریص دی۔ عوام و خواص کے سامنے ان کے مختلف مسائل اور حل پیش کئے۔ اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ان میں بیداری کی روح پھونکی۔ اپنے زورِ بازو سے وقت کے طوفان کے دھارے موڑ دیئے۔ اور قوم کی ڈوبتی کشتی کو کنارے لگادیا۔ ان کے فکر و عمل نے قوم کے بے حس افراد کو زندگی کی قدر سکھائی۔

ٹھیک اسی زمانے میں، شمالی ہند سے دور، ملک کے مغربی علاقہ میں بدر الدین طیّب جی نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی۔ اور خواص کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ انھوں نے اپنے مساعی کا سلسلہ بمبئی سے شروع کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی سرگرمیوں میں زبردست

حصہ لیا ہے۔ ہندی ثقافت اور جنگ آزادی کی تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں۔

۲۵ محرم الحرام ۱۲۹۳ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۸۷۶ء روز جمعہ — انجمن اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے عہدیداروں اور اراکین کے نام درج ذیل ہیں

صــــدر	—	قمر الدین طیب جی
نائب صدر	—	ناخدا محمد علی روگھے
خــازن	—	صدر، نائب صدر
پیشکار	—	منشی غلام الدین داوی
		منشی غلام محمد
اراکینِ مجلس	—	(۱) - سید عبد الفتّاح
		(۲) - مولوی ہدایت اللہ
		(۳) - رحمت اللہ محمد سایانی
		(۴) - طیب احمد جی
		(۵) - قاضی برہان الدین[1]

انجمنِ اسلام کے قیام کے متعلق دو قطعاتِ تاریخ ملتے ہیں :

[۱] قطعــــۂ تاریخ

تاسیس انجمن اسلام مبئی[2]

انفـاقِ حـامــــیانِ دینِ حـــق
بـــہرِ بہبودی دلا مــــرغـوب شد
اجتمـاعِ اہلِ اســـلامِ کـــرام
اے مـدرس خوش نکو اسلوب شد
سالِ ہجـــــری از سرِ جہد برنگاہ
انجمنِ اسـلام مبئی خـوب شــد

۱۲۹۳ ھ

---

۱ رپورٹ [انجمن اسلام مبئی کی ۱۲۹۳ ھ ہجریہ مقدسہ کی سالانہ فرد کیفیت] ۱۸۷۵ء ص ۵

۲ ایضاً ص ۱۹

[۲] قطعۂ تاریخ عیسوی

از رہِ تحریکِ احبابِ شفیق — عیسوی تاریخ چوں مطلوب شد
از سرِ آدابِ سالش را طلب — انجمن اسلامیہ مرغوب شد[1]

۱۸۷۴

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کی تین عظیم تنظیمیں ایک ساتھ قائم ہوئیں۔

(ا) انجمن اسلام بمبئی - ۲۱ فروری ۱۸۷۴ع
(ب) مدرسۃ العلوم علی گڑھ - ۲۴ مئی ۱۸۷۵ع
(ج) انڈین نیشنل کانگریس - ۱۸۸۵ع

ان اداروں نے اپنے مقاصد میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ملک برطانوی سامراج سے آزاد ہوگیا مدرسۃ العلوم علی گڑھ ملک کی مایۂ ناز یونیورسٹی بن گئی۔ انجمن اسلام کے مختلف ادارے علم و عمل کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ ان کا فیض جاری ہے دائمی ہے۔

انجمن اسلام کا ماضی شاندار ہے۔ حال روشن ہے اور مستقبل تابناک ہے۔ یہ ہمارا قابل فخر مثالی ورثہ ہے۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی «اس ادارہ کی چار دیواری میں ہماری کامیابی و ناکامی، شور و سکوت اور سود و زیاں کی داستان پوشیدہ ہے۔»

انجمن اسلام کے بانی - بدرالدین طیب جی - بڑے بیدار مغز انسان تھے۔ انہوں نے انجمن کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے انجمن کے مقصد پر یوں روشنی ڈالی تھی

> «اس جزیرۂ معمورہ بمبئی میں یہ مجلس اکابراں موسوم بہ انجمن اسلام بمبئی بغرضِ بہبودی و ترقی خواہی اہلِ اسلام سالِ گذشتہ سے وجود میں آئی۔ جس کا ہونا نہایت لابد و ضرور تھا»[2]

---

۱ ایضاً ص ۱۹ رپورٹ میں طلب کے بجائے ملب لکھا ہوا ہے۔ قطعہ بجنسہ نقل کردیا گیا ہے۔

۲ ایضاً ص ۲

سرسید احمد خاں کے پیشِ نظر یہی مقاصد تھے

۱۲۹۳ھ کے آخر تک جو کاروائیاں عمل میں آئی ہیں انجمن کی سال اول کی رپورٹ میں ان کا مختصر بیان ہے

اہم سرگرمیاں یہ ہیں

(۱) سرسالار جنگ کو انگلینڈ سے واپسی پر سپاس نامہ پیش کیا گیا۔[1]

(ب) مدحت پاشا کو دس ہزار روپے بھیجے گئے۔[۲]

(س) ملکۂ وکٹوریہ کو تہنیت نامہ پیش کیا گیا[۳]

مذکورہ تہنیت نامہ کے سلسلے میں رپورٹ میں مرقوم ہے کہ

"تہنیت نامہ نہایت عمدہ طرز کا منقش و مطلّا کر اور اس کی حفاظت وزینت کے لئے ایک مجلد درج اور صندوقچہ نفیس صندلی و منقش ومزّین بنواکے اس میں رکھ دربار دہلی میں وائسرائے ہند کو بخدمت قیصر ہند ارسال کرنے کے لئے سپرد کیا گیا "[۴]

اس کاغذ پر انجمن کے تمام اراکین کے دستخط نہ تھے۔ اس لئے دستخط کے بعد اسے دوبارہ کلکتہ روانہ کیا گیا۔

ملکہ کو تہنیت پیش کرنے کے سلسلے میں سرسید احمد خان یہ چاہتے تھے کہ انگلستان ایک وفد جائے اس سلسلے میں انہوں نے انجمن اسلام کے سکریٹری کو ایک خط لکھا تھا کہ انجمن کا ایک نمائندہ اس وفد میں شامل ہونا چاہئے[۵]

---

۱ ایضاً ص ۲

۲ ایضاً ص ۲۱

۳ ایضاً ص ۸ [۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو انجمن میں جشن منایا گیا۔ مدرسہ (ہائی اسکول) اور باغ میں چراغاں کیا گیا شعرا نے اردو فارسی میں قصیدے پیش کئے۔ کاروائی انجمن اسلام دفتر اول ص ۱۴۸]

۴ ایضاً ص ۳۵

۵ خط سرسید احمد خاں - ۲۲ مارچ ۱۸۹۷ء

جہاں تک مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب اور صلاح و فلاح کا تعلق ہے ، سرسید اور بدر الدین طیب جی میں کوئی اختلاف نہ تھا ۔ مگر سرسید مسلمانوں کو کانگریس سے علحیدہ رکھنا چاہتے تھے اور بدر الدین طیب جی کا خیال تھا کہ «سیاسی حقوق طلبی» کے لئے کانگریس جیسی جماعت کا ساتھ دینا ضروری ہے ۔

بدر الدین طیب جی کانگریس کے حامی تھے ان کے نزدیک انجمن جیسی جماعت کا مقصد (ا) تحصیل علم و ہنر اور (ب) تہذیب نو سے فائدہ اٹھانا تھا ۔

انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس ۲۷ - ۳۰ دسمبر ۱۸۸۷ع مدراس کے وہ صدر تھے اپنی صدارتی تقریر میں خود کو انہوں نے انجمن کا نمائندہ بتلایا تھا [۱] اور مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی ترغیب دی تھی ۔

جولائی ۱۸۸۸ع کے انجمن اسلام کے ایک جلسہ میں انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی کے اس خط پر غور کیا گیا تھا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ ۱۸۸۸ع دسمبر میں الہ آباد میں ہونے والے جلسہ میں اپنے نمائندے بھیجے

انجمن کے دو جلسوں میں جو (ا) ۲٦ ذیقعدہ ۱۳۰۵ ھ مطابق ۵ اگست ۱۸۸۸ع بروز یک شنبہ اور (ب) ششم ذیحجہ ۱۳۰۵ ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۸۸۸ع چہار شنبہ مذکورہ خط پر گرماگرم بحث ہوئی ۔

دوسرے جلسہ میں بدر الدین طیب جی نے کانگریس میں شرکت کے متعلق ہندوستان کے «عمائدین اہل اسلام» سے اپنی خط و کتابت کی تفصیلات بتلائیں [۲] اس جلسہ میں بدر الدین طیب نے وہ خطوط پڑھکر سنائے جو سرسید احمد خاں ، امیر علی اور نواب مہدی علی نے انجمن کو لکھے تھے ان پر غور کیا گیا ۔

افسوس کہ ۱۹۳۴ع کی «پراسرار آتش زدگی» میں انجمن کا بیشتر مواد اور ذخیرہ تباہ ہوگیا ۔

---

۱ رپورٹ ۸۸-۱۸۸۷ع ص ۵
مدراس کے جلسے کے لئے انجمن نے بدرالدین طیب جی اور عبداللہ میرعلی دھرمسی کو ڈیلیگیٹ مقرر کیا تھا (تیسری رپورٹ انڈین نیشنل کانگریس)
۲ کارروائی جلسہ انجمن اسلام (قلمی) دفتر اول ص ۲۴

اس جلسہ میں بدر الدین طیب جی نے بتلایا کہ کلکتہ کے کانگریس کے دوسرے اجلاس کی صدارت کے لئے بھی ان سے درخواست کی گئی تھی مگر اپنے سفر یورپ اور کاٹھیاوار میں ایک مقدمہ کی مصروفیت کی وجہ سے انھوں نے انکار کردیا.

اُس جلسہ میں انجمن نے کانگریس کے اجلاس میں شرکت کا فیصلہ کیا

سرسید احمد خان نے ہندوستان کی مختلف انجمنوں کے نام خطوط لکھے کہ وہ کانگریس میں شریک نہ ہوں اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن Indian Patriotic Association میں شریک ہوجائیں.[1]

غالباً انجمن کے کسی جلسہ میں اس خط پر غور نہیں کیا گیا یا جلسہ کی وہ کاروائی منضبط نہیں کی گئی

سرسید احمد خان کے کانگریس مخالف رویہ کے سلسلے میں صاحب زادہ آفتاب احمد خان کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا،

۱۱ ذیقعدہ ۱۳۳۵ ھ مطابق ۳۰ اگست ۱۹۱۷ع (پنجشنبہ) کو انجمن نے صاحب موصوف کو ایک «ایٹ ہوم» دیا.[2]

اس جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے صاحبزادہ نے بتلایا کہ ۱۸۹۲ع میں وہ انگلینڈ میں اے او. ہیوم (بانی انڈین نیشنل کانگریس) سے ایک اسٹیج پر ملے انھوں نے سرسید کے کانگریس مخالف رویہ کی سخت شکایت کی اور بتلایا کہ کانگریس کے قیام کا خیال ان کے ذہن میں سرسید کی کتاب «اسباب بغاوتِ ہند» سے آیا. جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ بغاوت کا سبب یہ تھا کہ حکومت میں اس ملک کے لوگوں کی کوئی آواز نہ تھی.

دفتر میں صاحبزادہ موصوف کی تقریر «من و عن» نقل کی گئی ہے.[3] اس کا متعلقہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

---

۱ خط سرسید ۲۲ اگست ۱۸۸۸ع ضمیمہ ۲
۲ کاروائی انجمن اسلام دفتر اول (قلمی) ص ۱۵۲
۳ ایضاً ص ۱۵۱

But although, he did not know English Sir Syed Ahmad was the first in India who realy grasped the true principles of Governament which man should apply to the Governament of India

After the dark days of mutiny Sir Syed told the Governament that the trouble had been due not to any momentary canse, lenk to the fact that the people of this country hid no voice ie the Governament of their own country

The book Sir Syed wrote then plaved a grate part in the historv of of the constitutional movement and contributed to the foundation-stone of self governament in this countrv (1)

اس موقع پر صاحب زادہ موصوف نے یہ وضاحت کردی کہ یہ ان کی رائے نہیں ہے بلکہ اے او ہیوم کی رائے ہے جو انڈین نیشنل کانگریس کے بانی ہیں۔ اور ان کی رائے کافی وقیع ہے

انہوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ مسٹر ہیوم کے الفاظ بھول نہیں سکتے۔ مسٹر ہیوم کی شکایت کو انہوں نے یوں بیان کیا۔

Hume complained to me and told me about the attitude of Sir Syed Mr Hume tols me that the thing which put forward the idea of starting some such movement had been put in Sir Syed's well-known book

(The cause of the mutinv) and yet added Mr Hume Sir Syed was opposing the congress (2) The courses of the mutinv

۱۸۶۱ع کے قانون کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل مقرر نے کہا کہ:
"یہ قانون اسی کتاب کی بازگشت ہے اور علی گڑھ اسکول ملک کی ترقی اور آزادی کا کبھی مخالف نہیں رہا ہے۔"[۳]

(ب)

سر سید احمد میموریل فنڈ:

سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ پر بڑا نازک وقت آگیا۔ کالج زبردست مالی پریشانیوں میں گھر گیا۔ نواب محسن الملک نے بدرالدین طیب جی کو اس سلسلے میں ایک خط لکھا۔

---

۱ ایضاً ص ۱۵۲ ۲ ایضاً ۱۵۳ ۳ ایضاً ص ۱۵۴

۱۵ ربیع الاول ۱۳۱۶ ھ مطابق ۵ اگست ۱۸۹۸ع کے جلسے میں بدرالدین طیب جی نے یہ خط پیش کیا اور سرسید احمد میموریل فنڈ کو اپیل کی اور ان الفاظ میں سرسید کو خراج عقیدت پیش کیا

«میں بخوبی جانتا ہوں کہ یہ کام جو انہوں نے کیا وہ بہت نیک ہے۔ اور قابل اس کے ہے کہ ان کی مدد کی جائے لیکن بمبئی میں چندہ جمع کرنا بہت مشکل کام ہے جو لوگ اس کو کرچکے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کیا دقتیں پیش آتی ہیں۔

سرسید احمد خان حقیقت میں ایک لائق آدمی تھے انہوں نے مسلمانوں کی بہبودگی کے لئے بڑی کوششیں کیں۔

اگر کوئی ایسا آدمی انتقال کرجائے تو ان کی یادگار قائم رکھنا ہمارا فرض ہے »[1]

تمام مشکلات کے باوجود انجمن کے اراکین نے چندہ کی فراہمی میں زبردست کوششیں کیں ان مساعی کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں ہے

۹ مارچ ۱۹۱۱ع کو انجمن ہال میں ایک جلسہ ہوا اس میں سر آغا خان نے محمڈن یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پر پُراثر تقریر کی۔ ان کی تقریر سے پہلے سر ابراھیم رحمت اللہ نے چندہ دھندگاں کی فہرست پیش کی بمبئی میں تین لاکھ چھہتر[76] ہزار روپیہ جمع ہوا۔ اس میں وہ رقم بھی شامل تھی جو قاسم علی جیراج بھائی نے دی تھی۔

اولاً انہوں نے ساٹھ ہزار روپیہ دیا تھا بعد میں اس مجلس میں اسے بڑھا کر ایک لاکھ پچیس ہزار کردیا

تقریر میں سر آغا خان نے یونیورسٹی کی اھمیت بیان کی مسلمانوں سے ایک کروڑ روپیہ کی اپیل کی۔ اس عظیم تحریک میں شرکت کی درخواست کی اور بتلایا کہ

---

۱ کاروائی انجمن اسلام دفتر اول (قلمی) ص ۶۲

Their ideal must always be to have a University worthy of Islam and their past

They could have a really good Unsversity unless they had one crore of rupees behind them.

It is a matter of life and death for Islam. (1)

سر کریم بھائی نے آغا خاں کا شکریہ ادا کیا۔ سر کریم بھائی نے ذاتی طور پر سرسید احمد خاں کو روپیہ دیا تھا

یہاں یہ بیان موجب دلچسپی ہوگا کہ "شہزادہ ویلز[2] کی آمد کی یادگار میں علی گڑھ میں سائنس کلاسیں جاری کرنے کے لئے" سر آغا خاں نے پینتیس ہزار روپیہ دیا تھا۔

اس حسن سلوک کے اعتراف میں انجمن اسلام نے اپنے ایک خصوصی اجلاس ۲۴ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۰۶ء کو سر آغا خاں کو انجمن کا سرپرست مقرر کیا تھا اس موقع پر قاضی کبیر الدین صاحب نے کہا تھا کہ

"جناب خاں صاحب کے نہ صرف مسلمانان بمبئی بلکہ کل ہندوستان کے اہل اسلام زیر احسان ہیں"[3]

(ج)

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس :

انجمن اسلام کی دعوت پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ۱۹۰۳ء میں بمبئی میں ہوا

یہ جلسہ ۱۸۹۵ء میں ہونے والا تھا ۱۸ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۹ ستمبر ۱۸۹۴ء کے جلسے میں عبداللہ مہر علی دھرمسی نے بتلایا کہ ۱۸۹۵ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں طلب کیا جائے۔ ان کو دعوت دی

۱ ایضاً ص ۳۷۴ ۲ ایضاً ۲۷۲ ۳ ایضاً ص ۲۷۲

جائے اور یہ اجلاس انجمن کی «سرپرستی» میں ہو۔ نواب محسن الملک سے پیشکار موصوف نے درخواست کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں موصوف نے ایجوکیشنل کانفرس کے فوائد بیان کئے۔[۱]

۱۸ فروری ۱۸۹۵ع اور ۲۳ مارچ ۱۸۹۵ع کے اپنے خطوط میں سرسید احمد نے ان مشکلات اور سوالات کا ذکر کیا تھا جو بمبئی میں کانفرنس کے سلسلے پیش آرہی تھیں[۲]

کانفرس کے سلسلے میں سرسید احمد نے انجمن اسلام کے سکریٹری فتح علی کو تار سے مطلع کیا تھا ان کو ۲۷ دسمبر ۱۸۹۴ع کے کانفرس کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی

غرض ۱۹۰۳ع میں یہ کانفرس بمبئی میں ہوئی اور بدر الدین طیب جی نے تعلیم نسواں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مندوبین نے کنڈر گارٹن طریقۂ تعلیم دیکھا اور بے حد پسند کیا۔ کانفرس کی کامیابی کا اندازہ ۳ مارچ ۱۹۰۴ع کے کانفرس کے ریزولیشن سے کیا جاسکتا ہے۔ جو ضمیمہ (۶) میں درج ہے

(د)

نواب محسن الملک اور انجمن اسلام

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ع کو سرسیّد کی وفات کے بعد نواب محسن الملک کو سرسیّد کا جانشین منتخب کیا گیا کالج پچاس ہزار کا مقروض ہوگیا تھا۔ بڑا نازک وقت تھا انھوں نے پانچ چھ سال کے مختصر عرصہ میں تقریباً چھ لاکھ روپیہ چندہ جمع کرلیا تھا ان کے زمانے میں پرنس آف ویلز بھی کالج کے معائنہ کے لئے آئے تھے انھوں نے کالج میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی اسے زندگی اور اعلیٰ مقام عطا کیا[۳]

بقول شبلی «وہ سرسید کے برابر کے شریک تھے» وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کے معتمد تھے وہ انجمن اسلام کے ممبر بھی تھے ان کو انجمن کے مقاصد اور

---

۱ کاروائی انجمن اسلام دفتر اول (قلمی) ص ۱۱۶

۲ ضمیمے ۳، ۴، ۵ ملاحظہ کیجئے ۳ موج کوثر ص ۱۰۶

اور مشاغل سے گہری دلچسپی تھی جب بھی وہ بمبئی میں ہوتے انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

۲۰ دسمبر ۱۸۸۶ ع کے جلسے میں فتح علی (پیشکار) نے کہا تھا کہ :-

"اگر انجمن کی طرف سے ایک اخبار جاری ہو تو نہایت عمدہ بات ہوگی اور ہمیشہ اطلاع خاص و عام کے انجمن کی کاروائی اس میں شائع ہواکرے گی"[1]

نواب صاحب کے مشورے سے بدرالدین طیب جی اور انجمن کے دیگر حضرات نے ایک سنڈیکیٹ قائم کیا تھا اردو گجراتی اور انگریزی میں تین ہفتہ وار اخبار نکالے تھے عرصہ سے انجمن کی خواہش تھی کہ ایک اخبار نکالا جائے[2]

اردو اخبار کا نام مراۃالاخبار تھا اور گجراتی انگریزی اخبارات کا نام Monitor تھا مراۃالاخبار میں تعلیم نسواں پر مستقل مضامین رہتے تھے
اس انجمن اسلام اسکول اور کمیٹی کی کاروائیاں بھی شامل کی جاتی تھی

۱۲ شوال ۱۳۱۱ ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۹۴ ع کے جلسے میں نواب صاحب موصوف کی شرکت کا پہلا اندراج ملتا ہے اس جلسے میں بدرالدین طیب جی نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ سفر کے فوائد و نقصانات پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں

نواب صاحب نے انجمن کے جلسوں میں کئی تقریریں کیں مگر صرف یہی تقریر بکمال و تمام محفوظ ہے

نواب صاحب نے ناسازی طبع کے باوجود ایک طویل تقریر کی اپنی تقریر میں انھوں نے آیات قرآنی اور احادیث کے حوالے دئیے مسدس حالی کے بند پیش کئے انھوں نے مسلم ممالک کی پستی اور زبوں حالی کا ذکر کیا یورپ میں مسلم آثار اور اسپین میں مسلمانوں کے سات سو سالہ دور حکومت کا تذکرہ کیا لندن اور پیرس میں محفوظ قلمی نوادرات کا ذکر کیا۔[3]

---

۱ کاروائی انجمن اسلام دفتر اوّل ص ۳ (پہلا اجلاس)
۲ رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۹ ع بمبئی میں اردو (ڈاکٹر میمونہ دلوی) ص ۲۷۸
۳ تفصیل کے لئے دیکھئے بمبئی میں اردو ص ۲۷۸

یہ طویل پر مغز تقریر دعائیہ کلمات پر ختم کی۔ تقریر کے آخر میں ان سے درخواست کی گئی کہ وہ انجمن کے باقاعدہ ممبر بن جائیں [1]

انجمن کے دوسرے جلسے منعقدہ ۷ صفرالمظفر ۱۳۱۵ ھ مطابق ۱۸ جولائی ۱۸۹۷ ع میں نواب صاحب کی شرکت کا ذکر ملتا ہے اس جلسہ میں انھوں نے پونا کے اخباروں کے مسلم دشمن رویّہ پر تنقید کی اور کہا کہ :-

«میں چالیس برس سے اخباروں کو دیکھتا ہوں اور ان کے مضامین غور سے پڑھتا رہتا ہوں اور قریب قریب پچاس اخبار میری نظر سے گزرتے ہیں »

«میں نہایت فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اکثر اردو اخبار اپنے فرائض منصبی سمجھتے ہیں اور اپنے فرض کو کمال لیاقت اور خوبی سے ادا کرتے ہیں [2]»

۱۶ ربیــــع الاول ۱۳۱۸ ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۰۰ ع کے جلسے میں محسن الملک نے انجمن کے کاموں کو سراہا اور پیشکاروں کو مبارک باد دی۔

«بطور پیشکار علی گڑھ مجھے جدا جدا مقاموں پر مختلف لوگوں سے میل جول کا اتفاق ہوا ہے اور مجھے پورا پورا تجربہ حاصل ہوا ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی کس حالت میں پڑے ہوئے ہیں ۔[3]»

---

۱ کاروائی انجمن اسلام (قلمی) دفتر اوّل ص ۱۰۲ تا ص ۱۱۲

انجمن اسلام میں دستور تھا ۔ کہ ہر جلسہ میں کوئی رکن یا عہدیدار کسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا ۔

نواب محسن الملک کی تقریر کے پہلے سفر کے فوائد پر بدرالدین طیّب جی ۲ فروری ۱۸۹۴ ع کے جلسہ میں تقریر کرچکے تھے ۔

« ترقی و بہبودی مسلمانان» پر مولوی ہدایت اللہ نے سب سے پہلے تقریر کی تھی

۲ ایضاً ص ۱۲

۳ ایضاً ص ۱۵۴

انھوں نے مسلمانوں کی ابتر حالت اور بے حسی کا ماتم کیا

۱۲ ربیع الاول ۱۳۲۴ ھ مطابق ۷ مئی ۱۹۰۶ ع کے جلسے میں نواب صاحب نے سیرت پر تقریر کی اور ۸ جمادی الاخر ۱۳۲۴ ھ مطابق ۳۱ جولائی ۱۹۰۶ ع کے جلسہ میں اسلامی ترقی پر ایک بصیرت افروز اور نصیحت آموز بیان دیا [۱]

۱۹ اگست ۱۹۱۶ ع کے جلسہ میں نواب صاحب کی طبعیت ناساز تھی ان کی درخواست پر مولانا شبلی نے اسلام کی اخلاقی تعلیم پر تقریر کی [۲]

"ملک کا محسن" "مسلمانوں کا ہم خوار" ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ ع کو اس دار فانی سے اٹھ گیا [۳]

۱۱ ذیقعدہ ۱۳۲۵ ھ مطابق ۱۷ دسمبر ۱۹۰۷ ع کے جلسے میں بیرسٹر قاضی کبیرالدین نے نواب صاحب کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کیا اور ان کے انتقال کو مسلمانوں کا نقصان عظیم بتلایا [۴]

انجمن اسلام اور علی گڑھ کے روابط کی داستان طویل اور دلچسپ ہے اس کی چند جھلکیاں سطور بالا میں پیش کی گئی ہیں

ضمیمہ (۱)

بنام عبداللہ مہر علی دہرمسی

بعالی خدمت جناب عبداللہ مہر علی دہرمسی، پیشکار انجمن اسلامیہ بمبئی

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۹ مارچ پہونچا ممنون عنایت ہوا میں تمام کاغذات متعلق تہنیت سلطنت شصت سالہ قیصر ہند آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں میری اسپیچ جو سنٹرل ہال مدرسۃ العلوم میں ہوئی ہے وہ بھی اون کاغذات

---

۱ ایضاً ص ۱۷۵
۲ ایضاً ص ۲۸۷ ص ۲۹۱
۳ ایضاً ص ۲۹۱
۴ موج کوثر
۵ کاروائی انجمن اسلام دفتر اول ص ۳۰۱

میں شامل ہے اوس کے ملاحظہ سے بخوبی واضح ہوگا کہ کیا کیا امور ہم لوگوں نے اس تہنیت کے ادا کرنے میں تجویز کئے ہیں سب سے بڑا اور مشکل امر یہ ہے کی یہ خواہش ہم لوگوں کی ہے مسلمانوں کی طرف سے چند مسلمان ڈیلیگیٹ ایڈریس تہنیت لے کر لندن جائیں اور مسلمانوں کی طرف سے ایڈریس پیش کریں اور یہ بھی تجویز ہوئی ہے کہ جو ڈیلیگیٹ جائے وہ اپنا خرچ آپ ادا کرے پس اول آپ بذریعہ ٹیلیگرام مطلع فرمادیں کے بمبئی میں ایک یا دو ایسے مسلمان ڈیلیگیٹ مل سکتے ہیں اور وہ اپنے خرچ سے لندن میں جانا قبول کرسکتے ہیں یا نہیں میں ۲۶ مارچ کو بعد دوپہر واسطے شمول اجلاس جنرل کمیٹی تہنیت کے دہلی جاونگا اور ۲۷-۲۸ مارچ تک دہلی میں رہونگا اگر آپ کو ان تاریخوں میں ٹیلیگرام بھیجنا ہو تو بذریعہ سلطان احمد خان اسکویر بارسٹر ایٹ لا کے دہلی میں بھیجئے گا میرے پاس پہنچ پہنچ جائے گا مسودہ ایڈریس جو یہاں مرتب ہوا ہے وہ بھی ان کاغذات میں ملفوف ہے۔ جو فقرہ کے اوس ایڈریس میں کاٹ دیا گیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ بعض دوستوں نے کہا کہ یہ فقرہ ایڈریس میں تحریر ہونا نامناسب ہے اسلئے کہ جو ڈیلیگیٹ ایڈریس لے کر جاوینگے ان کی بابت جداگانہ تحریرات بذریعہ افسران ہندوستان ہوگی اور بعد منظوری گورنمنٹ آف انڈیا جس طرح پر وہ مناسب سمجھے گی، ڈیلیگیٹوں کے جانے کی اطلاع لندن میں اون افسران کو کرے گی جس کو کرنی مناسب ہوگی

ٹیلیگرام میں یہ بھی لکھئے گا کہ صوبہ بمبئی کے لوگوں کو جنرل کمیٹی میں شریک ہونا منظور ہے تاکہ میں وہ کاغذات جن پر مسلمانوں کے دستخط ہونگے آپ کے پاس واسطے دستخط کے بھیج دوں۔ آپ کی عنایت کا دوبارہ شکر ادا کرتا ہوں ۔ والسلام

علی گڑھ پریسیڈنٹ جنرل کمیٹی تہنیت جشن شصت سالہ قیصر ہند

۲۲ مارچ ۱۸۹۷ء

ضمیمہ (۲)

تمام ہندوستانی اسلامی انجمنوں کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی الف بین قلوب المومنین وقال لنبیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام، لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم و لکن اللہ الف بینھم انہ عزیز حکیم، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

اما بعد خاکسار سید احمد تعالی خدمت اراکین ... ..

عرض پرداز ہے کہ ان دنوں میں جو ہنگامہ بنگالی صاحبوں اور ان کے مقلد چند مسلمان صاحبوں نے انڈین نیشنل کانگریس کا برپا کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس پر ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے بخوبی غور کرلیا ہے اور بہت سی انجمن ہائے اسلامی میں اس پر بحث ہوچکی ہے اور سواد اعظم اہل اسلام نے قریباً کل انجمن ہائے اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ مذکورہ بالا کانگریس کے مقاصد کل ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور اسلئے مسلمانوں کو اس میں شریک ہونا نہیں چاہئیے۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ آپکی انجمن کی بھی یہی رائے ہے میں نے بھی اس پر بخوبی غور کیا ہے۔ اور بعد غور کامل میری یہ رائے قرار پائی ہے کہ کانگریس مذکورہ کے مقاصد ملک کے لیے، ملک کے امن کے لئے، ملک کی ترقی کے لئے، گورنمنٹ کے لئے اور خاص مسلمانوں کے لئے، ان کی موجودہ حالت میں اور نیز آئندہ کو بھی گو کہ ان کی تعلیم میں کتنی ہی ترقی ہوجاوے، نہایت درجہ مضر ہے اگر بالفرض محال کانگریس مذکورہ کے مقاصد پورے ہوجاویں تو ہندوستان میں مسلمانوں کا حال یہودیوں سے بھی جن کی نسبت خدا نے فرمایا ہے وضُربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ، بہت زیادہ بدتر ہوجاوے گا۔
اعوذ باللہ من غضب اللہ، میں ہر ایک مسلمان کا فرض سمجھتا ہوں کہ کانگرس مذکورہ میں شریک نہ ہو اور اپنی بیزاری اس سے ظاہر کرے۔

حامیانِ کانگرس نے یہ ایک غلط اور ناواجب طریقہ اختیار کیا ہے کہ انگلستان کے لوگوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان کی کل قومیں ہندو مسلم مذکورہ بالا کانگرس میں شریک ہیں اس لئے ہمارا فرض ہے ہم انگلستان کے لوگوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو جتلادیں کہ حامیان کانگرس کا وہ بیان غلط ہے۔ بلکہ عموماً مسلمان اس میں شریک نہیں ہیں۔

بجز ان معدودے چند کے جو سوادِ اعظم مسلمان سے علیحدہ ہوگئے ہیں ۔

اس مقصد کے حاصل ہونے کو بصلاح خیرخواہان و دانایان قوم ایک انجمن قائم کی گئی ہے اور « انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن » اس کا نام رکھا گیا ہے جس کا اشتہار اس نیاز نامہ کے ساتھ شامل ہے ۔

یہ امر قرین مصلحت ہے کہ جن انجمن ہائے اسلامی کی رائے متفقہ یا کثرت رائے یہ قرار پائی ہو کہ کانگریس مذکورہ بالا مسلمانوں کے حق میں مضر ہے اور مسلمانوں کو اس میں شریک ہونا نہیں چاہئے ۔ اس انجمن کا نام ہم اپنی ایسوسی ایشن کی اس فہرست میں مندرج کریں جس میں بتایا جاوے گا کہ کس قدر انجمن ہائے اسلامی ہمارے ساتھ متفق ہیں اور انڈین نیشنل کانگریس کے برخلاف ہیں ۔

واضح ہو کہ ان انجمنوں کو جو اس طرح شریک ہوں گی ، کوئی چندہ دینا نہ ہوگا کیونکہ چندہ لینے کا قاعدہ ان خاص اشخاص سے تعلق رکھتا ہے جو بذات خاص ہماری ایسوسی ایشن میں شریک ہوں گے ، نہ کسی انجمن سے جس کا نام شامل کرنا صرف اس مقصد سے ہے تاکہ معلوم ہو وہ انجمن ہمارے رائے سے متفق ہے

پس یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرا یہ عریضہ اجلاس میں پیش کیا جاوے اور درصورتیکہ ممبران انجمن اس رائے کو پسند فرماویں تو اجازت دی جاوے کہ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن آپ کی انجمن کا نام اپنی اس فہرست میں مندرج کرے جس میں انجمن ہائے اسلامی متفقہ کا نام مندرج ہوگا ۔

یہ فہرست ہمراہ ان پمفلٹوں کے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن انگلستان میں بھیجنے کے لئے تیار کر رہی ہے اور وقتاً فوقتاً بھیجتی رہے گی ، بھیجی جاوے گی ۔ والسلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ ۔

مقام نینی تال
مورخہ ۲۱ اگست ۱۸۸۸ع

راقم خاکسار
سید احمد
ممبر پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

واضح ہو کہ میرا قیام نینی تال میں ۱۵ اکتوبر تک ہوگا اس کے بعد علی گڑھ چلا جاؤں گا ۔

ضمیمہ (۳)

تار

سکریٹری انجمن اسلام بمبئی

بخدمت صاحب سکریٹری انجمن اسلام بمبئی

میں آپ کی چھٹی غور کے واسطے مینجنگ کمیٹی کے روبرو پیش کروں گا۔ اگر آپ براہ مہربانی تشریف لا کر یہاں ۲۷ ماہ حال کو کانفرنس میں شریک ہوں اور کاروائی کو ملاحظہ فرماویں تو آپ اس بات کا اندراہ کرسکیں گے کہ آیا سال آئندہ میں بمبئی میں کانفرنس کا منعقد کرنا مصلحت ہوگا یا نہیں۔

۲۱ دسمبر ۱۸۹۴ ع

یہ جواب سرسید نے بذریعہ تار برقی بھیجا تھا

انجمن اسلام بمبئی کے سکریٹری فتح علی شیخ احمد تھے۔

ضمیمہ (۴)

بخدمت صاحب سکریٹری انجمن اسلام بمبئی

ڈیر سر۔ آپ کی چھٹی نمبر ۱۲۲، مورخہ ۱۳ ماہ حال، میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میں بالفعل چند روز کے واسطے پنجاب جانے والا ہوں اور وہاں سے واپس آجانے کے بعد نہایت خوشی سے آپ کو بمبئی میں کانفرنس منعقد ہونے کی نسبت اطلاع دوں گا۔

آپ کا دوست

علی گڑھ۔		دستخط سید احمد

۱۸ فروری ۱۸۹۵ع		آنریری سکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

ضمیمہ (۵)

مخدومی و مکرمی ممبران مینجنگ کمیٹی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

پچھلے اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں، میں نے انجمن اسلام بمبئی کے اسسٹنٹ سکریٹری کی ایک چٹھی پیش کی تھی جس میں یہ لکھا تھا کہ انجمن اسلام بمبئی کی یہ خواہش ہے کہ کانفرنس کا ایک سالانہ جلسہ بمبئی میں انجمن کے اہتمام سے منعقد کیا جاوے اگر ممکن ہو تو یہ جلسہ ماہ دسمبر ۱۸۹۵ع میں منعقد ہو۔

اس چٹھی کے پیش ہونے پر تمام ممبران موجودہ نے اس بات کو پسند کیا تھا کہ آئندہ اجلاس کانفرنس کا بمبئی میں ہو

چونکہ مجھ کو، جو آنریری سکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ہوں، ڈاکٹر نے لمبا سفر اختیار کرنے سے جو بذریعہ ریل کے طے ہو، امتناع کیا ہے اور کہا ہے کہ درصورت صحت مزاج بھی لمبا سفر ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ اس سبب سے میں بحیثیت سکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، بمبئی میں، اگر وہاں اجلاس ہو تو نہیں جاسکے گا۔ غرض یہ کہ میں نے بمبئی جانے سے قطعی انکار کر دیا ہے۔ اور یہ چاہا ہے کہ بمبئی کے اجلاس کے لئے کوئی دوسرا سکریٹری تجویز کیا جاوے یا بمبئی کا اجلاس ملتوی ہو۔

نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خان بہادر نے جو زیادہ تر اس بات کے خواہاں تھے کہ انجمن اسلام بمبئی کی درخواست منظور کی جاوے اور بمبئی میں اجلاس ہو، مجھ کو ایک خط لکھا ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ بلحاظ میری طبیعت اور ڈاکٹروں کی رائے کے میرا بمبئی کا سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور یہ بھی وہ لکھتے ہیں کہ کوئی دوسرا شخص بطور سکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے کام کرنا منظور نہیں کرے گا اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر میں بمبئی جاؤں تو انجمن اسلام بمبئی بھی کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہونا پسند نہیں کرے گی اور اخیر کو وہ تجویز کرتے ہیں کہ بمجبوری بمبئی جانے کا خیال چھوڑ دیا جاوے اور کسی دوسری جگہ جو قریب علی گڑھ کے ہو، اس سال کے لئے کانفرنس کا اجلاس تجویز کیا جاوے۔ مجھکو امید ہے کہ آپ بھی نواب محسن الملک کی رائے سے اتفاق کریں گے اور مجھ کو اجازت دیں گے کہ میں اس بات کو مشتہر کردوں کہ بمبئی میں کانفرنس کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا ہے۔

علاوہ اس کے اپنی مہربانی سے کوئی دوسرا مقام تجویز فرمائیں گے جہاں اجلاس کانفرنس بہ آرام ہوسکے امید کہ اس نیاز نامہ کے جواب سے جلد تر مطلع فرمادیں، والسلام

علی گڑھ
۲۲ مارچ ۱۸۹۴ع

سید احمد
سکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

ضمیمہ (٦)

دفتر سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس

علی گڑھ - ۷ مارچ ۱۹۰۴ع

ریزولیشن کی نقل

کانفرنس منعقدہ - ۳ مارچ ۱۹۰۴ع

یہ اجلاس اپنا ضروری فرض سمجھتا ہے کہ جس مہربانی اور قومی محبت کے خیال سے انجمن اسلام بمبئی نے کانفرنس کو پچھلی دسمبر میں اپنے یہاں مدعو کیا اور جس عمدگی اور خوبی سے لوکل کمیٹی کانفرنس بمبئی نے ایسے مشکل کام کو نہایت کامیابی کے ساتھ پورا کیا۔ اس کا دلی شکریہ ادا کرے اور اس اجلاس کی طرف سے تمام اراکین اسلام بمبئی اور تمام ممبران لوکل کمیٹی کانفرنس کی خدمت میں التماس کیا جائے کہ سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی دل سے ان کی اس مہربانی کا جو نہ صرف سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کو دعوت دے کر ممنون کیا ہے۔ بلکہ کل قوم کو بمبئی میں دعوت دے کر باہمی اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کا راستہ نکالا ہے اور قومی ترقی اور بہبودی کے لئے مل کر کام کرنے کا ذریعہ پیدا کیا ہے۔ دل سے شکر گذار ہے اور جو کوشش اور محنت ایسے مشکل اور بڑے کام کو انجام دینے اور بہت سی مشکلات اور مزاحمتوں کو دور کرنے میں لوکل کمیٹی نے گوارا کی ہے اس کی یہ اجلاس دل سے قدر کرتا ہے اور جو غیر متوقعہ کامیابی لوکل کمیٹی کو اپنی مساعی جمیلہ میں حاصل ہوئی۔ اس پر اپنی اعلیٰ درجہ کی مسرت اور خوشی کا اظہار کرتا ہے اور یہ اجلاس خوب سمجھتا ہے کہ بمبئی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہونا اور پھر اس کا نہایت خیر و خوبی سے انجام پانا کچھ آسان کام نہ تھا یہ صرف انجمن اسلام بمبئی اور لوکل کمیٹی کانفرنس بمبئی کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ تھا اور یہ اجلاس امید کرتا ہے کہ جیسا معزز پریسیڈنٹ کانفرنس بمبئی جناب آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی نے ایڈریس میں کہا ہے کہ بمبئی کی کانفرنس سے آئندہ عمدہ نتیجے پیدا ہوں گے اور قومی اغراض میں انجمن اسلام اور یہ کانفرنس ہمیشہ ایک دوسرے کی معین و مددگار رہیگی۔

یہ اجلاس جناب جسٹس بدرالدین طیب جی صاحب پرسیڈینٹ کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہے کہ جناب ممدوح کیے باوجود عدیم الفرصتی اور ناسازی مزاج کے اس بڑے مشکل قومی کام کو اپنے ذمہ لیا اور پرسیڈینسی قبول فرماکر اپنی ہمدردی اور تعلیمی معاملات سے دل چسپی کا کامل ثبوت دیا اور یہ اجلاس امید کرتا ہے کہ آئندہ بحیثیت ہونے پرسیڈینٹ انجمن اسلام بمبئی کے جناب ممدوح ہمیشہ ان کاموں میں جو قومی بہبودی اور قومی ترقی کے لئے یہ کانفرنس کرتی رہیگی مدد دیتی اور اظہار ہمدردی فرماتی رہیگی

یہ اجلاس جناب قاضی کبیرالدین سکریٹری لوکل کمیٹی کا خاص طور پر دل سے شکریہ ادا کرتا ہے اور اسے خوب معلوم ہے کہ بہت بڑا حصہ اس کانفرنس کی کامیابی کا صرف نتیجہ قاضی صاحب ممدوح کی ان قابل قدر اور بے نظیر کوششوں کا ہے جو ممدوح الیہ نے کانفرنس کی کامیابی کے لئے کیں۔ اور ایک عرصہ دراز تک اپنا ذاتی کام چھوڑ کر اس قومی کام میں مصروف رہے اگر قاضی صاحب موصوف دل و جان سے اس کام میں کوشش نہ کرتے اور بہت بڑا حصہ اپنے قیمتی وقت کا اس میں نہ لگاتے تو ممکن نہ تھا کہ کانفرنس کے تمام کام نہایت خوبی سے انجام پاتے اور ایسی شان و شوکت سے اجلاس ہوتے اور ہر اجلاس میں مسلمانوں کا ایک بڑا مجمع موجود رہتا اور کامیابی حاصل ہوتی

فقط

محسن الملک

آنریری سکریٹری محمڈن اینگلو ایجوکیشنل کانفرنس

کتابی دنیا

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
(تبصرہ نگار)

غبار خاطر پر ایک نظر

دنیائے ادب کی باوقار شخصیتوں میں مرزا غالب، علامہ اقبال اور مولانا آزاد اپنی علمی اور ادبی خدمات کے سبب نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک میں بھی مشہور و معروف ہیں ان کی کاوشوں میں ارتقائے شخصیت کی جو کڑیاں ملتی ہیں ان سے ان کے احساسات کے ساتھ ادراکات کی وسیع دنیا بھی اہل ادب کے سامنے اجاگر ہوتی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں علمی ہو یا ادبی، تہذیبی ہو یا ثقافتی، مذہبی ہو یا سیاسی مولانا ابوالکلام آزاد ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک انجمن کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں دوسرے لفظوں میں مولانا آزاد کی ہمہ گیر زندگی کے ایک ایک گوشے میں کئی محفلیں برپا ہوتی ہیں جن کی پشت پر عروج کی شاندار داستان جنگ آزادی کی مسلسل کہانی اور تعمیر نو کی مربوط تاریخ ملتی ہے

کسی نے سچ کہا ہے کہ خطوں میں جہاں انسان کے متضاد پہلو اور حالات کی رنگا رنگی غیر ارادی طور پر نمایاں ہوتی ہے وہاں زندگی میں نشیب و فراز کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے، جہاں المیہ اور طربیہ کا امتزاج ملتا ہے وہاں خوف و رجا کے سرچشمے بھی نظر آتے ہیں نتیجہ مولانا آزاد کے مکاتیب بھی انکے افکار اور اعمال

انکی علمیت اور ادابیت اور ان کے مشاہدہ اور وجـــدان سب کو احاطہ کئے ہوئے ہیں اور اس طرح وہ ایک انجمن ہی نہیں بلکہ ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں بقول آل احمد سرور : «غبار خاطر میں آزاد کے اسلوب کی ارتقائی شکل نظر آتی ہے اور اس میں دراصل اپنے گرد و پیش کے تذکرے کی داستان بھی ملتی ہے۔ ادابیق ادب کی بحث ہو یا داستان بے ستون و کوہکن، چڑے چڑیا کی کہانی ہو یا پھولوں کی بہار کا تذکرہ، موسیقی کے اثرات کی تفصیل ہو یا صلیبی معرکوں کی حکایتیں، ان سب میں مولانا آزاد کا اسلوب ایک جوئے نغمہ خواں کی طرح ہے مگر اس کی دلکشی اور دلاویزی کو سمجھنا ہے تو الہلال کے اسلوب کو ذہن میں رکھنا پڑیگا »

مولانا آزاد کی فکری قوت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کے خطوط علمی بحث کی وجہ سے مقالے کی صورت اختیار کرتے ہیں کیونکہ وہ پورے علمی اور اصطلاحی ساز و سامان سے مرتب کرکے کہتے ہیں اور مشاہدہ اور وجدان کی بجائے ان میں منطق اور استدلال نظر آتا ہے اور اس طرح غیر رسمی اور بے تکلف فضا سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان میں ادعاے علمیت ہے لیکن گفتگو کے لین دین کا انداز نہیں

یہاں اس امر کا اظہار کردینا ازحد ضروری ہے کہ غبار خاطر میں مکتوب الیہ کی شخصیت اتنی دھندلی ہے کہ مشکل ہی سے کوئی نقش ابھرتا ہے بلکہ مکتوب نگار یعنی مولانا آزاد کی انا، غالب نظر آتی ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت ان کی انا، میں ملاحظہ کیجئے یہ خط انھوں نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو قلعۂ احمد نگر سے اپنے دوست عزیز حبیب الرحمن خان شیروانی کو لکھا ہے (ص ۱۱۶) :

«لوگ بازار میں دوکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہے۔ میں نے جس دن اپنی دوکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہوسکے ـــہ

در کوی ما شکسته دلی می خرند و بس
بازار خود فروشی ازاں سوی دیگر است

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا، کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا ــــــ

با رفیقانِ زخود رفته سفر دست نه داد
سیر صحرای جنوں حیف که تنها کردیم

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا، وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی ــــــ

ان نیست که من ہم نفساں را نگذارم
با آبله پایاں چه کنم، قافله تیز است »

مولانا آزاد ایک اور خط میں جو انہوں نے ۹ جنوری ۱۹۴۳ء کا لکھا ہے اس میں اپنی انانیت کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں

« ہماری درماندگیوں کا کچھ عجب حال ہے ہم اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچا سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے بچا نہیں سکتے ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی رہیگی ہم جہاں جاتے ہیں ہمارا سایہ ہمارے ساتھ جاتا ہے »

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے ایک خط میں مولانا آزاد تقلیدکی بجائے تحقیق کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی موروثی تعلیم کے پیش نظر اپنے عقاید کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں (ص ۱۲۴)

« میری تعلیم خاندان کے موروثی عقاید کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کشمکش پیدا ہوتی۔ وہ سر تا پیر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی جو موثرات

نسل اور خاندان نے مہیا کردئیے تھے۔ تعلیم نے انہیں اور زیادہ تیز کرنا چاہا اور گرد و پیش نے انہیں اور زیادہ سہارے دئیے تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں؟ مگر بار بار یہی سوال سامنے ابھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہئیے تقلید اور توارُث پر کیوں؟ یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا کیونکہ موروثی اور روایتی عقاید کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ جب بنیاد ہل گئی تو پھر دیوار کب تک کھڑی رہ سکتی تھی کچھ دنوں تک طبیعت کی درماندگیاں سہارے دیتی رہیں لیکن بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی دیوار کو سنبھال نہیں سکتا ـــــ

اراں کہ بیرونی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہی کہ کارواں رفتست

شک کی یہ چبھن تھی جو تمام آنیوالے یقینیوں کے دلیل راہ ہوئی۔ بلا شبہ اس نے پچھلے سرمایہ سے تہی دست کردیا تھا مگر نئے سرمایہ کے حصول کی اگن بھی لگادی تھی اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہنچادیا۔ گویا جس علت نے بیمار کیا تھا وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی (ص ۱۲۴) ع

دردہا دادی و درمانی ہنوز

موسیقی سے مولانا آزاد کو بڑا شغف تھا اور اس تعلق سے ایک خط میں جو انہوں نے ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ع کو لکھا تھا فرماتے ہیں :

> «حقیقت یہ ہیکہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں اور ٹھیک ایک ہی طریقہ پر ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مؤلف الحان کے اجزا کو وزن و تناسب کے ساتھ ترکیب دے دیتا ہے اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزا کو حسن ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے (ص ۲۸۷) »

مزید فرماتے ہیں ۔ «میں آپ سے ایک بات کہوں میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا میرے لئے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے ؎

روی نیکو معالجۂ عمر کوتاہ ست
این نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ اند

مجھے اگر آپ زندگی کی ربی سہی راحتوں سے محروم کردینا چاہتے ہیں تو صرف ایک چیز سے محروم کردیجئے آپ کا مقصد پورا ہوجائیگا یہاں احمد نگر کے قید خانے میں اگر کسی چیز کا فقدان مجھے ہر شام محسوس ہوتا ہے تو وہ ریڈیو سٹ کا فقدان ہے (ص ۲۸۱) »

مولانا آزاد نے اور فنوں کی طـــرح طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی ایک خط مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ع میں لکھتے ہیں :

«میں نے تکمیل فنون کے لئے طب شروع کردی تھی خود (قانون) پڑھتا تھا اور طلبا کو مطول، میر زاہد اور ہدایہ وغیرہ کا درس دیتا تھا (ص ۱۲۴) »

مولانا کو (چائے) اور چینی چائے سب سے زیادہ پسند ہے چائے کے بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں

«میں چائے کو چائے کے لئے پیتا ہوں لوگ شکر اور دودھ کے لئے پیتے ہیں (ص ۱۷۴) » مزید لکھتے ہیں «ایک مدت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں وہ وہائٹ جیسمین کہلاتی ہے یعنی «یاسمین سفید» یا ڈھیٹ اردو میں یوں کہیے «گوری چمبیلی» ؎

کسیکہ محرم راز صبا ست می داند
کہ باوجود خزاں بوی یاسمن باقیست

اس کی خوشبو جسقدر لطیف ہے اتنا ہی کیف تند و تیز ہے رنگت کی نسبت کیا کہوں لوگوں نے (آتش سیّال) کی تعبیر سے کام لیا ہے (ص ۱۸۴) »

مولانا کو اپنی اہلیہ بیگم زلیخا سے بڑا پیار تھا اور دونوں ایک دوسرے کی طبیعت سے واقف تھے ایک خط جو انہوں نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ع کو لکھا ہے اس میں اس طرح تذکرہ کرتے ہیں (ص ۲۵۸) :

«ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور انکا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے ۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک «خدا حافظ» کہنے کے لئے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے اس نے «خدا حافظ» کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا ع

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم»

مزید وہ لکھتے ہیں «اس نے پوری کوشش کی کہ وہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقاید میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار پھر کیا بات تھی کہ اس موقع پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی۔ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی (ص ۲۵۹) »

المختصر غبار خاطر (آزاد ھند پبلیکیشنز لمیٹیڈ، میکلوڈ روڈ، لاہور - پاکستان) مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی کاوشوں میں ایک قابل ذکر تصنیف ہے اور اردو کے تعلق سے اول درجے کی تالیف تصور کیجاتی ہے۔ یہ نہ صرف مولانا کی زندگی اور سیرت کی ترجمان ہے بلکہ پورے عہد کی عکاسی بھی ہے۔

• •

مقالہ نما

ادبیات

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر

فورٹ ولیم کالج کا ایک نادر نسخہ
گل و ہرمز یعنی حسن و عشق

ششماہی نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۸۵ء
جلد ۳۵، شمارہ ۲، ص ۵۰ تا ۶۵

فورٹ ولیم کالج میں کچھ ایسی کتابوں کے ترجمے بھی جو اب زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہونے ہوئے بھی محققین کی نظروں سے پوشیدہ ہیں ان میں قصہ گل و ہرمز یعنی حسن و عشق نامی کتاب ہے جسے منشی غلام حیدر عزت ساکن چاٹگام نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۲ء میں ترجمہ کیا یہ کتاب اب ڈھاکا یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

دیباچے میں مصنف نے یہ بات خود ہی واضح کردی ہے کہ قبل ازیں اس قصۂ دلاویز کو ایک استاد کامل نے فارسی میں نظم کیا تھا اور «گلشن عشق» نام رکھا تھا مگر طویل اور لمبے الفاظ دقیق عبارت اور غیرفہم مطلب کی بنا پر محمد وارث نے اس قصہ کو مختصر کرکے فارسی نثر میں لکھا اسکے بعد غلام حیدر عزت نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر اسے زبان ریختہ میں نثر کیا اور اس کا نام «حسن و عشق یعنی قصہ گل و ہرمز» رکھا عزت نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہ اصل کتاب کا پورا ترجمہ نہیں ہے۔ انھوں نے صرف مراد ہی کو مد نظر رکھا بعض مقامات میں انھوں نے الفاظ کا ترجمہ موقوف کردیا بعض فقرے جو مبالغہ اور محاورے کے موافق نہ تھے انھیں بھی موقوف کردیا۔

مقفی اور مسجع عبارتیں اس کتاب میں ہمیں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں مکالمے بھی برجستہ اور ادب و تہذیب کے دائرے میں مقید ہیں۔ رواداری اور رسوم و آداب کی پوری طرح پابندی کی گئی ہے۔ کہانی کا پلاٹ بھی بڑا منظم اور گھٹا ہوا ہے تسلسل اس کی خاص خوبی ہے۔ قدیم داستانوں کی طرح اس میں مافوق الفطرت عناصر کا وجود نہیں ہے۔

مقالہ ہذا میں ساری کہانی کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے

ڈاکٹر نور السعید اختر

سمجھو سورتی اور ان کا نایاب کلام

ششماہی نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۸۵ء
جلد ۳۵، شمارہ ۲، ص ۶۶ - ۸۷

سمجھو سورتی ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں گجرات (سورت) کے آسمان ادب پر ابھرے اور مغلوں کے شاندار دور کے اختتام کے ساتھ نوابین کھمبایت کی خدمت میں آخری سانس لی۔ ان کا پورا نام افصح الزماں غلام محمد میاں سمجھو تھا۔ سورت میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں پروان چڑھے اور مروجہ علوم میں مہارت حاصل کی البتہ عربی میں کافی عرصہ بعد استعداد پیدا کی

صاحب مضمون کو رجسٹر کی سائز کا ۷۲ صفحات پر مشتمل سمجھو کا دیوان دستیاب ہوا ہے۔ جس میں ۱۷۰ غزلیں قصائد، مثنویاں اور قطعات موجود ہیں۔ صاحب تاریخ گجرات کے مطابق سمجھو نے دیوان ریختہ، سلام، مرثیے، ایک فارسی تذکرہ خزینۃ الشعراء اور تین یادگار چھوڑی ہیں۔ ولی اور عزلت کے بعد انہوں نے گجرات میں اردو کی آبرو رکھ لی تھی۔

نجی زندگی سے متعلق اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کے اعتبار سے وہ اثنا عشری تھے، کسی ہندو معشوق کے بندہ بے دام تھے۔ منشیات سے انہیں دلچسپی نہ تھی تاہم دل بہلا لیا کرتے تھے سیر و سیاحت کا شوق تھا۔

سمجھو نے اپنے کلام میں سیاسی حالات و کوائف کی طرف جابجا حوالہ دیا ہے سمجھو کا تغزل اول تا آخر روایتی ہے جسکا محرک عشق و عاشقی کا والہانہ اور حقیقت پسندانہ جذبہ ہے۔ غزلوں کا حسن ان کے عوامی لہجہ میں پوشیدہ ہے۔ اس میں مقامی عناصر کی چاشنی رچی ہوئی ہے۔ واسوخت میں محاکاتی عنصر قابل ستائش ہے۔ قصیدہ نگاری عام روش سے ہٹ کر نہیں ہے البتہ انہوں نے شوکت

الفاظ ، تشبیہات و تلمیحات کا خوبصورت استعمال کیا ہے . سمجھو کو فن تاریخ گوئی پر ملکہ حاصل تھا .

افتخار امام

کچھ یگانہ اور ترانہ کے بارے میں

ماہنامہ شاعر بمبئی ، جلد ۵٦ شمارہ ۸، ۹ ص ۱۳ ـ ٦۸

یگانہ ایک ایسے تخلیق کار کا نام ہے جس نے اپنی شاعری کو مروجہ اسلوب اور ڈکشن سے الگ کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے .

ترانہ میں شامل رباعیوں میں ہندی آمیز لہجہ نمایاں ہے گاڑھے عربی فارسی الفاظ کی بجائے آسان نرم الفاظ و ترکیب کا استعمال زیادہ ملتا ہے . نامانوس اور غیر مستعمل الفاظ بھی ملتے ہیں . یگانہ کے یہاں زبان و بیان کی غلطیاں اور فنی خامیاں کم سے کم ملتی ہیں کیوں کہ انھوں نے محاورے ، کہاوتیں ، زور مرہ تراکیب ، نئے نئے الفاظ اور ان کی شکست و ریخت کے عمل سے اپنی شعری کائنات کو سجایا ہے . ترانہ کا اب تک صرف ایک ہی ایڈیشن شائع ہوسکا ہے اور اب ۵۲ سال کے بعد «شاعر» کے ذریعے اسکی تدوین عمل میں آئی ہے

ڈاکٹر مسز صفیہ جاریہ انیس

داستان رت پدم

ماہنامہ برہان دہلی ، دسمبر ۱۹۸۵ع جلد ۹٦ شمارہ ٦ ، ص ۳۷ تا ۵۳

(قسط ۲)

بزمی کی مثنوی «رت پدم» کی اہمیت اس وجہ سے مسلم ہے کہ اس داستان کو فارسی ادبیات میں سب سے پہلے شامل کرنے کا شرف بزمی کو حاصل ہے . قسط پہلا میں اس داستان کے ماخذ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلایا ہے کہ بزمی نے اس سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں دیا ہے . لیکن اس داستان کو سب سے پہلے ملک محمد جائسی نے شیرشاہ سوری کے عہد (۱۵۳۸ع تا ۱۵۴۵ع) میں اودھی زبان میں منظوم لکھا اور اس کا نام «پدماوت» رکھا . جائسی کی یہ مثنوی ہندی کا عالی ترین شاہکار ہے .

بزمی اور جائسی کی داستانوں کا تقابل مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بزمی نے جائسی کی داستان سے پورا استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بزمی نے جائسی کی پدماوت کا محض فارسی ترجمہ پیش کیا ہے بزمی کی داستان کے

مقابلے میں جائسی داستان زیادہ مفصل دلکش اور پُر اثر ہے۔

گیان چند جین

اردو نظم اور اسکے اصناف

ماہنامہ شبخون الہ آباد، جولائی،ستمبر ۱۹۸۵ع، جلد ۱۹ شمارہ ۳۸ ص ۳ - ۳۸

اردو میں ماضی و حال میں حسن نئی اصناف نظم کا اضافہ ہوا ہے اور جن قدیم اصناف میں ترمیم و توسیع ہوئی ہے انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا گویا نئی شعریات میں ماضی و حال، روایت، تجربہ اصل واخذ سب کو پیش نظر رکھ کر اصناف کی نئی تعریف، نئی گروہ بندی کرنی پڑے گی اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر شعر، نثر مرحر، فرد، قصیدہ، غزل تشبیب، حبس مطلع و ریب مطلع، زمین دوبحریں غزل، آزاد غزل، معرا غزل نثری غزل، اینٹی غزل، قطعہ، مثنوی، ترکیب، ترجیع بند، مسمط، مثلث، مربع مخمس، مسدس، مسبع، متسع، مثمن و مشعر، رباعی، مستزاد، ذولسانی ریختہ منظوم، نعت، چکری، سہیلا، حقیقت سی حرفی، مرثیہ، شخصی مرثیے، کربلائی مرثیے، چہرہ، ماجرہ، رخصت، ہفت بند شہادت نامہ، سلام، زاری، نوحہ، ماتم مرثیہ، شخصی مرثیہ، فالنامہ، شہرآشوب واسوخت، ریختی، سہرا، معمہ، پہیلی مکرنی، ساقی نامہ، دوہا، کنڈلیا، چوپائی وشنو پد، چوبولا، آلہا، کبت، جھولنا اشلوک، ساکھی، شبد، بارہ ماسہ، گیت رقصی، عشقیہ گیت، بسنت، ہولی، پھاگ ساون، دھرپد، خیال، ٹھمری، دادرا ٹپّہ، چوبدا، چار بیت، سانیٹ، ترائیلے ہائیکو، نظم معرا، آزاد نظم، آزاد رباعی مختصر نظم، یک مصرعی نظم، سنگیت نالک منقبت، سور، تضمین، تاریخ، اسمل مونولاگ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کاظم علی خاں

ناسخ کی غزل گوئی

ماہنامہ آج کل دہلی، فروری ۱۹۸۶ع جلد ۴۴ شمارہ ۷، ص ۹ - ۱۵

ناسخ بعہد نواب شجاع الدولہ ۷ محرم ۱۱۸۶ھ مطابق جمعہ ۱۰ اپریل ۱۷۷۲ع کو اودھ کے قدیم دار الحکومت فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے بچپن میں وہ لکھنؤ آگئے۔ لکھنؤ میں انہوں نے ایک نئے ادبی مرکز کی بنیاد ڈالی ناسخ نے اپنی تقریباً ۴۸ سالہ ادبی زندگی کے دوران کسی

استاد کی باقاعدہ شاگردی تو اختیار نہیں کی مگر وہ خود درجنوں شاگردوں کی ایک کثیر جماعت کے استاد ضرور رہے ۔

کلیات شیخ امام بخش پہلی بار مطبع محمدی لکھنؤ سے دو شنبہ ۲۳ جوری ۱۸۴۳ع کو چھپا تھا ۴۱۲ صفحات کے اس کلیات میں ناسخ کے تین دیوان ہیں ۔ جن میں مع فردیات ناسخ کی ۸۳۸ غزلیں شامل ہیں ۔

ناسخ نے دہلی کے علی الرغم لکھنؤ میں شاعری کی ایک ایسی ہی روایت قائم کردی جسکی تقلید مصحفی جیسے بزرگ شاعر کے لئے بھی ناگزیر ہوگئی

ناسخ کی غزلیہ شاعری میں دل سے زیادہ دماغ کی حکمرانی ملتی ہے ۔ ناسخ کے یہاں صنائع جیسی تمثیلوں کی اتنی کثرت ہے کہ اردو کا امام تمثیل نگار قرار دینا غلط نہ ہوگا ان کے یہاں واردات قلبی اور جذبے سے زیادہ تخیل و طرز ادا پر زور ملتا ہے مذہبی معتقدات کے ساتھ ناسخ کے غزلیہ کلام میں اخلاقی مضامین کی مقدار بھی کم نہیں

ناسخ نے اردو غزل کے مضامین میں توسیع کے ساتھ اصلاح زبان کا اہم کام بھی سرانجام دیا ۔

محمد نور الدین خان

ڈاکٹر زور کے چند خطوط

ماہنامہ سب رس حیدر آباد (ہند) جنوری ۱۹۸٦ع جلد ۵ شمارہ ۱ ، ص ۳۵ - ۳۹

جناب زور کے یہ خط انکی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں ۔ جناب ڈاکٹر زور نے دکنی ادب اور دکن کے ان قدیم اساتذۂ سخن پر جو پردہ گمنامی میں روپوش ہوگئے تحقیقی مقالے لکھے اور اہل علم اصحاب سے لکھوایا کس کس طرح مواد اکھٹا کرتے واقف کار اصحاب کو خط لکھتے اور بذات خود جاکر ملاقات کرتے تھے اس کا تھوڑا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے ۔

محمد علی صدیقی

اقبال —— جہان دیگر

ماہنامہ شاعر بمبئی ، جلد ۵٦ شمارہ ۷ ص ۲۵ - ۳۸

علامہ اقبال کے مکاتیب کے دس گیارہ مجموعے ترتیب دئے جاچکے ہیں اقبال «جہان دیگر» اس لحاظ سے اہم مجموعہ مکاتیب ہے کہ اقبال نے راغب احسن مرحوم کے نام بعض کلیدی اہمیت کے مکاتیب تحریر کئے ہیں ۔ علاوہ ازیں بعض

مسائل کے بارے میں اقبال کی مبہم آرا زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ کچھ ایسے مکاتیب بھی شامل ہیں جو کافی چونکا دینے والی تحریریں سمجھی جائیںگی شمارہ ہذا میں دس انگریزی و اردو خطوط بقلم اقبال بھی دئیے گئے ہیں

وہاج الدین علوی

دستور اردو زبان

مولوی عبد الحق کی «قواعد اردو» کا ماخذ

ماہنامہ کتاب نما دہلی، نومبر ۱۹۸۵ع
جلد ۲۵ شمارہ ۱۱، ص ۴۵ - ۴۹

مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب «قواعد اردو» کے دیباچہ میں اردو قواعد نویسی کی جامع تاریخ پیش کی ہے اس فہرست میں کئی نام شامل ہیں مگر کہیں اشارۃً بھی عبدالرحیم گورکھپوری یا ان کی قواعد کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرے سے وہ اس قواعد کے وجود سے آگاہ ہی نہیں ہیں۔

لیکن عبد الرحیم گورکھپوری کی «دستور اردو زبان» اور مولوی صاحب کی «قواعد اردو» میں اسقدر مماثلت ہے کہ عبدالحق صاحب کے دعوی کی نفی ہوتی ہے۔ مضمون نگار نے تقابلی مطالعہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولوی عبدالحق کی «قواعد اردو» کی اساس عبدالرحیم گورکھپوری کی «دستور اردو زبان» پر ہے

ڈاکٹر یعقوب عمر

حیات سعدی کے مختلف پہلو
اس عہد کے سماجی پس منظر میں

ماہنامہ ذوق نظر حیدر آباد ہند، اکتوبر ۱۹۸۵ع جلد ۱ شمارہ ۱۰، ص ۹ - ۱۷

حضرت سعدی کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ مہد سے لیکر لحد تک زندگی کے ہر پہلو پر گذشتہ آٹھ صدیوں سے محیط رہے ہیں۔ انہوں نے دنیا کو جس پہلو سے دیکھا نہ صرف بلاکم و کاست بیان کردیا بلکہ ہر پہلو پر اپنا تبصرہ، تجزیہ اور مخصوص حالات میں ان سے عہد برآں ہونے کے گر بھی واضح طور پر بتلادئیے ہیں۔

شمس الرحمان فاروقی

میر کے کلام میں عاشق کا کردار

ماہنامہ شبخون الہ آباد، اکتوبر نومبر ۱۹۸۵ع جلد ۱۸ شمارہ ۱۳۹ ص ۵۵-۶۹

حقیقت یہ ہے کہ میر کا عاشق اور انکی پوری شخصیت بھی انکی زبان ہی کی طرح بے تکلف، چونچال، طباع، پیچیدہ اور متنوع ہے یہاں بنیادی بات یہ ہے کہ عاشق و معشوق کا وجود IMAGE میر کے کلیات میں ملتا ہے وہ فکشن کے کردار کی طرح اپنی انفرادیت اور شخصیت رکھتا ہے اور واقعی زندگی کے افسانوں کی طرح بہت پیچیدہ بھی ہے ان کرداروں میں کسی قسم کی واقفیت نہیں ہے لیکن یہ واقعی کرداروں کی طرح ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں کیونکہ شاعر نے ان کو تصوراتی اور تجریدی سطح پر نہیں بیان کیا بلکہ مرئی اور ارضی سطح پر بیان کیا ہے المختصر میر کی غزل ان کی خود نوشت سوانح حیات نہیں ہے۔

محمد بدیع الزماں

«بال جبریل» کی غزلوں کا
آہنگ و آب و رنگ

ماہنامہ ذوق نظر حیدر آباد ہند، اکتوبر ۱۹۸۵ء جلد ۱ شمارہ ۱۰ ص ۲۴ - ۳۵

بال جبریل کی غزلوں میں جب باتیں آہنگ اور آب و رنگ کی آتی ہیں تو ان غزلوں میں دوسری ساری خصوصیات کے الفاظ کی قرینگی کے ساتھ درو بست اور انکی تراکیب معنوں کے اعتبار سے ایسی شگفتگی پیدا کرتی ہے جو قاری کے ذہن کی طرف خود بخود رہبری کرنے لگتی ہیں۔ بہت سیدھے سادھے اور جانے پہچانے الفاظ کو تراکیب کی دلآویزی برجستگی، سلاست و روانی اور پھر ردیف کی سنگ روی اور موزوں بحر کے انتخاب سے اقبال نے غزلوں میں جو صوتی ہم آہنگی پیدا کی ہے وہ اتنی لطیف ہے کہ ہر صاحب ذوق کو گانے یا گنگنانے پر مجبور کرتی ہے۔

شخصیات

مترجم پروفیسر شعیب اعظمی

محی الدین ابن عربی شخصیت و فکر

ماہنامہ ذوق نظر حیدرآباد ہند نومبر ۱۹۸۵
جلد ۱ شمارہ ۹ ص ۲۹-۳۸

محی الدین ابن عربی مسلمانوں کے بزرگ صوفیا میں شمار ہوتے ہیں اور انہیں «الشیخ الاکبر» اور «ابن افلاطون» کے القاب سے نوازا گیا ہے۔ وہ ۱۷ رمضان ۵۶۰ ھ میں اندلس کے جنوب مشرق علاقہ مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ انکا خاندان

امیر کبیر لیکن دیندار لوگوں کا تھا۔ فقط آٹھ سال کے تھے کہ موحدین کے مرسیہ شہر پر قابض ہوجانے کی بنا پر انکا خاندان اشبیلہ منتقل ہوگیا ابتدائی علوم کی تحصیل یہیں کی۔ اس حرم کے پیروؤں کی خدمت میں فقہ اور حدیث پڑھی۔ جوانی کے ایام میں وہ قرطبہ میں تھے تو اندلسی فلسفی ابن رشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کئی حادثات کی بنا پر زہد و تصوف کی طرف مائل ہوئے قبرستان میں تنہا گھومتے اور زندگی کی کشمکش اور طور طریقوں کے بارے میں غور فکر کیا کرتے تھے حضر سے ملاقات کا واقعہ پیش آیا اور اسکے بعد سیر و سیاحت کیلئے باہر نکل پڑے مغرب میں ابومدین صوفی، تیونس میں ابوالقاسم بن قیس سے ملاقات ہوگئی پھر فاس کے علاقے میں گئے اور وہیں اقامت اختیار کچھ دنوں کے قیام بعد ریاضت کا شغل شروع کیا اور وہیں ان پر روحانی کیفیات کا نزول شروع ہوا۔ جب مرسیہ پہونچے اپنی پہلی تصنیف مواقع النجوم لکھی۔ پھر مراکش، اندلس، مکہ، بغــــداد، موصل، حلب، قاہرہ، اسکندریہ، قونیہ، کی سیاحت کی اور بالاخر دمشق میں سکونت پذیر ہوگئے اور ۶۳۸ ع میں انتقال فرمایا اور صالحیہ میں مدفون ہوئے۔

حکومت و عرفان کی دنیا میں شہرت پانے کے علاوہ ابن عربی شعر و ادب کی دنیا میں بھی اعلی مقام رکھتے تھے محی الدین کی باتوں میں ایسے مطالب ہیں جو بظاہر الحاد ہے اور یہی چیز مسلمانوں کے درمیان ان سے متعلق سخت اختلاف کا باعث بنی ہے بعضوں نے انکو ملحد گردانا ہے اور کچھ نے انہیں قطب اور ولی بھی کہا ہے۔

محی الدین ابن عربی کی تصنیفات بکثرت ہیں وہ بہت سارے موضوعات حتی کہ ادب تاریخ، تفسیر اور اسرار و رموز کے علوم پر بھی بے نظیر کتابیں لکھ گئے ہیں۔ بعضوں نے انکی کتابوں کی تعداد ۱۵۰ لکھی ہے۔ مولانا جامی کے بقول انکی پانچسو کتابیں ہیں لیکن معجم المطبوعات میں انکی تعداد ۲۸ بتلائی گئی ہے۔ ان میں بہترین تصنیف «الفتوحات المکیہ» ہے جو چار بڑے ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے دوسری «فصوص الحکم» ہے جو شیخ اکبر کے مخصوص مسلک کے خلاصہ پر مشتمل اور ساتھ ہی وحدت الوجود سے متعلق انکے مکمل پختہ اور دقیق عقاید کی حامل ہے۔

محمد امیر الدین صدیقی

محمد رضا نوعی خوشانی
سوانح حیات اور شاعری

(قسط اول و دوم)

ماہنامہ برہان دہلی
جنوری ۸۶ جلد ۹۶ شمارہ ۱ ص ۴۰-۵۲
فروری ۸۶ » ۹۶ » ۲ » ۴۰-۵۱

نوعی خوشانی کا نام محمد رضا تھا. لیکن اکثر سوانح نگاروں نے انکا اصلی نام نہیں لکھا ہے. نوعی نے دو تخلص رکھے تھے کچھ دنوں تک وہ سقائی کے تخلص سے لکھتا رہا پھر اسے بدل کر نوعی رکھ لیا نوعی کے کسی بھی سوانح نگار نے اسکا سن ولادت تحریر نہیں کیا ہے ماثر رحیمی میں نوعی کا سن وفات ۱۰۱۹ ع ہے لیکن وفات کے وقت نوعی کی عمر کیا تھی اسکا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے عبدالنبی کے مقول نوعی کی وفات ۴۹ سال کی عمر میں ہوئی تمام سوانح نگار متفقہ طور پر صراحت کرتے ہیں کہ نوعی کی وفات برہانپور میں ہوئی.

نوعی کے والد خوشان سے کاشان برائے تجارت گئے وہاں نوعی نے محتشم کاشی کی شاگردی اختیار کی. کچھ دنوں بعد واپس خوشان لوٹے حالات سے مجبور ہوکر اپنے وطن سے گجرات (ہندوستان) پہنچے مالی اعانت پانے کے بعد مشہد ایران میں اقامت گزیں ہوئے. وہی انکے والد کا انتقال ہوا. کچھ عرصے بعد مرو کی طرف رخت سفر باندھا اور وہاں کے گورنر نور محمد خان کے ساتھ رہا لیکن حاکم توران عبداللہ خان نے مرو پر حملہ کیا اور نور محمد خان کو شکست دی تو نوعی ایران چھوڑ کر ہندوستان چلا آیا نوعی کا خاص مقصد عبدالرحیم خان خاناں کی سرپرستی اور علمی دوستی سے فائدہ اٹھانا تھا. یہاں اسکے سرپرستوں میں مرزا یوسف مشہدی شہنشاہ اکبر شہزادہ دانیال، عبدالرحیم خانخاناں، شہزادہ پرویز شامل ہیں.

نوعی کا دیوان تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس نے قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی، ترجیع بند، ترکیب بند، غرض کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اس نے عاشقانہ، ناصحانہ متصوفانہ ہر قسم کی نظمیں کہی ہیں. اسکے دیوان میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ضرب المثل بن سکتے ہیں اسکی مثنوی سوز و گداز اور ساقی نامہ نے بڑی مقبولیت حاصل کی. نوعی کے کلام کی معنوی خوبیوں کے ساتھ یہ بات نہایت درجہ قابل ذکر ہے اس نے کلام کو نئی نئی ترکیبوں اور نئے طرز بیان سے آشنا

کیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ نوعی کا علم و ادب کی دنیا میں کافی اونچا مقام ہے مغل عہد کے فارسی شعرا میں وہ ایک امتیازی و انفرادی شان رکھتا ہے۔

مطرب نظامی

فراق صاحب یادوں کے جھروکوں سے

ماہنامہ ذوق نظر حیدرآباد (ہند) نومبر ۱۹۸۵ع جلد ۱ شمارہ ۱۱ ص ۴۹ - ۵۸

صاحب مضمون نے فراق صاحب سے اپنے تعلقات کی روشنی میں انکی شخصیت کو اجاگر کیا ہے اور اپنے انداز میں انکی زندگی کے خد و خال پر روشنی ڈالی ہے۔

مذہبیات

سید صباح الدین عبدالرحمن

تاریخ ارض القران پر ایک نظر

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۸۵ع جلد ۱۳۶ نمبر ۴ ص ۲۵۹ - ۲۷۴

(قسط نمبر ۳)

سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنی اس کتاب میں السنۃ العرب قبل الاسلام میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کم عمری میں ماہر السنہ بھی ہوگئے تھے۔ اسی مہارت کی بنا پر انہوں نے اس میں بہت سے الفاظ کی لغوی تحقیق بڑی محنت سے کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سید صاحب نے اپنی اس کتاب میں اپنی تحقیق و تدقیق کو زیادہ فوقیت و اہمیت دی ہے اس میں اپنی زبان اور اسلوب کے وہ جوہر نہیں دکھا سکے جو انھوں نے آئندہ تصانیف میں دکھایا ہے

سید صاحب کی یہ کتاب ۱۹۱۵ع میں لکھی گئی تھی اس اثنا میں ضرورت تھی کہ اس موضوع پر اہل قلم اور صاحب تحقیق کچھ اور اضافہ کرتے تاریخ ارض القران میں سید صاحب نے جو کچھ کلام پاک کو ماخذ بناکر لکھا ہے وہ تو حرف آخر ہے۔ آثار قدیمہ اور کتبات جو دریافت ہوتے رہتے ہیں انکے ذریعہ سے معلومات میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے

ڈاکٹر یعقوب عمر

شاہنامہ اسلام میں حضور کی سیرت نگاری

ماہنامہ ذوق نظر حیدرآباد ہند دسمبر ۱۹۸۵ع جلد ۱ شمارہ ۱۲ ص ۶۳ - ۷۳

(آخری قسط)

شاہنامہ اسلام کی چوتھی جلد میں حفیظ جالندھری کے قلم کی جولانی میں بظاہر کچھ کمی سی ہے اور قاری کچھ اکتاہٹ لگتا ہے۔ ایسا صرف اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ نے اس جلد میں غیر ضروری تفصیل اور طوالت سے کام لیا ہے

متفرقات

ایم. ایچ. مسعود بٹ

اصطلاحات برقیات

ماہنامہ اخبار اردو کراچی اکتوبر ۱۹۸۵ع
جلد ۲ شمارہ ۱۰ ص ۱۱ - ۱۳

فن برقیات کی ان انگریزی اصطلاحات کی متبادل اصطلاحات یا تراکیب تجویز کی گئی ہیں جنکا تعلق بجلی کے نظام تقسیم سے ہے انہیں تجویز کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اصول پیش نظر رکھے گئے ہیں.

۱) اردو اصطلاح سے متعلقہ چیز یا عمل کی پوری تصویر کشی ہوجائے
۲) جو انگریزی اصطلاحات کثرت استعمال سے اردو زبان کا حصہ بن گئی ہیں انہیں جوں کا توں استعمال کیا جاسکتا ہے
۳) اردو زبان کی قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی نہ ہو
۴) بعض انگریزی اصطلاحات مختلف سائنسی مضامین میں مستعمل ہیں اور انکے مفاہیم بھی ان مضامین میں مختلف ہیں. اس فہرست میں صرف برقیات کے حوالے سے اردو مترادفات وضع کی گئی ہیں
۵) اصطلاح مختصر ہو.

شمیم حنفی

حسرت کا مسئلہ

ماہنامہ شبخون الہ آباد اپریل مئی جون ۱۹۸۵ع جلد ۱۸ شمارہ ۱۳۷ ص ۳۴-۳۹

غزلیہ شاعری کی روایت میں حسرت شاید سب سے بڑے بت تھے مگر انکی بت پرستی پرستش کے ایک سطحی موڑ سے آگے نہ جاسکی یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری دلچسپ ہونے کے باوجود معمولی ہے اور تخلیقی تجربے کے تقریباً ان تمام ابعاد سے محروم جو شعر کو حکمت کا درجہ کو آگہی کا بدل ٹھہراتے ہیں.

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

خودی، عشق اور موت

ماہنامہ ذوق نظر حیدر آباد ہند دسمبر ۱۹۸۵ع جلد ۱ شمارہ ۱۲ ص ۴۱-۵۴

خودی کی سب سے زیادہ نمایاں صورت جذبہ عشق میں ظاہر ہوتی ہے جسکہ شخصیت کی ساری صلاحتیں جو بالقوة تھیں بالفعل ہوجاتی ہیں اسطرح خودی کی شعوری قوت میں عالمگیر روحانی قوت کے

تخلیقی عناصر اپنا اظہار کرتے ہیں۔ جذبہ
وشوق کی حالت ہمارے احساس ذات کو
اور زیادہ قوی و شدید بنا دیتی ہے۔ عشق
سے زندگی میں استحکام اور موت کے
بعد کی زندگی پر اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

اقبال کے بعد الطبیعی تصورات کا
مرکزی نقطہ خودی ہے جسکے بے پایاں
امکانوں کی اس نے پردہ کشائی کی ہے۔
خودی میں صرف کائنات کی تسخیر کی
صلاحتیں ہی نہیں ہیں بلکہ اپنی سب سے
بڑے دشمن مقابل موت پر بھی قابو پانے
کی قابلیت بدرجہ اتم موجود ہے تاکہ
اسکے ارتقاء کی کوئی منزل آخری منزل
نہ ہو۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر

عرش زادہ طریقۂ تعلیم

ماہنامہ اخبار اردو کراچی اکتوبر ۱۹۸۵
جلد ۲ شمارہ ۱۰ ص ۸ ـ ۱۰

عرش زادہ طریقۂ تعلیم کی دریافت
ایک نجی درسی تجربے پر مبنی ہے جو
جناب اکبر علی خان عرش زادہ کو اپنے
دو سالہ بچے حسان عرش کو اردو پڑھنا
لکھنا سکھانے میں حاصل ہوا۔ یہ بچہ جو
قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم کے سلسلے میں
عربی رسم الخط سے واقف ہوچکا تھا
اردو کے نئے حروف کی صرف دو ڈھائی
گھنٹے کی مشق کے بعد اس لائق ہوگیا
کہ اس نے اپنے چچا کے نام مفرد
حروف میں ایک مختصر اردو خط لکھ لیا

چنانچہ عرش زادہ کا خیال ہے کہ قرآن
مجید اور اردو پڑھانے کے لئے دو الگ
قاعدوں کی جگہ اگر ایک ہی قاعدہ جو
مشترک ہو رائج کیا جائے تو وہ تمام
قرآن مجید پڑھیں گے لازمی طور پر اردو
بھی سیکھ لیں گے

ڈاکٹر محمد امیر الدین صدیقی

جوی مولیاں اور قصیدہ رودکی

ماہنامہ برہان دہلی مارچ ۱۹۸۵ ع جلد ۹۵
شمارہ ۳ ص ۲۲ ـ ۳۰

نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ
میں ایک حکایت نصر ابن احمد سامانی
کی بابت ہے۔ اسکا خلاصہ یہ ہے کہ
ایک بار امیر نصر چار سال تک متواتر
بادغیس (ہرات) میں مقیم رہا اسکے
لشکری پریشان ہوگئے اور اپنے وطن
اور خاندان سے اتنے طویل عرصے کی
جدائی ان کے لئے بڑی شاق گذر رہی تھی
مگر مجبور تھے۔ اسکے معزز ندیموں میں

رودکی تھا لوگ اسکے پاس التجا لے کے پہنچے اور اسکو آمادہ کیا وہ امیر کو وطن لوٹنے پر راضی کردے رودکی تیار ہوگیا اور ایک قصیدہ لکھکر امیر کے پاس پہنچا اور پردہ عشاق میں اس قصیدے کو الاپنا شروع کیا۔ کہتے ہے کہ اسکے اشعار کا اثر اتنا ہوا کہ امیر ننگے پیر گھوڑے پر سوار ہوا اور بخارا کی طرف روانہ ہوا۔

قصیدے کا مطلع یہ ہے

بوی جوی مولیاں آید ہمی
بوی یار مہرباں آید ہمی

یہی واقعہ منہاج سراج کی طبقات ناصری میں سلطان سنجر اور امیر معزی کی طرف منسوب ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

سندیش راسک

ششماہی نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۸۵ء
جلد ۳۵ شمارہ ۲ ص ۱ - ۴۹

«سندیش راسک» قدیم پراکرتوں بالخصوص اپ بھرنش کے آخری دور کی ایک نہایت اہم شعری تصنیف ہے اسکا مصنف اندھمان (عبدالرحمن) کوئی ممتاز عوامی شاعر ہے جو اسکے اپنے بیان کے مطابق میر سین (میر حسین) نامی ایک نور باف کا بیٹا تھا اور اسکی پیدائش ملتان یا اسکے قریب و جوار کے علاقے میں ہوئی تھی

سندیش راسک کی فضا اور ماحول بالکل ہندوی ہے۔ اگرچہ اسکا لکھنے والا مسلمان ہے اور وہ اب سے آٹھ سو سال پہلے قلمبند کررہا ہے یہ اپنے شاعرانہ حسن کے اعتبار سے ایک بڑی ہی پرکشش تخلیق ہے جسکی زبان محاورہ اور تلفظ سبھی کچھ قدیمانہ ہے یہ زبان قدیم شکل میں ایک زمانے تک ملتان کی ادبی اور علاقائی زبان رہی ہے اسکے اسلوب نگارش پر صاحب تالیف عبدالرحمن کو غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔

سندیش راسک کی زبان اپ بھرنش کی وہ ادبی صورت ہے جس میں لسانی تغیرات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں «او» کا رجحان یہاں بہت ہی واضح ہے جو سندھی، راجستھانی اور برج کی ایک مشترک لسانی خصوصیت ہے۔ اس تالیف کے جو قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ ہندی دیوناگری رسم الخط میں ہیں جبکہ اوریجنل متن کس رسم الخط میں قلمبند کیا گیا تھا اسکے بارے میں کچھ

کہنا مشکل ہے غالباً دیوناگری رسم الخط ہی رہا ہوگا۔

سدیش راسک کے ہندی ترجمے کا اردو ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے بڑی خوبصورتی سے کرتے ہوئے مکمل کہانی سے واقف کرایا ہے

ریاض الرحمن قدوائی

رسالہ تیر اندازی

ماہنامہ کتاب نما دہلی دسمبر ۱۹۸۵ ع
جلد ۲۵ شمارہ ۱۲ ص ۳۸ - ۴۰

رسالہ تیر اندازی کے مصنف کا نام شاہ افضل گوالیاری ہے۔

افضل کے حالات زندگی مختصراً کئی تذکروں میں ملتے ہیں مگر ان سب میں تضاد ہے۔

یہ نظم رسالہ «تیر اندازی» اردو زبان کی پہلی نظم ہے یہ نظم قریب قریب ساڑھے تین سو سال پرانی ہے۔ نظم کا لفظ اسوقت تک رائج نہیں ہوا تھا ہر چھوٹی بڑی تصنیف چاہے نظم میں ہو یا نثر میں رسالہ کہی جاتی تھی اس رسالہ میں تیر چلانے کا صحیح انداز اور سلیقہ بتایا گیا ہے اس نظم کی زبان برج بھاشا پر مبنی ہے جو اسوقت گوالیار اور متھرا کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جسکو اب ہندی کہتے ہیں

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

جامعہ بمبئی میں اردو تحقیق کی رفتار

ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، جلد ۲
شمارہ ۴ اپریل ۱۹۸٦ ع ص ۴ - ٦

گوریکر صاحب نے اس مضمون میں اردو تحقیق سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بمبئی یونیورسٹی میں تاحال جو کچھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے مقالے لکھے گئے ہیں اس کا جائزہ لیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہنوز بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ کے علاوہ سینٹ زیویرس کالج، اسماعیل یوسف کالج انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور برہانی کالج میں اساتذہ کی نگرانی میں تحقیقاتی کام بخوبی ہو رہا ہے۔

●

Edited by Dr Nizamuddin S. Gorekar, MA, Ph, D, D Litt
Director, Anjuman - i - Islam Urdu Research Institute, Bombay 400 001
Published by Mr. Abdul Majeed Patka, B. Com (Hons)
General Secretary Anjuman - i - Islam, Bombay 400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay 400 008

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

نوائے ادب ، بمبئی

Registration No 32C09/50

رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت :	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نوعیت اشاعت :	ششماہی
نام پرنٹر :	جناب عبدالمجید پالکا ، بی، کام (آنرز)
قومیت :	ہندوستانی
پتہ	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نام پبلشر قومیت پتہ	ایضاً
نام ایڈیٹر :	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ
قومیت :	ہندوستانی
پتہ :	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نام پتہ مالک رسالہ	ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں

عبدالمجید ای پالکا

• • •

All remittances be sent& correspondence be made to
Prof. N. S Gorekar, MA, PhD, D Litt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

•

Annual Subscription

Inland : Rupees Twenty • Foreign. Pound Five

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

جلد ۳۶ — شمارہ ۲

اکتوبر ۱۹۸۶ء

•

مندرجات

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

نوائے ادب ، بمبئی

Registration No 32009/50

رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نوعیت اشاعت		ششماہی
نام پرنٹر	:	جناب عبدالمجید پالکا ، بی، کام (آنرز)
قومیت		ہندوستانی
پتہ		انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نام پبلشر قومیت پتہ		ایضاً
نام ایڈیٹر		پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ
قومیت		ہندوستانی
پتہ		انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نام پتہ مالک رسالہ		ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید ای پالکا

• • •

All remittances be sent& correspondence be made to
Prof N S Gorekar, MA, PhD, D Litt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

•

Annual Subscription

Inland : Rupees Twenty • Foreign : Pound Five

خبر نامہ

انجمن اسلام بمبئی کی صد سالہ تقریبات

انیسویں صدی کا نصف آخر ایک یادگار زمانہ تھا جبکہ جہاں ایک طرف حصول آزادی کی خاطر انڈین نیشنل کانگریس جیسی ایک مجاہدین آزادی کی جماعت وجود میں آئی اور صدائے بازگشت کے طور پر جہاں مسلمانوں میں دور حاضرہ کی ضرورتوں کے پیش نظر علیگڑھ تحریک کا آغاز ہوا تو وہاں دوسری طرف ۱۸۷۵ میں بمبئی میں انجمن اسلام جیسے ایک تعلیمی اور ثقافتی ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کی تاسیس کو ایک سو گیارہ سال ہوتے ہیں اور سن ۱۹۷۵ ع سے انجمن اسلام کے کار پردازوں نے بالعموم اور سربراہوں میں انتولے صاحب حافظکا صاحب اور حارث صاحب خصوصی طور پر اپنی دور صدارت میں اپنے طور پر اپنی بساط کے مطابق جشن منانے کا فیصلہ کرتے رہے لیکن خلاف توقع حالات مانع ہونے کی وجہ سے تقریبات کو ملتوی کرنا پڑا حتیٰ کہ جوان سال اور جواں ہمت ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب نے صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہی انجمن کی صد سالہ تقریبات کے متعلق نہ صرف سلسلۂ جنبانی شروع کی بلکہ سن ۱۹۸۵ ع سے مجلس صد سالہ تقریبات کی تشکیل دی اور یکم مئی ۱۹۸۶ ع کو جمہوریۂ ہند کے پر دلعزیز وزیر اعظم عالیجناب راجیو گاندھی صاحب نے انجمن کے قومی اور ثقافتی کردار کے پیش نظر انجمن کی صد سالہ تقریبات کی افتتاح کی دعوت قبول کی اور انجمن کی اولین عمارت کے لان پر افتتاح کے موقع پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مبارکباد دی اور کہا انجمن کے بانیوں نے سو سال پہلے بیج بویا اور آج مسلمانان بمبئی اس سے فیضیاب ہورہے ہیں اب نئی نسل کا فرض ہے کہ وہ آنے والے سو سال کے لئے ایسے منصوبے تیار کرے جس کی وجہ سے نہ صرف تعلیمی معیار اونچا ہو بلکہ اقتصادی اعتبار سے بھی عوام کی بے چینی دور ہو اور ہر شخص فارغ البالی سے عزت کے ساتھ زندگی گذار سکے۔ ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے وزیر اعظم اور دیگر مہمانان اعزازی کا استقبال کیا اور انجمن کی کارگذاری پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے آئندہ کے منصوبوں میں انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، انسٹی آف کمپیوٹر کورسیز اور ویمینس آل راؤنڈ ایجوکیشن کا ذکر کرتے ہوئے عملی جامہ پہنانے کے عزم کا اظہار کیا۔ مہاراشٹرہ کے وزیر اعلیٰ جناب شنکر راؤ چوہان

صاحب نے حکومت کی طرف سے انجمن کی خدمات کو سراہتے ہوئے نصف لاکھ کے عطیہ کا اعلان کیا۔ انجمن کے جنرل سیکریٹری جناب عبدالمجید پانگکا صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

اس مبارک موقع پر مہاراشٹر کے سابق وزرائے اعلیٰ میں جناب عبدالرحمٰن انتولے اور شری شرد پوار اور وزرائے ہند اور مہاراشٹر کابینہ کے اراکین کے علاوہ بیرونی ممالک کے قونصل حضرات عمائدین و رؤسا، ادبا و شعرا، فلمی دنیا کے اداکار و موسیقار وغیرہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ پروگرام کا آغاز تلاوت قرآن کے بعد انجمن کے ترانے اور اختتام قومی ترانے سے ہوا

کل ہند اساتذۂ اردو جامعات ہند کا گیارھواں اجلاس اپریل میں ہوا جس کی روداد اس شمارے میں شامل ہے۔ یہ صد سالہ تقریبات کی ایک کڑی تھی۔

اگست میں تفریحی و ثقافتی پروگرام انجمن کے سابق طالب علم اور دنیائے فلم کی مایۂ ناز شخصیت یوسف خاں صاحب عرف دلیپ کمار کی مساعی جلیلہ کا نتیجہ تھیں اس پروگرام سے کوئی ۳۰ لاکھ روپے جمع ہوئے اور پروگرام بھی ہر اعتبار سے کامیاب رہا

اکتوبر کے اوائل میں دلیپ کمار کی صدارت میں ایک تہنیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا اس موقع سے فائدے اٹھاتے ہوئے انجمن کی جانب سے دلیپ کمار صاحب کی خدمت میں انجمن کا نشان امتیاز پیش کیا گیا اور انجمن کے اداروں کے سابق و حال سربراہوں اور قابل استادوں و دیگر کارکنوں کو توصیفی سندات و شالیں پیش کی گئیں۔ مشاعرہ اس جلسہ کا حاصل تھا شعرائے کرام میں سردار جعفری، انجم رومانی، شمیم طارق، عزیز قیسی، قیصر الجعفری اور ظفر گورکھپوری قابل ذکر ہیں۔

نومبر کے پہلے ہفتہ میں "تعلیمی مسائل اور لسانی اقلیتیں" مذاکرہ ہو رہا ہوگا اس میں مختلف یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر، وزرائے کرام اور دیگر دانشور حضرات شریک ہو رہے ہیں اور دسمبر کے اواخر میں اختتامیہ جلسہ کا انعقاد ہوگا اور اس میں صد سالہ تقریبات کا محاسبہ کیا جائیگا اور اس طرح یہ تقریبات سال آخر تک اختتام پذیر ہونگی۔

(انجمن کی صد سالہ تقریبات کی مفصل روداد نوائے ادب کے آئندہ شمارے (اپریل ۱۹۸۷ ع) میں ملاحظہ فرمائیے)

(مدیر)

ڈاکٹر گیان چند

شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کی نثری تصانیف

اردو ادب کی تاریخ میں خواجہ بندہ نواز کے بعد شاہ میراں جی شمس العشاق سب سے بڑے صوفی و درویش ہیں۔ ان کی تصانیف شعری تو اہم ہیں ہی، اس سے اہم تر بات یہ ہے کہ ان کے فرزند برہان الدین جانم اور پوتے امین الدین علی اعلیٰ دکنی کے اتنے بڑے قلم کار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ شمس العشاق جیسی درخشندہ ہستی کے حالاتِ زندگی تاریکی میں ہیں۔ ان کے نسب، تاریخ ولادت و تاریخ وفات سب پر اختلاف رائے ہے۔ دراصل متضاد قدیمی بیانات کی وجہ سے یہ مسائل ایسے لاینحل ہوگئے ہیں کہ قیاس کا سہارا لیے بغیر چارہ نہیں۔ کوئی دلیل ایسی مسکت نہیں جسے قول فیصل کہا جاسکے۔ مسائل یہ ہیں :

۱ ان کے والد سید تھے یا مغل ؟
۲ وہ مکے میں پیدا ہوئے یا بیجاپور یا احمد آباد یا احمد نگر یا دلّی میں ؟
۳ ان کا سنہ ولادت کیا ہے ؟
۴ وہ بیجاپور کب آئے ؟
۵ ان کا سنہ وفات کیا ہے ؟

ان مسائل پر بحث کرنے والوں میں ذیل کے اصحاب ممتاز ہیں

۱ مولوی عبدالحق ۔ رسالہ اردو اپریل ۲۷ ع۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ رسالہ اردو اکتوبر ۳۹ ع ۔ اور مکتوب بنام سخاوت مرزا مورخہ ۳ جنوری ۱۹۵۶ ع

۲ ڈاکٹر زور : یہ جانم کا ارشاد نامہ مرتب کررہے تھے۔ انہیں صرف ایک نسخہ ملا تھا جسے انہوں نے چھپوا دیا۔ مقدمہ مکمل نہ کرسکے اس نامکمل مقدمے کے اجزا میں شاہ میراں جی کے زمانے کی بحث ہے۔

پروفیسر اردو، یونیورسٹی آف حیدر آباد، حیدر آباد (آندھرا پردیش)

۳ اکبر الدین صدیقی : کلمۃ الحقائق کا مقدمہ ۱۹۶۱ع سب رس حیدر آباد اپریل ۱۹۶۸ع، اردو نامہ کراچی اپریل تا جون ۶۸ ع، مقدمۂ ارشاد نامہ ۱۹۷۱ع، بجھتے چراغ ۱۹۷۵ع

۴ ڈاکٹر محمد ہاشم علی : مغز مرغوب و چہار شہادت کا مقدمہ ۱۹۶۶ع، حیدر آباد

۵ سخاوت مرزا : مولوی عبد الحق سے مراسلت، نیز مضمون اردو نامہ جنوری ۱۹۶۸ع

۶ ڈاکٹر حسینی شاہد شاہ امین الدین علی اعلیٰ ، حیات اور کارنامے ۱۹۷۳ع

ان میں اکبر الدین صدیقی نے ارشاد نامہ کے مقدمے میں، ڈاکٹر ہاشم علی نے مغز مرغوب و چہار شہادت کے مقدمے میں اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی کتاب میں اس موضوع پر مفصل تحریراتی بحث کی ہے۔

میراں جی کے حالات کے قدیم مآخذ یہ ہیں :

۱ دو صفحوں کا نسل نامہ و خود نوشت جس کے مخطوطے ادارۂ ادبیاتِ اردو، خانقاہ عنایت الہی (حسبِ ڈاکٹر زور)، کتب خانۂ آصفیہ اور درگاہ امینیہ بیجا پور میں ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی کتاب[1] میں نسل نامہ کو خود نوشت سے علیحدہ کرکے لکھا ہے۔ مکمل متن سخاوت مرزا نے اردو نامہ[2] میں دیا۔ راقم الحروف نے ادارۂ ادبیات کا نسخہ دیکھا

۲ ایک مرثیہ جس کے اجزا مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۷ع میں دیے۔ بعد میں اکبر الدین صدیقی نے کلمۃ الحقائق کے مقدمے میں اسے جزواً اور رسالہ سب رس حیدر آباد ۱۹۶۸ع میں کلیۃً دیا۔ آخر الذکر مضمون اکبر الدین کے مجموعے بجھتے چراغ ۱۹۷۵ع میں دوبارہ شائع ہوا۔

---

۱ شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۶۵ نیز ۷۵ - ۷۴

۲ سخاوت مرزا، حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال، اردو نامہ *کراچی، شمارہ ۳۰، جنوری ۶۸ ع*

۳ اردو مثنوی شجرۃ الاتقیا از سید محمد حسینی معظم یہ قادر لنگا کے مرید اور امین الدین علی اعلیٰ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس مثنوی کا مخطوطہ سالار جنگ لائبریری میں ہے۔

۴ سید علی پیر ابن بابا شاہ حسینی ابن امین الدین اعلیٰ کی فارسی مثنوی سراج العشق - یہ بھی سالار جنگ میں ہے۔

۵ فارسی مثنوی شرح غوثیہ از حالی مرید سید علی پیر - کتب خانہ درگاہ بیجاپور اکبر الدین صدیقی نے اپنے مجموعہ مضامین بجھتے چراغ میں اس کا نام تذکیرۂ غوثیہ لکھا ہے اور اسی عنوان سے مضمون لکھا ہے۔

۶ تذکرۃ الانساب سادات سکنۂ بیجاپور

۷ سید محی الدین قادری کا مجموعہ مجمع الانساب

ان کے نسب کے سلسلے میں اہم ترین دستاویز نسل نامۂ حاجی شریف دوام الدین یعنی خود نوشت حالات حضرت میراں جی ہے۔ حاجی شریف دوام الدین میراں جی کے والد کا نام تھا۔ اس میں میں میراں جی اور حضرت علی کے بیچ صرف ۱۷ واسطے ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے توجہ دلائی کہ طویل مدت کو دیکھتے ہوئے ۱۷ واسطے کم ہیں۔ عام طور سے کسی شخص کے ۲۰ سے ۵۵ سال کی عمر تک اولاد ہوتی ہے۔ ۲۰ اور ۵۵ کا اوسط ۳۸ لیا جائے تو ۱۷ پشتیں ۶۴۶ برس میں ہوجائیں گی جب کہ شاہ میراں جی اور حضرت علی کے بیچ کا فاصلہ تقریباً نو سو سال کا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نسل نامے میں کئی کڑیاں چھوٹ گئی ہیں۔ نسل نامے کے بعد مندرج خود نوشت کا خلاصہ یہ ہے:

«ہمارا مکان مکہ میں محلۂ قریشہ میں تھا میرے والد نے ہندوستان جاکر قوم چمطیہ (کذا دراصل چغتیہ یا چغتائی) میں شادی کی اور پھر مکہ واپس آئے۔ میں مکہ میں پیدا ہوا میرا نام امیر الدین رکھا۔ عرف میراں جی تھا۔ ۲۲ سال کی عمر میں مکہ سے مدینہ گیا اور درگاہ قبلۂ کونین کے پاس ۱۲ سال تین مہینے پانچ دن ایک ہی کروٹ

سے لیتا۔ جمعے کی رات کو سید المرسلین میرے خواب میں آئے اور مجھے کہا کہ ہندوستان جاؤ۔ میں نے عذر کیا کہ میں وہاں کی زبان نہیں جانتا۔ ارشاد ہوا کہ تم سب زبانیں جان جاؤگے۔۔۔ وہاں جاکر شاہ کمال الدین بیابانی سے ملاقات کرنا۔ میں ہندوستان آکر شاہ کمال کی خدمت میں رہا اور ہندی زبان سے واقف ہوگیا تب پیر نے حکم دیا کہ شادی کرلو۔ میں نے «سھگار» میں شادی کی۔ اس کے بعد پیر کے حکم سے محمد علی عادل شاہ میں واپس آگیا اور جس جا بی نے اشارہ کیا تھا ساکن ہوگیا »

اس خود نوشت میں ان کا نام امیر الدین دیا ہے۔ مسافر کے منظوم شجرے میں یہی نام ہے

امیر الدین میرا جی شمس المشتاق سرھان الدین پھر دو حق کا مشتاق[1]

لیکن انوار الاخیار، سید محمد قادری کے مرتبہ شجرے نیز سید حسن قادری کے علاوہ شجرے میں ان کا نام شمس الدین[2] دیا ہے۔ قیاس ہوتا ہے کہ نام کی رعایت سے شمس المشتاق لقب بنا ہو

خود نوشت کی روایت قدرے اختلاف سے شجرۃ الاتقیا اور دوسرے تذکروں میں دہرائی گئی ہے شجرۃ الاتقیا کے مطابق رسول نے کہا کہ بیجاپور میں ایک شہر شاہ پور ہے جہاں شہ کمال ہیں ان کے پاس جاؤ سید علی پیر کی مثنوی سراج العشق اور حالی کی مثنوی میں بھی شاہ پور کا ذکر ہے۔

تذکرۃ الانساب سادات ِ سکنہ بیجاپور اور مجمع الانساب دونوں نے یکساں الفاظ میں لکھا ہے کہ بیجاپور میں مشہور تھا کہ شاہ امین الدین کا خاندان سید نہیں مغل ہے، ان کے جد کا نام حاجی شریف دوام الدین نہیں، حاجی دولت مکتی تھا۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ ہیبت خاں، مراتب خاں، تیغ جنگ خاں اور میراں

---

۱ مسافر کا شجرۂ منظوم، مخطوطۂ گچی محل بیجاپور بحوالۂ حسینی شاہد ص ۶۴

۲ حسینی شاہد ص ۶۴

خاں عرف میراں صاحب[1]

حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ میراجی کے خلفا میں دو کا نام یوسف خاں اور مراتب خاں تھا۔ امین الدین علی اعلی کے ایک خلیفہ کا نام بھی مراتب خاں تھا۔ تذکروں میں میراجی کے بھائیوں کو یہ نام دینا کسی غلط فہمی کے سبب ہوسکتا ہے لیکن راقم الحروف کو حیرت ہے کہ خاں لوگ (مغل یا نوراانی) کب سے مشائخ کے خلفا بننے لگے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شمس العشاق کے خاندان کو اپنا ہم قوم دیکھ کر ان کی طرف رجوع ہوئے ہوں حسینی شاہد کا خیال ہے کہ چشتیہ سلسلے کی مقبولیت دیکھ کر طریق قادریہ نے ہر زمانے مخاصمت یہ شاخسانہ کھڑا کر دیا ہوگا

لیکن حاجی مکی کوئی فرضی یا خیالی نام نہیں حسینی شاہد کے مطابق سجادہ نشین گچی محل کہتے ہیں کہ حاجی مکی وہی بزرگ ہیں جن کا نام روضۃ الاولیا میں حاجی رومی کے نام سے آیا ہے ان کا مزار بیجاپور کے پاس تکوٹہ میں ہے۔ حاجی مکی کا عرس زمانۂ قدیم سے سجادہ نشین درگاہ امین الدین اعلی کیا کرتے ہیں۔[2] حسینی شاہدیہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ بیجاپور کا ایک خاندان خود کو حاجی مکی کی اولاد کہتا ہے۔ اس خاندان کے مطابق وہ ایک شاخ سے ہیں اور حضرت امین دوسری شاخ سے ۔ اس طرح حاجی مکیؔ حضرت امین الدین اعلی کے جد قرار پاتے ہیں۔ خود نوشت کے مطابق میراجی کے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین تھا تذکرۃ الانساب اور مجمع الانساب کے مطابق ان کا نام حاجی دولت مکی تھا۔ حسینی شاہد کو ایک[3] بیاض میں میراں جی کے والد کی یہ تاریخ وفات ملی

حاجی دولت دوام دین شد

۸۸۱ھ

اس میں حاجی دولت مکی اور حاجی شریف دوام الدین دونوں کا امتزاج ہوگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں اور تکوٹہ کی درگاہ والے حاجی مکی میراں جی کے والد ہی ہیں۔

---

۱ حسینی شاہد : شاہ امین الدین اعلی ص ۶۸
۲ ایضاً ص ۷۱   ۳ ایضاً ص ۹۸

ڈاکٹر محمد ہاشم علی مفر مرغوب و چہار شہادت کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ کتب خانہ درگاہ امینیہ کی ایک بیاض میں حاجی رومی اور حاجی مکی کو حضرت محبوب الہی (نظام الدین اولیا) کا مرید بتایا ہے۔ حاجی رومی کا مزار بیجاپور کے ڈاک بنگلے میں ہے اور حاجی مکی کا بیجاپور سے دس میل دور تکولہ میں۔ اس طرح یہ دو الگ الگ شخصیتیں قرار پاتی ہیں

شاہ میراں جی کے والد مکے سے چل کر ہندوستان آئے اور ایک چغتائی مغل لڑکی سے شادی کی خوش نامہ اور خوش نغز کی ہیروئن کے بارے میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے ایک پرانے کاغذ کی بنا پر انکشاف[1] کیا کہ خوش بی، حضرت میراں جی کی سالی نہیں ان کے بارے میں میرا جی لکھتے ہیں

ذات ماں کی چغطا جانو باپ ترک اشتاق
خوش کی ذات علوی جانوں جس تھے نام رزاق

یعنی خوش کی ماں چغتائی اور باپ ترک تھے معلوم نہیں پھر خوش کو کس طرح علوی کہہ دیا۔ علوی انہیں کہتے ہیں جو حضرت علی کی اولاد ہوں لیکن حضرت فاطمہ کے بطن سے نہیں غالباً مندرجہ بالا شعر میں علوی لغوی معنی میں ہے یعنی اونچی ذات۔

بہر حال میراں جی کی والدہ اور میراں جی کی ساس، خسر ہندوستانی مغل تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تذکرۃ الانساب اور مجمع الانساب کا قول صحیح ہوکہ میراجی کا خاندان مغل تھا۔ حسینی شاہد سوال کرتے[2] ہیں کہ اگر ان کے والد مکی تھے تو پھر انہیں مغل کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ نام کے ساتھ مقام کی نسبت لازماً وطنیت کی دلیل نہیں۔ مرزا ابوطالب لندنی لندن کے باشندے نہ تھے اور حسین احمد مدنی مدینے کے رہنے والے نہ تھے۔ تقسیم ملک کے فوراً بعد ١٩٤٧ ع میں دلی کے ایک تاجر فیروز جاپان والا کا اخباروں میں چرچا تھا وہ جاپان کا باشندہ نہ تھا بلکہ جاپان کا بنا کوئی سامان بیچتا تھا۔

---

١ ایضاً ص ٨٢
٢ شاہ امین الدین علی اعلی ص ٦٩

حکومت ہند کے ایک بڑے افسر کا نام کے۔ ایل پنجابی تھا۔ وہ دراصل سندھی تھا پنجابی نہیں۔ ہوسکتا ہے حاجی دولت مکی حج کرنے کی وجہ سے مکی کہلاتے ہوں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ میراں جی والدہ کی طرف سے مغل تھے، خواہ والد کی طرف سے سید ہوں۔

خود نوشت کی صحت کے بارے میں دو حضرات نے شک کیا ہے مولوی عبدالحق نے سجاوت مرزا کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۳۰ جنوری ۵۶ع میں لکھا۔ 'یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ تحریر خود انہیں کی ہے۔ اس میں مجھے شبہ ہے'[1] دوسری طرف اکبرالدین صدیقی نے اپنے مرتبہ ارشاد نامے کے مقدمے میں لکھا

> «یہ خود نوشت نہیں معلوم ہوتی۔ ممکن ہے حضرت میراں جی نے معتقدین کے سامنے کبھی اپنے حالات بیان کیے ہوں جو سینہ بہ سینہ چلے آئے ہوں اور گیارھویں صدی ہجری میں کسی نے اس وقت لکھ دیے ہوں جب ان کی سیادت کا مسئلہ زیر بحث ہو»[2]

اب لیجیے میراں جی کے مولد کی بحث

عبدالجبار ملکاپوری نے تذکرہ محبوب ذی المنن میں انہیں دو شخصیتیں بناکر پیش کیا ہے ص۔ ۸۳۶ - ۸۳۵ پر میراں جی بیجاپوری کا ذکر ہے جو عرب سے آئے۔ ص ۹۹۲ - ۹۹۱ پر شاہ میراں جی شمس العشاق کا ذکر ہے جن کا مولد بیجاپور تھا اور یہ بعد میں حرمین گئے متعدد تذکرہ نگاروں نے انہیں بیجاپوری قرار دیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۷ع میں لکھا کہ میراں جی نے بیجاپور میں علوم ظاہری کی تکمیل شہر کے علماء و فضلا سے کی اس کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے (یعنی مکہ ان کا مولد نہیں تھا) لیکن اردو کی نشو و نما میں، مولوی صاحب نے اپنا موقف بدل دیا اور لکھا کہ وہ مکے میں پیدا ہوئے اور بعد میں ہندوستان آکر شاہ کمال سے بیعت ہوئے، رسالہ اردو

---

۱ خلیل قدوائی (مرتب)۔ مکتوبات عبدالحق، مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۹۶۳ع ص ۴۶۳ اس خط کی اطلاع مجھے ڈاکٹر حسینی شاہد کی کتاب سے ملی

۲ مقدمۂ ارشاد نامہ ص ۱۳-۱۲ قدیم اردو دور دوم جلد اول ۱۹۷۱ع عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد

اکتوبر ۱۹۳۹ ع[1] میں مولانا نے انہیں گجرات کا باشندہ قرار دیا ہے شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں لکھا ہے کہ آپ بیجاپور کے اولیائے کبار سے ہیں۔ مکاشفہ، حدیقۃ رحمانی، تذکرۃ القادری، مشکوۃ النبوۃ، انوار الاخیار، روضۃ الأولیا اور برکات الاولیا[2] سب میں یہی ہے کہ آپ طلب الٰہی کے غلبے سے حرمین شریفین گئے ان میں سے کسی میں صریحاً لکھا ہے کہ وہ بیجاپور سے حرمین گئے۔ ہاشم علی اطلاع دیتے ہیں کہ کتب خانۂ گنجینۂ محل بیجاپور کے ایک مخطوطے بیاض العملیات میں میراں جی کی جائے ولادت دہلی بتائی گئی ہے ہاشم علی مزید لکھتے ہیں کہ حدیقۃ الاصفیا[3] میں ان کا وطن مانڈو (مدھیہ پردیش) بتایا گیا ہے لیکن حسینی شاہد[4] نے واضح کیا کہ یہ ایک اور صوفی شاہ میاں جی کا ذکر ہے، شاہ میراں جی کا نہیں۔ یہ میاں جی بہ یک واسطہ شاہ بندہ نواز کے مرید تھے

محمود شیرانی لکھتے ہیں

"جو لوگ اپنی زبان کو گوجری یا گجری کہتے ہیں وہ درحقیقت گجرات سے تعلق رکھتے ہیں اگر دکن میں یہ اصطلاح کسی مصنف کے یہاں ملتی ہے تو ہم سمجھیں گے کہ مصنف گجرات کا باشندہ ہے اور اسی لیے اپنی زبان کو گجری کہہ رہا ہے۔ اگر شیخ برہان الدین جانم اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں تو اس سے یہ مقصد ہے کہ وہ اپنے آپ کو گجراتی الاصل تسلیم کرتے ہیں"[5]

---

۱ حسینی شاہد ص ۷۳ ہاشم علی مقدمۂ معر مرغوب ص ۲۲-۲۱ ہاشم علی نے رسالہ اردو کے شمارے کو اکتوبر ۳۹ ع کا لکھا ہے

۲ ہاشم علی مقدمہ ص ۱۳ حسینی شاہد ص ۸۰ - ۷۹

۳ مقدمہ ص ۱۲ بیر مفتی غلام سرور، حدیقۃ الاصفیا جلد اول ص ۴۰۱

۴ حسینی شاہد . ص ۶۲

۵ شیرانی : گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۰ ع، فروری ۱۹۳۱ ع بار طباعت مقالات شیرانی جلد اول ص ۱۸۳

ڈاکٹر زور نے ۱۹۵۸ع میں دکنی ادب کی تاریخ لکھی۔ وہ اس میں لکھتے ہیں کہ شمس العشاق اوائل عمر میں عربستان چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا مولد ہندوستان ہی تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں :

«بہرحال شمس العشاق کے متعلق اتنی بات مسلم ہے کہ علوم متد اولہ کی تکمیل کے بعد زیارت حرمین کو گئے»[۱]

سخاوت مرزا لکھتے ہیں :

«آپ کی تصانیف سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ کا تعلق غالباً احمد آباد، گجرات یا احمد نگر سے رہا.... پتا چلتا ہے کہ یہ بیجاپور کا نہایت ذی عزت امراء کا خاندان تھا۔ ممکن ہے کہ میراں جی نے امارت کو خیر باد کہہ دیا ہو»[۲]

میراں جی نے اپنی زبان کو گجری نہیں کہا لیکن جانم نے کہا ہے۔ حسینی شاہد قیاس کرتے ہیں۔[۳]

۱ شمس العشاق گجرات میں پیدا ہوئے ہونگے لیکن اس کی تردید حدود دوشت سے ہوجاتی ہے چونکہ خــود نوشت کے مطابق ان کی ماں ہندوستانی نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ گجرات کی ہوں۔

۲ ایک صورت مــیراں جی کی گجری زبان سے واقفیت کی یہ ہوسکتی ہے کہ بیجاپور میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے گجرات میں ان کا طویل قیام رہا ہو۔

۳ ممکن ہے جانم کی ماں کا وطن گجرات ہو۔ میراں جی نے بھنگار میں شادی کی

---

۱ علی گڑھ تاریخ ص ۲۰۹

۲ سخاوت مرزا : حضرت مــیراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال، اردو نامہ شمارہ ۳۰ ، جنوری ٦۸ ع، ص ۴۵

۳ شاہ امین الدین علی، ص ۴۸۵ - ۴۸۴

تھی۔ بھنگار وہ مقام ہے جس کے قریب احمد نظام شاہ نے اپنا پایۂ تخت تعمیر کیا تھا۔ احمد نگر اور احمد آباد کے درمیان خوشگوار تعلقات کی وجہ سے احمد نگر کی (جو مہاراشٹر میں ہے) زبان پر گجراتی کا اثر تھا۔

۴ شاہ کمال الدین بیابانی کا تعلق گجرات سے تھا۔ ان کی خانقاہ بھروچ میں تھی۔ میراں جی نے پیر کی زبان کا اثر قبول کیا ہوگا۔

ان بیانات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ میراں جی ہندوستان میں کسی مقام پر پیدا ہوئے بعد میں مکۂ حرمین گئے۔

اب آئیے میراں جی کی تاریخ وفات کی لاینحل بحث پر۔ اس کے لیے دو کاغذات اہم اور بنیادی ہیں۔ اول میراں جی کا مرثیہ، دوم میراں جی کی خودنوشت سوانح ان متضاد دستاویزوں کی صحت کا جائزہ لیا ہے۔

مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ ع[1] میں لکھا کہ شمس العشاق سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے جو ۹۰۲ھ ہوتی ہے۔ یہ مادۂ تاریخ حسین شاہ ذوقی کا کہا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی مزید تائید میں لکھا کہ انھیں ایک پرانا مرثیہ ملا ہے جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں اور جس سے میراں جی کی تاریخ وفات ۲۵ شوال ۹۰۲ھ معلوم ہوتی ہے۔ عبدالحق نے ایک مصرع کے دو دو مصرعے بناکر ہر شعر کو مربع کا ایک بند بنادیا۔ انھیں جوڑ کر تاریخ سے متعلق اشعار یوں بنتے ہیں۔

تاریخ حضرت سو سو اس پر اگلے تھی دو
دو دین مدت وفا شو جے کچھ حکم الہی کا

اربع سوں یو سال ہے، ماہے کوں شوال ہے
رحلت کیے اس حال ہے جے کچھ حکم الہی کا

---

۱ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق، رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ع اور طباعت قدیم اردو، ص ۷، کراچی ۱۹۶۱ ع

تاریخ بست و پنج بود سیار گسریاں رفج بود
دو سال واصل گنج خوہ ہے کچھ حکم الہی کا
شب پنج شبہ روشن کیا ہجرت منوّر پور کیا
جیوڑا قبض کر اُن لیا ہے کچھ حکم الہی کا

ظاہراً اس مرثیے کی بحر رجز مثمن سالم یعنی مستفعلن چار بار ہے لیکن ردیف اس سے الگ جاری ہے۔ اگر اس میں حکم کو بہ حرکت ک اور الہی کو بہ تشدید لام پڑھیں تو یہ جزو بھی موزوں ہوسکتا ہے۔ ہے کچھ حکم مستفعلن۔ الہٰ لا ہی کا مستفعلن، اس سے بہتر تو یہ تھا کہ ہے کچھ الہی کا حکم (بہ فتح ک) کہا جاتا۔ اس طرح کم از کم لفظ الہی کی شکست و ریخت تو نہ ہوتی اشعار کے دوسرے اجزا میں بھی کہیں کہیں سکتہ آجاتا ہے

اس مرثیے سے مولوی عبدالحق نے نتیجہ نکالا کہ میراں جی کا انتقال ۲۵ شوال ۹۰۲ھ کو ہوا۔ مولوی عبدالحق نے شاہ حسین ذوقی کا وہ شعر نہیں دیا جس میں «شمس العشاق» کو ان کی وفات کا مادہ کہا ہوگا۔ لیکن قیاس ہے کہ یہ لقب میراں جی کی زندگی میں مشہور ہوگیا ہوگا۔ شاہ حسین ذوقی نے سب رس کا منظوم ترجمہ وصال العاشقین کے نام سے ۱۱۰۹ھ میں کیا اس سے ذوقی کے زمانے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان سے بہت پہلے یہ لقب سننے میں آتا ہے۔ برہان الدین جانم ارشاد نامے میں کہتے ہیں۔

پیر میراں جی شمس عشاق[1]

شیخ محمود خوش دہاں، خلیفۂ شاہ برہان الدین جانم نے معرفت السلوک میں اپنا سلسلۂ بیعت لکھتے ہوئے ان کا نام (حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق) لکھا ہے۔ ان کے علاوہ شاہ امین الدین اعلی کے تربیت یافتہ معظم بیجاپوری نے اپنی مثنوی شجرۃ الاتقیا میں لکھا ہے۔

میراں جی تھا نام ان کا اول	لقب شمس عشاق کا کر اصل

---

۱ ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڈھ تاریخ میں ص ۲۲۳ پر اس مصرع میں شمس العشاق لکھا ہے لیکن اکبر علی صدیقی کے مرتبہ ارشاد نامے میں شمس عشاق ہے۔

شاہ امین الدین اعلی کے پوتے سید علی پیر کی مثنوی سراج العشق میں ہے۔

نبی گمتا خدا ہست ار تو مشتاق   کہ برخیز اے میراں جی شمس العشاق

اور ان علی پیر کے مرید حالی کی مثنوی شرح موٹیہ یا تذکرۂ موٹیہ میں حضرت علی کہتے ہیں۔

گفت حیدر اے شمس عشاق آمدم
ہرچہ تو خواہی بگو آں می دہم

یہ ممکن ہے کہ شمس العشاق ان کی ولادت پر رکھا ہوا تاریخی نام ہو جس سے ۹۰۲ھ نکلتا ہے ڈاکٹر زور نے ارشاد نامۂ جانم کا متن چھپوا دیا تھا۔ مقدمہ حروفاً چھپا تھا لیکن یہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ اس مقدمے کو ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر حسینی شاہد اور اکبر الدین صدیقی نے دیکھا ہے ڈاکٹر زور نے مقدمے میں مولوی عبد الحق کی طے شدہ ۹۰۲ھ تاریخ وفات کا تجزیہ کیا اور اس کے پرخچے اڑا دیے۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے[1]

۱ مرثیہ نامعلوم شخص کا ہے۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ میراں جی کی وفات سے متعلق ہے۔

۲ عبد الجبار ملکاپوری کے تذکرۂ اولیائے دکن میں ص ۸۳۶ پر میراں جی کا سنہ وفات ۸۴۰ھ درج ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۳ تذکرے متفق ہیں کہ میراں جی علی عادل شاہ کے عہد حکومت میں بیجاپور تشریف لائے۔ علی عادل شاہ کا عہد حکومت ۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ ہے۔ تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میراں جی بیجاپور میں مقیم ہونے کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے۔

۴ تمام تذکرے اس پر متفق ہیں کہ عرب سے واپسی پر حضرت نے بیجاپور کے حصار کے باہر قیام کیا۔ قلعہ ۹۱۸ھ میں تعمیر ہوا۔

۵ مولوی عبد الحق نے خود تسلیم کیا ہے کہ شاہ برہان الدین جانم کا ایک رسالہ ۹۹۰ھ کی تصنیف ہے اور انھوں نے اسی سال[2] انتقال کیا۔ جانم اپنے والد

---

۱ بحوالۂ حسینی شاہد ۔ سید شاہ امین الدین علی اعلی ص ۷۶ تا ۹۰

۲ قدیم اردو ص ۲۵، حسینی شاہد کی تحقیق کے مطابق شاہ جانم ۱۰۰۷ھ میں فوت ہوئے ملاحظہ ہو کتاب ص ۱۱۴

میراں جی کے نہ صرف خلیفہ تھے بلکہ اس وقت سلوک و عرفان کے مسائل بھی بخوبی سمجھتے تھے۔ اگر والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۰ سال فرض کی جائے تو ۹۹۰ھ میں ۱۰۸ سال کے ہونگے۔ یہ بھی مسلمہ ہے کہ ان کے انتقال کے وقت ان کی بیوی حاملہ تھیں اور شاہ امین الدین علی اعلی والد کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے۔ ۱۰۸ سال کی عمر میں توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رکھنا سمجھ میں نہیں آتا جب کہ یہ معلوم ہے کہ اس سے پہلے جانم کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

غرض ان کی تاریخ وفات ۹۷۰ھ ماہی ہوگی۔ شمس العشاق مادۂ تاریخ پیدائش ہوگا جو ان کی زندگی میں مشہور ہوگیا جس کو حسینی ذوقی اور عبدالحق نے تاریخ وفات سمجھ لیا

ڈاکٹر زور کے دلائل کا خلاصہ ختم ہوا۔ ادھر سخاوت مرزا نے مولوی عبدالحق سے خط و کتابت کی بساتین السلاطین مولفہ علام مرتضی مطبوعہ میں شاہ میراں جی کے ورودِ بیجاپور کا ذکر نہیں لیکن سخاوت مرزا کے پاس اس کتاب کا ایسا قلمی نسخہ ہے جس میں عادل شاہ اول کے عہد کے اہم واقعات کے ضمن میں لکھا ہے کہ

> ورودِ میراں جی صاحب در سنہ نہ شت شصت و شش۔ بناء شاہ پور متصلِ بیجاپور در سنہ نو صد و شصت و ہفت»[1]

گویا شاہ پور جہاں میراں جی کا مقبرہ ہے ۹٦۷ع میں آباد ہوا

ڈاکٹر زور کے اعتراضات اور سخاوت مرزا کے دلائل کے بعد مولوی عبدالحق نے مان لیا

«موجودہ حالات میں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ یہ تسلیم

---

۱ بساطین السلاطین قلمی ص ۸۵ بحوالۂ سخاوت مرزا۔ حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال ، اردو نامہ شمارہ ۳۰ جنوری ۱۹٦۸ع ص ۴۱ اس مضمون کی نشاندھی حسینی شاھد ص ۹۰ سے ہوئی

کرلیا جائے کہ میراں جی علی عادل شاہ اول کے عہد میں آئے۔
آپ کے قلمی نسخے بساتین السلاطین کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے
کہ وہ ۹۶۶ھ میں وارد بیجاپور ہوئے اور اس لحاظ سے ۹۷۰ھ
ان کا سنہ وفات ہوگا "[1]

سخاوت مرزا نے اردو نامہ جنوری ۱۹۶۸ع میں اپنے مضمون "حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال" میں بھی یہ دلائل دہرائے ڈاکٹر زور کے اعتراضات کو دیکھ کر ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی ان کی تائید کی۔

۱۹۶۱ع میں اکبر الدین صدیقی نے خانم کی کلمۃ الحقائق شائع کی اس وقت تک انہیں ڈاکٹر زور کے اعتراضات کا علم نہ ہوگا۔ انہوں نے اس کے مقدمے میں مرثیے کے ۱۹ اشعار درج کیے اس میں انہوں نے پھر ۲۵ شوال ۹۰۲ھ کو تاریخ وفات قرار دیا اور یہ بھی انکشاف کیا کہ یہ مرثیہ میراں جی شمس العشاق کا ہے اور اسے ان کے بیٹے خانم نے لکھا ہے۔ میراں جی کا نام ان دو اشعار میں ہے

شاہ میراں جی جگ رتن[2]، سو ہے رتن منج دل کنول
لینا چھینا اپنی اذن، جے کچ حکم الٰہی کا
سو ہی میراں منج پیر ہے، اس زور کا دستگیر ہے
تج ان میں بے سیر[3] ہے، جے کچھ حکم الٰہی کا

مرثیے کا مصنف میراں جی کا بیٹا ہے یہ ذیل کے اشعار سے مترشح ہوتا ہے

دنیاں کا منج پدر اہے اور دین منج لشکر اہے
اس دکھ کا منج عذر اہے، جے کچھ حکم الٰہی کا

۱　مکتوب بنام سخاوت مرزا ص ۴۶۷، مکتوبات عبدالحق مرتبۂ خلیل قدوائی
۲　سیدھے چراغ میں اس مصرع میں (جگ رتن) کے بجائے (چمک رتن) ہے۔ چمک کے معنی ہیں آنکھ۔ سیدھے چراغ ص ۳۸
۳　سیدھے چراغ میں (تج ان میں بے سیر ہے) لکھا ہے (بے سیر) کے معنی بے سہارا لکھے ہیں۔ ص ۳۹

وہاں تھے منج واصل کیا اور دین مہح حاصل کیا
ما حق مہح واصل کیا، حے کچھ حکم الٰہی کا

اس میں دو حگہ مںور پور اور شاہ پور کا ذکر ہے۔

ع شب پنح شمعہ روشن کیا، ھحرت مںور پور کیا

ع روضہ مںور پور ہے، مقام تج شہہ پور ہے

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ میراں حی شمس العشاق ہی کے مارے میں ہے کسی دوسرے میراں حی کے نہیں

میراں حی کے تین یا اس سے زیادہ بیٹے تھے ان میں سب سے بڑے برھان الدین حانم تھے۔ دوسرے بیٹوں کے بارے میں علم نہیں کہ وہ اردو میں شعر کہتے تھے یا نہیں۔ اکبر الدین صدیقی نے حانم کو اس مرثیے کا مصنف مانا ہے حو درست معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم علی نے ۱۹٦۲ع میں میراں جی کے منظوم رسالے مغز مرغوب و چہار شہادت شائع کیے۔ اس کے مقدمے میں انھوں نے میراں حی کی ولادت و وفات کی تفصیلی بحث کی۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو حولائی ۱۹۲۷ع میں اور اکبر الدین صدیقی نے مقدمۂ کلمۃ الحقائق ۱۹٦۱ع میں مرثیے کے ایک مصرع کا متن یوں لکھا تھا۔

ع اربع سوں یو سال ہے ماہے کوں شوال ہے

ہاشم علی کو کتب خانۂ گنجی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں اس مرثیے کے پانچ اشعار ملے جس میں مندرجہ بالا مصرع یوں تھا

ع اربع تسوں یو سال ہے ماہ کوں شوال ہے

ہاشم علی نے طے کیا کہ یہ 'اربع تسعوں' یعنی[1] ۹۴ ہے یعنی وفات کے وقت

[1] مقدمۂ مغز مرغوب و چہار شہادت، ص ۱۵

حضرت کی عمر ۹۴ سال تھی انھوں نے کہا کہ تاریخ کے مصرع کو ذیل کے حضرات نے یوں لکھا ہے۔

عبدالحق تاریخ حضرت سال نو سو، اس پر اگلے بھی دو

اکبرالدین صدیقی تاریخ حضرت سال نو سو " (واوین) اس پر اگلے بھی دو

ہاشم علی کے مطابق دونوں جگہ دو (دال واو) ہے اور مصرع یوں ہے

تاریخ حضرت سال نو سو دو، اس پر اگلے بھی دو[1]

۹۰۲ + ۲

یعنی ۹۰۴ ہے اس طرح میراں جی کا انتقال ۲۵ شوال ۹۰۴ھ شب پنج شنبہ یعنی چہار شنبہ کو ہوا ہاشم علی نے ان کی تاریخ پیدایش کے دو[2] مادے لکھے گچی محل بیجاپور کے کتب خانے میں ایک مخطوطہ "بیاض العملیات" ہے جس میں مادہ "شمس الشموس" لکھا ہے درگاہ حضرت شاہ امین الدین علی اعلی بیجاپور کی ایک

۸۳۷ھ بیاض میں مادہ میر میراں قبلۂ دین پناہ

۸۱۰ھ

درج ہے ہاشم علی اسی کو صحیح مانتے ہیں اگر ۹۰۴ھ میں ۹۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا تو سنہ پیدایش ۸۱۰ھ ہونا چاہیے جو مندرجہ بالا مادے کے مطابق ہے اب باقی رہا ڈاکٹر زور کا اعتراض کہ اگر برہان الدین جانم کا انتقال ۱۰۸ سال کی عمر میں ہوا تو اس وقت توالد و تناسل کا سلسلہ کیونکر ممکن تھا ہاشم علی لکھتے ہیں کہ گچی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں حضرت جانم کی وفات کا مادہ "برہان گوشہ نشین" درج ہے جس سے ۹۹۹ھ نکلتے ہیں اس طرح انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۱۸ سال ہونی چاہیے "حدوارق حیدری" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ غواصی کے مرشد سید شاہ حیدر ولی متوفی ۱۰۸۴ھ کے ۱۲۰ سال کی عمر میں اولاد ہوئی۔ اگر ان کے ۱۲۰ سال کی عمر میں ہوسکتی ہے تو جانم کے ۱۰۸ یا ۱۱۸ سال کی عمر میں کیوں نہیں ہوسکتی[3]

---

۱ مقدمۂ مغز مرغوب و چہار شہادت ص ۲۸

۲ ایضاً ص ۱۵ ۳ ایضاً ص ۲۳

آخر الذکر دلیل کے بارے میں حسینی شاہد لکھتے ہیں۔

«خوارق حیدری اسم با مسمیٰ ہے اس میں بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جن کو تسلیم کرنا مشکل ہے اس لیے اس بیان کو بھی کسی مزید ثبوت کے بغیر تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ حیدر ولی نے سو سال کی عمر میں شادی کی، ۱۲۰ سال کی عمر میں صاحب اولاد ہوئے اور ۱۵۰ سال کی عمر میں انتقال کیا»[1]

اکبر الدین صدیقی نے کھوج جاری رکھی اور پھر سے تین بار اس مرثیے کے بارے میں لکھا۔

۱ مضمون کتبۂ امین درگاہ بیجاپور، اردو نامہ اپریل تا جون ۶۸ ع

۲ مرثیۂ حضرت برہان الدین جانم، سب رس حیدر آباد، اپریل ۶۸ ع بار طباعت بجھتے چراغ حیدر آباد نومبر ۷۵ ع

۳ ارشاد نامہ از جانم مرتبۂ اکبر الدین صدیقی حیدر آباد ۱۹۷۱ ع

ارشاد نامے کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ نسخے پر اربع تسعون کے اوپر کسی نے اربع تسعون لکھا ہے کسی دوسرے شخص نے دوسرے خط میں لکھا ہے

۹۰۴ ھ تاریخ ۲۵ شوال المکرم شب پنج شنبہ[2]

مرثیے کا پورا متن سب رس اپریل ۶۸ ع میں چھپا ہے۔ اسی کو دوبارہ ان کے مجموعے (بجھتے چراغ) میں چھاپا گیا اس میں (ماہے کون شوال ہے) کا دوسرا نسخہ (ماہے کہوں شوال ہے) فٹ نوٹ میں دیا ہے اور ورن کے پیش نظر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ پورے مرثیے میں نو بند ہیں۔ ہر بند میں بحر رجز مثمن سالم میں پانچ شعر ہیں۔ اس کے بعد دوہے کے عنوان سے ظاہراً دو دوہے ہیں لیکن یہ کاتب کا سہو ہے۔ در اصل ان دو مبینہ دوہوں میں پہلا شعر اسی

۱ سید شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۹۳

۲ مقدمۂ ارشاد نامہ مرتبۂ اکبر الدین صدیقی ص ۱۷

اردو وزن بحر سالم میں ہے۔ دوسرا شعر ہندی کا دوہا ہے۔ اس طرح ہر بند میں پانچ شعر قطعہ بند، ان کے بعد ایک ٹیپ کا شعر اور ایک دوہا ہے۔ اس نظم کو ترکیب بند کہیں گے۔ آخری بند کے بعد ٹیپ کا شعر اور دوہا نہیں شاعر نے ضرور لکھے ہونگے لیکن وہ تلف ہوگئے۔ بہ صورت موجودہ آٹھ بند ایسے ہیں جن میں چھ شعر اور ایک دوہا ہے۔ آخری بند میں محض پانچ شعر ہیں یعنی جملہ ۵۳ شعر اور آٹھ دوہے ہیں۔ مرثیے کی ابتدا اس مصرع سے ہوتی ہے

شاہِ میراں جی جگ رتن سوہے رتن مج دل کمدن

ایک بند میں ایک مصرع ہے

تیوں تو مجے تھا یشق شہہ میراں جی چیشق
جیوں بحر ماں تو کیشق

اردو نامے کے مضمون میں سخاوت مرزا نے کہا تھا کہ بساتین السلاطین قلمی کے مطابق شاہ پور ۹۶۷ھ میں بسایا گیا ادھر دیوی سنگھ چوہان نے اپنے مضمون کلمۃ الحقائق کا لسانیاتی مطالعہ میں لکھا:

"محمد قاسم ہندو شاہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ علی عادل شاہ اول نے اپنی تخت نشینی کی یاد میں قصبۂ شاہ پور کی بنیاد رکھی تھی (دیکھیے ترجمۂ برگز حصہ سوم ص ۱۱۶) اس سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ پور کا وجود ۹۶۸ ہجری کے قبل ممکن ہی نہیں تھا۔ جب خود شاہ میراں جی نے شاہ پور کا ذکر کیا ہے تو یہ ان کے سنہ ۹۶۸ھ کے لگ بھگ زندہ ہونے کی دلیل ہے"[1]

اکبر الدین صدیقی مرثیے والے مضمون میں کہتے ہیں کہ یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ م ۱۴۹۰ء میں عادل شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت شاہ پور کا علاقہ آباد تھا۔ یہاں کشور خاں کا باغ بھی تھا جو بہمنی سلطنت کا ایک سردار تھا۔

۱ دیوی سنگھ چوہان: کلمۃ الحقائق کا لسانیاتی مطالعہ، نوائے ادب جولائی ۱۹۶۸ء ص ۲۹ - ۲۸

شاہ پور کی بنیاد ڈالنے یا آباد کرنے کا جو ذکر ملتا ہے یہ ممکن ہے کہ شاہ پور ہی سے متصل کوئی دوسرا علاقہ ہو [1]

یہ اکبر الدین صدیقی کا قیاس محض ہے ۔ بساتین السلاطین اور تاریخ فرشتہ کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی دستاویزی ثبوت نہیں کہ شاہ پور ۹٦۷ ھ سے پہلے آباد ہوگیا تھا

دوسرا مسئلہ خانم کی عمر کا ہے ۔ اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں کہ گنجی محل کی بیاض میں خانم کی وفات کا مادۂ تاریخ «عزیز جان چشتیان خانم» دیا ہے جس سے ۱۰۰٦ ھ برآمد ہوتا ہے یہی سال امین الدین اعلیٰ کی ولادت کا ہوگا ۔ اگر میراں جی کی وفات ۹۰۴ ھ کے وقت خانم کی عمر ۱۸ تا ۲۰ سال ہو تو حضرت امین کے شکم مادر میں نزول کے وقت خانم کی عمر ۱۲۰ یا ۱۲۲ سال ہوگی صدیقی صاحب نے اردو نامہ میں اس مشکل کو یہ کہکر رد کردیا

«اس عمر میں توالد و تناسل کا سوال پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ہماری بحث سے خارج ہے» [2]

سب رس اپریل ۱۹٦۸ع میں مرثیے والے مضمون میں اور زیادہ مسرے کی بات کہی ہے

«اس عمر میں توالد وتناسل کا سوال پیدا ہوتا ہے اس کے لئے ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے خدا کی باتیں خدا ہی جانے میں نے ایک مثنوی میں حضرت امین الدین اعلیٰ کے بارے میں پڑھا ہے کہ آپ بارہ سال تک ماں کے پیٹ میں رہے اور اس کے بعد ولادت ہوئی» [3]

اگر آپ ۱۲ سال شکم مادر میں رہے تو حمل ۹۹۵ ھ میں قائم ہوا ہوگا

---

۱ سب رس اپریل ٦۸ع ص ۲۱

۲ اردو نامہ اپریل تا جون ٦۸ع ص ۴۷

۳ سب رس اپریل ٦۸ع ص ۲۵

جس وقت حاتم کی عمر تقریباً ۱۱۱ سال رہی ہوگی اولیا کی کرامات کے سامنے ہم سے کیا کیا مطالبات کیے جارہے ہیں کہ والد صاحب تقریباً ۱۲۰ سال کی عمر میں تناسل کرتے ہیں اور فرزندِ محترم ۱۲ سال شکم مادر میں قیام کرتے ہیں ان مفروضوں کے لئے جس ایمان و عقیدہ کی ضرورت ہے راقم السطور اس سے محروم ہے

حیرت ہے کہ اس اہم نکتے سے کیونکر صرف نظر کیا جاسکتا ہے۔ اول تو یہ بعید از امکان ہے کہ مرد میں ۱۲۰ سال کی عمر میں تناسل کی صلاحیت باقی رہ سکتی ہے دوسرے یہ کہ کیا ایک خدا رسیدہ درویش کو ۱۲۰ سال کی عمر میں اس شغل کا شوق رہا ہوگا؟ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ توالد کے لیے دو فریقوں کی ضرورت ہوتی ہے مرد میں یہ صلاحیت کافی عمر تک رہ سکتی ہے لیکن اناث میں ماہواری کا سلسلہ بند ہونے کے بعد یہ ممکن نہیں رہتا کیونکہ اس کے بعد ان کے اندر بیضہ موجود نہیں رہتا یہ سلسلہ ۴۵ سے ۴۸ سال کی عمر کے قریب ختم ہوجاتا ہے یہ کہیں نہیں لکھا کہ حضرت حاتم نے بہت بڑی عمر میں کسی کم سن لڑکی سے عقد ثانی کیا تھا۔

حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ ۹۰۲ھ کو سنہ پیدائش تسلیم کرنے سے کمال الدین بیابانی سے ان کی بیعت اور ملاقات معرضِ بحث میں پڑجاتی ہے خود نوشت کے مطابق وہ ۲۲ برس کی عمر میں حرمین شریفین کی زیارت کو گئے سوا بارہ سال مدینے میں رہے۔ اس کے بعد ہندوستان آئے اس طرح یہاں آنے کے وقت ان کی عمر ۳۵ سال ہونی چاہیے اگر وہ ۹۰۲ھ میں پیدا ہوئے تو تقریباً ۹۳۷ھ میں ہندوستان پہنچے کمال الدین بیابانی کا سنہ وفات متفقہ طور پر معلوم نہیں لیکن گچھی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں ان کا مادۂ تاریخ وفات

ع کمال الدین بیابانی جنت یافا

۸۸۱ھ

دستیاب ہوا ہے اس سنہ میں میراں جی کا ان سے بیعت کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا ۹۰۷ھ کو میراں جی کا سنہ وفات تسلیم کرنے میں قباحت یہ ہے کہ اس

دن ۲۵ شوال کو پنج شنبہ تھا جب کہ مرثیے کے مطابق ان کا انتقال پنج شنبہ کو نہیں شبِ پنج شنبہ کو ہوا تھا۔

حسینی شاہد اس مصرع کی طرف توجہ دلاتے ہیں

تاریخ حضرت سال دو سو اس پر اگلے بھی دو

کہتے ہیں کہ اس کے معنی دو سو کے ساتھ ۲ اور ۲ یعنی ۲۲ کے عدد کے ہیں[1] اور یہ مصرع ۹۲۲ ھ کی طرف اشارہ کرتا ہے حضرت کے معنی نہ پیدائش کے ہیں نہ رحلت کے بلکہ (حاضر ہونے کے) مصرع یہ بیان کرتا ہے کہ شاہ میراں جی کے ہندوستان میں آکر شاہ کمال کے حضور حاضر ہونے کی تاریخ ۹۲۲ ھ ہے اگر وہ ۹۲۲ ھ میں ۳۵ سال کے تھے تو ۸۸۷ ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر انھوں نے ۹۴ سال کی عمر میں انتقال کیا تو ان کا سنہ وفات ۸۸۷ + ۹۴ یعنی ۹۸۱ ھ ہوگا اس سال ۲۵ شوال کو چہار شنبہ کا دن تھا۔

حسینی شاہد کہتے ہیں اس طرح حاتم کی عمر کو غیر ضروری طول دینے کی ضرورت نہیں ساتھ ہی خود نوشت کی تفصیلات اس سے میل کھاتی ہیں اور ان کا ورودِ بیجاپور علی عادل شاہ اول کے عہد میں ثابت ہوتا ہے لیکن کمال الدین بیابانی سے بیعت کا مسئلہ ٹیڑھا ہے

ڈاکٹر حسینی شاہد نے ۹۰۲ ھ کو میراں جی کا سنہ پیدائش تسلیم کرنے پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس سے کمال الدین بیابانی سے بیعت معرضِ بحث میں پڑ جاتی ہے کیونکہ ایک خاص کے مادۂ تاریخ کے مطابق بیابانی کا انتقال ۸۸۱ ھ[2] میں ہوا۔

لیکن ۹۲۲ ھ میں بیعت قرار دینے کے وقت وہ اس اعتراض کو بھول جاتے

۱ سید شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۹۷، ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنا نظریہ کتاب کے ص ۹۱ سے ص ۹۷ تک میں بیان کیا ہے

۲ شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۹۲

ہیں اور کمال الدین بیابانی کی عمر کو ربڑ کی طرح کھینچنا شروع کرتے ہیں لکھتے ہیں مولوی علیم الدین کی بیاض کے مطابق شاہ کمال کے پیر شاہ جمال ۸۱۹ ھ میں فوت ہوئے ۔ اگر شاہ کمال نے ان سے ۲۰ سال کی عمر میں بیعت کی ہو تو ان کی تاریخ پیدائش تقریباً ۸۰۰ھ ہوئی۔ اگر میراں جی نے ان سے ۹۲۲ ھ میں بیعت کی تو اس وقت شاہ کمال کی عمر ۱۲۲ سال ہوئی قدما میں یہ عمر حیرت انگیز نہیں

سر کے پیچھے سے ہاتھ گھماکر ناک پکڑنے کی یہ اچھی مثال ہے ۔ انہیں بیاضوں میں کمال الدین بیابانی کے یہ مادۂ تاریخ وفات ملے

کمال الدین بیابانی حدا پایا

۸۸۱ ھ

کمال الکا ملیں فرلت گریں[1]

۸۶۷ ھ

حسینی شاہد نے ص ۹۷ پر (کمال الدین حدا پایا) مادہ لکھ کر ۸۸۱ ھ لکھا ہے جو سہو کتابت ہونا چاہیے کیونکہ اس سے محض ۸۰۵ھ نکلتا ہے ۔ کمال الدین بیابانی حدا پایا (ص ۹۲) سے ۸۸۱ ھ نکلتا ہے حسینی شاہد کمال بیابانی کی وفات کو ان مادوں سے مستخرج نہیں کرتے کیونکہ ان سے بیعت کا سوال کھٹائی میں پڑجاتا وہ شاہ جمال کے انتقال سے شاہ کمال کے انتقال کا قیاس کرنا چاہتے ہیں انہیں مان لینا چاہیے کہ ۹۲۲ ھ میں شاہ میراں جی کی بیعت شاہ کمال سے نہیں ہوسکتی

(حضرت) کے معنی (حاضر ہونا) کب سے ہوگئے؟ حضرت کے معنی (حضرت میراں جی) کیوں نہیں۔ (تاریخ حضرت) کے معنی پیر کے پاس حاضر ہونا اور اس سے بیعت کرنا محض ایجاد بندہ ہیں نوسو دو ، اس پر اگلے نہی دو کے معنی ۹۲۲ نہیں ہوسکتے ان کے طریق سے ۹۰۲۲ ہونگے کیونکہ ۹۰۲ کے ساتھ

---

۱ ایضاً ص ۹۷ - ۹۲

۲ کے عدد کا اضافہ ہے۔

مرثیہ ہو یا خود نوشت یا مختلف بیاضوں میں دیے ہوئے مادۂ ہائے تاریخ، ان میں سے کسی کو غیر ضروری اہمیت نہیں دینی چاہیے کیونکہ ان میں ایک دوسرے کے متناقض بیانات ملتے ہیں حسینی شاہد کو گنجی محل بیجاپور اور ذخیرۂ مولوی علیم الدین تاجر کتب حیدر آباد کی مجهول الاسم، غیر مصدقہ بیاضوں[1] سے مختلف مادے ملے۔ ہاشم علی کو بھی کچھ مادے ملے۔ ان کا اختلاف ملاحظہ ہو

۱ وفاتِ جمال الدین مغربی (مرشدِ شاہ کمال بیابانی)

ابھے سات ہو اسی چھ برس زمانے ستی گم ہوا ہو برس

۷۸۶ ھ

دھم ماہ رجب وفات حضرت مغربی قدس اللہ سرہ شب جمعہ ۷۸۶ ھجری
(انجمن کی تقویم کے مطابق ۱۰ رجب کو اتوار کا دن تھا

جمال بخدا واصل

۸۰۸ ھ

ابداللہ فی جنان مثواہ

۸۱۹ ھ

زاہد پاک جمال چشتی

۸۲۷ ھ

۲ وفاتِ کمال الدین بیابانی

کمال الکا ملین عرفات گزین ۸۶۷ ھ

کمال الدین بیابانی خدا پایا ۸۸۱ ھ

۳ ولادتِ حاجی شریف دوام الدین

شمعِ منور

---

۴ ایضاً ص ۹۷ فٹ نوٹ

حسینی شاھد نے ص ۹۸ پر یہ تاریخ دے کر اس کے نیچے ۷۰۶ ھ لکھا ہے در اصل ۶۴۳ ھ نکلتا ہے

وفات حاجی شریف دوام الدین

حاجی دوام دین شد
۸۸۱ ھ

مندرجہ بالا تاریخیں حسینی شاھد کی کتاب کے ص ۹۸ سے لی گئی ہیں ۔

۴ ولادت شاہ میراں جی

کتب خانہ امین درگاہ کی بیاض کے مطابق

میر میراں قبلۂ دین پناہ ۸۱۰ ھ

گچی محل کی بیاض العلمیات کے مطابق (شمس الشموس)
۸۲۷ ھ

وفات شاہ میراں جی شمس منور پور (حسینی شاہد ص ۹۸)
۹۰۴ ھ

مرقدِ ولیِ شاہ پور (مقدمۂ ارشاد نامہ اکبر الدین صدیقی ص ۲۳)
۹۰۴ ھ

ہاشم علی نے معر مرغوب و چہار شہادت کے مقدمے میں لکھا ہے کہ حریقۃ الاصفیا میں میراں جی کا سنہ وفات ۸۹۹ ھ دیا ہے جو ذیل کے قطعے سے نکلتا ہے

مسیر ب جی شاہ شہنشاہ عالی — چو رفت از دار دنیا سوئے جنت
رقم کن کاشف مختار سالش — وگر فرماں دہی بدرِ کرامات

اس میں (کاشف مختار) مادہ ہے اس سے ۸۹۹ ھ نہیں ۸۸۹ ھ نکلتا ہے (بدرِ کرامات) سے ۸۶۷ ھ اور (فرماں دہی بدرِ کرامات) سے ۱۲۳۷ ھ برآمد ہوتا ہے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ[1] نے اس قطعے کا پہلا مصرع یوں لکھا

میاں جی شاہ شہنشاہ عالی

---

۱ اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص ۱۲۹

اب اس کا وزن صحیح ہوا۔ انھوں نے بندہ نواز کے مرید شاہ میاں چشتی مانڈو والے کو شاہ میراں جی سمجھ لیا تھا انھیں کے سلسلے میں یہ قطعہ لکھا ہے اس کے معنی یہ ہے کہ یہ میاں جی کا قطعۂ تاریخ وفات ہے میراں جی شمس العشاق کا نہیں

۵ وفات ِ ایلیۂ شاہ میراں جی
خواب گاہ ِ حرم پاک
۹۰٦ھ (مقدمۂ ارشاد نامہ مرتبۂ اکبر الدین صدیقی ص ۲۳)

یہی کیفیت شاہ برہان الدین جانم اور شاہ امین الدین اعلیٰ سے متعلق مادوں کی ہے۔ مندرجہ بالا مادوں میں بہتوں میں متعلقہ صوفی کا نام نہیں۔ بہتوں میں یہ مذکور نہیں کہ یہ کس واقعے کی تاریخ ہے ولادت کی؟ وفات کی؟ یا زندگی کے کسی اور واقعے کی؟ دکن اور گجرات کے صوفیا میں (میراں) عام لقب ہے۔ کیا معلوم کس میراں جی کی تاریخ ہے جب تک بیاضوں کے اندراجات کو دیکھ کر ان کا پایۂ استناد طے نہ ہو کیونکر کہا جائے کہ کسی کم سواد نے غلط حساب کرکے غلط مادہ تو نہیں لکھ دیا بہتر یہ ہے کہ ان مادوں اور تاریخوں کو نظر انداز کرکے خود نوشت اور مرثیے پر مرکوز رہا جائے۔ خود نوشت کے تعلق سے ذیل کے سوالات ابھرتے ہیں

۱ شاہ میراں جی سے حضرت علی تک محض ۱۷ واسطے دیے ہیں جیسا کہ پیچھے لکھا گیا فصل زمانی کو دیکھتے ہوئے یہ کم ہیں

۲ شاہ میراں جی کے والد مکہ سے چل کر ہندوستان آئے اور ایک مغل لڑکی سے شادی کرکے واپس ہوگئے شاہ میراں جی کی سسرال بھی مغل تھی کیا وہ سید نہ تھے؟ کیا یہ خود نوشت بعد میں کسی معتقد نے ان کی سیادت ثابت کرنے کے لیے لکھ دی ہے؟

۳ ان کی جائے ولادت مکہ ظاہر کی گئی ہے لیکن بیشتر تذکروں سے ان کا مقام بیجاپور معلوم ہوتا ہے نیز یہ کہ ان کا خاندان گجرات سے آکر بیجاپور میں بسا تھا اس سلسلے میں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ شاہ میراں جی نے کوئی کتاب عربی میں نہیں لکھی

۴ خود نوشت کے بیان کے مطابق یہ پہلے شاہ کمال بیابانی سے ملے، اس کے بعد شادی کی اور دونوں بیجاپور آئے ۔ معظم بیجاپوری کی مثنوی شجرۃ الاتقیا کے مطابق رسول نے خواب میں بشارت دی کہ تم بیجاپور میں شاہ پور جاکر شاہ کمال سے ملو چنانچہ وہ شاہ کمال سے شاہ پور میں ملے ۔ سید علی پیر نے مثنوی سراج العشق میں لکھا ہے کہ وہ پہلے شاہ کمال سے ملے ، بعد میں شاہ پور آئے

۵ خود نوشت کے مطابق وہ علی عادل شاہ کے عہد (۹۶۵ ھ تا ۹۸۸ ھ) میں بیجاپور آئے ۔ اس سے پہلے کی طویل مدت انھوں نے کہاں بتائی ، خودنوشت اس کے بارے میں خاموش ہے ۔ بہرحال خود نوشت کا سب سے اہم بیان یہی ہے کہ وہ علی عادل شاہ اول کے عہد میں بیجاپور آئے ۔

مرثیے کے ذیل کے مصرعے ملاحظہ ہوں

شب بیچ شہ روشن کیا حضرت منور پور کیا

روضہ منور پور ہے مقام نج شہ پور ہے

اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں کہ بیجاپور سے ڈھائی میل دور ٹیلہ منور پور کہلاتا ہے[1]

مرثیے میں شاہ پور کا ذکر اہم ہے ۔ خود میراں جی نے مثنوی خوش نامہ میں خوش بی بی کے سلسلے میں لکھا ۔

تہاں کیا شاہ پور ما نہیں ، وہ تو پیارا تہام پیروں کیرا قول ہوا کہ تجھ سوں ہمیں تمام[2]

جیسا کہ پیچھے لکھا جاچکا ہے تاریخ فرشتہ کے مطابق علی عادل شاہ اول (سنہ جلوس ۹۶۵ ھ) نے اپنی بحث شیبی کی یاد میں شاہ پور کو بسایا بساتین السلاطین

۱ اکبر الدین صدیقی مضمون چراغ دٹ نوٹ ص ۴۴

۲ مولوی عبدالحق حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق رسالہ اردو جولائی ۲۰ ع بار طباعت قدیم اردو ص ۱۵

قلمی علاوہ، سخاوت مرزا میں اس کی میلاد کی تاریخ ۹٦۷ھ لکھی ہے اس لئے شاہ میراں جی کے ۹۰۲ھ یا ۹۰۴ھ میں انتقال کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا جو لوگ مرثیے میں اس سنہ والے مصرع پر ایمان رکھتے ہیں انہیں شاہ پور کے ذکر کو دیکھ کر مان لینا چاہیے کہ یہ سنہ وفات سے متعلق نہیں ہوسکتا۔ میری رائے میں یہ ولادت کی طرف اشارہ کرتا ہے

تاریخ حضرت سال نوسو اس پر اگلے تھی دو

سے مراد تاریخ ولادت حضرت ہے اسے خواہ ۹۰۲ پڑھیے خواہ ۹۰۴ھ اسکے بعد کا مصرع مولوی عبدالحق نے یوں لکھا تھا

دو دیں مدت وفا شو جے کچھ حکم الٰہی کا

اکبرالدین صدیقی نے کلمتہ‌الحقائق کے مقدمے میں لکھا

(دو دن مدّت وفا شو . . .)

اب بھی مصرع کا یہ جزو بے معنی رہا انہوں نے مرثیے کا قدیم مخطوطہ دیکھ کر اس مصرع کو یوں لکھا

ویں مدّت وفات یو سو جو کچھ حکم الٰہی کا

پہلے مصرع میں ولادت کی تاریخ بیان کرکے دوسرے مصرع میں کہتے ہیں « وایں مدتِ وفات یو سو » یعنی وفات کی مدت کے بارے میں آگے سنو

ع اربع تسعوں یو سال ہے ماہے کوں شوّال ہے

اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ

« یہ ان کی عمر کا ۹۴ واں سال ہے اور شوّال کا مہینہ ہے »

عمر کے بعد سنہ کا ذکر کیے بغیر صرف مہینہ لکھنے کی کیا تک تھی مجھے یقین ہے کہ ۹۴ کا عدد عمر کی طرف نہیں سنہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اس سے پہلے سینکڑے کے اعداد حذف ہیں جیسا کہ ہم اپنے عہد میں ۴۷ع، ۸۴ع وغیرہ بغیر ۱۹ سو کے اضافے کے بولتے اور لکھتے ہیں۔ چونکہ شاعر پہلے شعر میں « سال نو سو » لکھ ہی چکا ہے اس لیے دوبارہ اسے نہ لکھنے میں اسے تکلّف نہیں ہوا اس مصرع کے معنی یہ ہیں۔

« سنہ ۹۴ ہے اور مہینہ شوّال کا ہے »

اب دونوں شعروں کو ملا کر دیکھیے

تاریخ حضرت سال سو سو دو اس پر اگلے تھی دو
ویں مدت وفات یو سو جے کچ حکم الٰہی کا
اربع تسعون یو سال ہے ماہے کوں شوال ہے
(کہوں)
رحلت کیے اس حال ہے جے کچھ حکم الٰہی کا

ردیف کو بھلا کر ان دو شعروں کے معنی یہ ہیں

حضرت کی ولادت کی تاریخ ۹۰۴ ھ (یا ۹۰۲ ھ) تھی اور ان کی وفات کی مدّت یہ سو کہ سنہ ۹۴ ھ (۹۹۴ ھ) اور شوّال کا مہینہ ہے۔

آگے کے اشعار میں لکھا ہے

تاریخ بست و پنج بود بسیار گریاں رنج مر بود
دو سال واصل گنج جود جے کچھ حکم الٰہی کا
شب پنج شنبہ روشن کیا ہجرت منور پور کیا
جوڑا قفص کر اُن لیا جے کچھ حکم الٰہی کا

اس میں کہا گیا ہے کہ ۲۵ شوّال کی تاریخ تھی اور جمعرات کی رات تھی۔ انجمن ترقیِ اردو کی تقویم ہجری و عیسوی از ابوالنصر محمد خالدی اور اور ترقیِ اردو بورڈ کی مفتاح التقویم ص ۲۴۷ کے مطابق ۲۵ شوّال ۹۹۴ ھ کو جمعرات تھی۔ واضح ہو کہ اسلامی تقویم میں تاریخ اور دن دونوں غروب آفتاب کے بعد شروع ہوکر اگلے دن غروب آفتاب تک چلتے ہیں۔ ہندوؤں میں صبح تڑکے سے اگلی رات کے آخر تک دن کا شمار ہوتا ہے اور مغربیوں میں رات کے بارہ بجے سے اگلی رات کے بارہ بجے تک جسے مرثیے میں ۲۵ شوّال جمعرات کی رات کہا ہے وہ دور حاضر کے لحاظ سے بدھ کے دن کے بعد

والی رات ہوگی اسلامی قاعدے سے اس وقت ۲۵ شوال اور حجرات دونوں آچکی ہوں گی۔

شعر میں لکھا ہے (ہجرت منور پور کیا) اسی مرثیے کے ایک اور شعر میں ہے (روضہ منور پور ہے مقام تجھ شہہ پور ہے)

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شاہپور میں رہتے تھے اور منور پور میں دفن ہوئے۔

(دو سال واصل گنج حود) کے کیا معنی ہیں غالباً یہ کہ مراد یہ کہ دو سال سے واصل حق ہے یعنی انہیں انتقال کے دو سال ہوگئے اس طرح مرثیہ وفات کے دو سال بعد یعنی ۹۹۶ھ میں لکھا گیا «گنج حود» کے بجائے «گنج بود» ہونے کا بھی امکان ہے

ان کی تاریخ پیدائش ۹۰۲ھ ہے کہ ۹۰۴ھ مصرع ۹۰۴ سے زیادہ موزوں ہوتا ہے

تاریخ حضرت سال نو سو دو اس پر اگلے بھی دو (اکبرالدین صدیقی کا متن)
بہ نسبت «تاریخ حضرت سال نو سو اس پر اگلے بھی دو» (عبدالحق کا متن)

لیکن «شمس العشاق» سے ۹۰۲ھ برآمد ہونا بھی اتفاقی معلوم نہیں ہوتا ان کی وفات کی جو تاریخیں «شمس منور پور» اور «مرقد ولی شاہپور» ہیں ہوسکتا ہے
۹۰۴ھ ۸۰۴ھ
کہ صدیوں بعد میں معتقدین نے کہی ہوں انہیں بھی آج کے محققین کی طرح مرثیے کے پہلے شعر کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہو کہ اس میں ۹۰۴ھ وفات کی تاریخ ہے۔

اب رہا شاہ کمال سے بیعت کا سوال۔ شاہ کمال کی وفات کی جو دو تاریخیں ملتی ہیں وہ ۸۶۷ھ اور ۸۸۱ھ ظاہر کرتی ہیں جب کہ حسینی شاہد نے ان سے بیعت کی تاریخ ۹۲۲ھ قرار دی تھی اگر ولادت ۹۰۲ یا ۹۰۴ھ میں ہوئی ہو تو بیعت ۹۲۲ میں ہوسکتی ہے لیکن ہمیں بیعت کی تاریخ کا علم ہی نہیں

شاہ کمال کی وفات کا ایک مادّہ غلط ہوسکتا ہے تو دوسرا بھی غلط ہوسکتا ہے وہ اس سنہ تک زندہ رہے ہوں گے کہ شمس العشاق میں ان سے بیعت کا شعور آچکا ہو

مجھے یقین ہے کہ شاہ میراں جی کی ولادت ۹۰۲ یا ۹۰۴ ھ میں ہوئی اور وفات ۲۵ شوال ۹۹۴ ھ شبِ پنج شنبہ میں۔ اس صورت میں برہان الدین جانم کا انتقال ۱۰۰۷ ھ میں قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں

تصانیفِ نثر ۔

ان کا حال بھی خواجہ بندہ نواز کا سا ہے یعنی ان کی بھی کوئی مصدقہ نثری تصنیف دستیاب نہیں۔ ان سے ذیل کی کتب منسوب کی گئی ہیں۔

۱، ۲ جل ترنگ اور گل باس: شمس اللہ قادری نے پہلی بار ذکر کیا کہ انہوں نے یہ رسالے دیکھے تھے۔ لکھتے ہیں

"چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں اور شاہ صاحب نے ان میں تصوف کے اسرار و نکات تمثیل کے پیرائے میں بیان کیے ہیں"[1]

اس کے بعد ان رسالوں کا کہیں پتا نہیں چلا اب ناپید ہیں۔ اس لیے کیونکر تصدیق کی جائے کہ یہ شاہ میراں جی کی تصنیف تھے

۳ شرح مرغوب القلوب مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ ع میں اس کی تفصیل دی۔ شمس اللہ قادری اردوئے قدیم[2] میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر محمد قاسم ماہرِ سمّیات کے پاس اس کا نسخہ دیکھا جس کے خاتمے میں لکھا تھا کہ حضرت میراں جی خدا نما کی تصنیف تھا اس کے باوجود ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے (ص ۲۶) میں اسے شاہ میراں جی سے ہی منسوب کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ[3] کا رجحان بھی اسے شمس العشاق سے منسوب کرنے کا ہے

---

۱ اردوئے قدیم ص ۱۶۱ ۲ اردوئے قدیم دوسرا حصہ ص ۵۹

۳ اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۱۲۷-۱۳۶

لیکن انہوں نے شمس اللہ قادری کی رائے بھی دی ہے ڈاکٹر نذیر احمد نے دلی گڑھ تاریخ میں (ص ۲۱۶) اسے بے تامل شمس العشاق سے منسوب کردیا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب میراں جی خدا نما[1] میں میراں جی خدا نما کی کتاب شرح تمہیدات اور زیر بحث شرح مرغوب القلوب کے حوالے دے کر ثابت کیا کہ موخر الذکر میراں جی خدا نما ہی کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد[2] کی بھی یہی رائے ہے۔

۴ سب رس ،

سالار جنگ لائبریری میں ایک مخطوطہ (سب رس) کے نام سے ہے جس کے آغاز میں لکھا ہے (کلام میراں جی شمس العشاق) اس کی تفصیل نصیرالدین ہاشمی نے مطبوعہ فہرست میں ص ۱۷۱ تا ۱۷۴ پر دی ہے کئی مضمون نے اسے میراں جی سے منسوب کردیا ہے دراصل یہ وجہی کی تصنیف تاج الحقائق ہے اس کے بارے میں تفصیلی بحث ڈاکٹر نور السعید اختر کی مرتبہ تاج الحقائق کے مقدمہ میں دیکھیے

۵ سبع صفات

پانچ صفحوں کا یہ رسالہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں ہے چونکہ اس کے سرورق پر مصنف کا نام میراں جی لکھا ہے اس لیے ڈاکٹر نذیر احمد نے اسے شاہ میراں جی شمس العشاق کی تصنیف سمجھا لیکن میراں جی نام کے گجرات و دکن میں متعدد بزرگ ہوئے ہیں مثلاً میراں سیّد محمد جونپوری ، میراں جی شمس العشاق ، میراں جی خدا نما ، میراں یعقوب ، میراں حسینی ولی اللہ وغیرہ محض «میراں جی» کی بنا پر کیونکر اسے شمس العشاق سے منسوب کردیا جائے دیکھیے اس کی زبان کتنی صاف ہے۔

---

۱ «میراں جی خدا نما» ص ۸۵-۸۴ بحوالۂ ہاشم علی مقدمۂ معز مرغوب و چہار شہادت ص ۵۵-۵۴

۲ کلمتہ الحقائق اردو نثر کا پہلا مستند نقش نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء ص ۲۲

> ”اے عزیز یہاں ساتو صفتاں ذات کی بولتاں ہوں خوب سن ہور تمام عالم میں یوں صفتاں دیکھ ۔ تو سات صفتاں حق تعالی کی ذاتی ہیں جہاں تو صفتاں ہے وہاں ذات خدا کی موجود ہے ۔“[1]

اس کے مقابلے میں شاہ برہان الدین جانم کے کلمتہ الحقائق کی اکھڑی اکھڑی فارسی آمیز زبان دیکھیے صاف ظاہر ہے کہ سبع صفات بہت بعد کا رسالہ ہے ۔

اس طرح شاہ میراں جی شمس العشاق سے کسی بھی اردو نثر رسالے کا انتساب ثابت نہیں ہوتا یہی رائے ڈاکٹر محمد ہاشم کی ہے لکھتے ہیں

> میراں جی شمس العشاق سے منسوب جتنے بھی رسالے ہیں ان میں سے ایک بھی رسالہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ یہ میراں جی شمس العشاق ہی کی تصنیف ہے ۔[2]

ڈاکٹر حسینی شاہد[3] نے بھی ان سے کسی نثری رسالہ کا انتساب تسلیم نہیں کیا ۔ راقم الحروف کو بھی اس سے اتفاق ہے

---

۱ ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ تاریخ ادب ص ۲۱۷

۲ مقدمۂ مغز مرغوب و چہار شہادت ص ۸٦

۳ نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ع ص ۲۲

• • •

ڈاکٹر تنویر احمد علوی
شعبۂ اردو ، دہلی یونیورسٹی
دہلی (٦)

رسالۂ صاحبیہ

(تعارف)

رسالہ صاحبیہ جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے [یہ مختصر رسالہ] شہزادی جہاں آرا بنتِ شاہجہاں کی تالیف ہے ، شہزادی حضرت ظل سبحانی صاحب قران ثانی کی بہت ہی چہیتی بیٹی اور شہزادۂ دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی بڑی بہن تھی ۔

شہزادی کی پرورش بڑے ناز و نعم کے ماحول میں ہوئی اور بہت ہی لایق استادوں کو اسکی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا گیا ، شہزادی اپنے خوبصورت نام کی طرح حسن سیرت اور جمال صورت دونوں کے اعتبار سے مغل سلطنت اور خاندان تیمور کی چشم و چراغ تھی ۔

شاہجہاں کی بیٹی کے لیے سکون و راحت اور مسرت و آسایش کے جو مواقع موجود ہوسکتے تھے وہ شہزادی کے لیے بھی تھے لیکن وہ اپنے عہد شباب میں ان سب سے الگ ہٹ کر سوچنے لگی اور صوفیانہ افکار و عقائد اس کے ذہن اور زندگی پر ابر باراں کی طرح چھاگئے اس نے اپنی چھبیس برس کی عمر میں تصوف پر اپنا مشہور رسالہ «مونس الارواح» ترتیب دیا جس کا سال تالیف شہزادی کی اپنی روایت کے مطابق ١٠٤٩ ھ ہے ۔

اس پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے مطبوعہ نسخہ (١٣٩٠ ھ - ١٩٧٠ع) کی مرتب پروین کاظمی (بنت نظام الدین احمد کاظمی) نے لکھا ہے

> کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حسن و رعنائی کا یہ پیکر جمیل جس کا نام نامی جہاں آرا ہے عالم شباب میں بھی اخلاق و کردار کی اعلیٰ صفات سے آراستہ بزرگان دین کی محبت و عقیدت سے سرشار اور علم و عرفان کی لازوال نعمتوں سے مالامال تھی ۔»[١]

١ مونس الارواح : ٧

بزرگان دین بالخصوص حضرت سلطان الہند خواجۂ غریب نواز شاہ معین الدین اجمیریؒ اور ان کے سلسلے سے شہزادی کی محبت و عقیدت کا حال اس کتاب کے صفحہ صفحہ بلکہ سطر سطر سے معلوم ہوجاتا ہے خود شہزادی نے بطور خاص اس کا ذکر حضرت کے مزار فائز الانوار پر اپنی حاضری کے سلسلہ میں کیا ہے

(ترجمہ)

یہ فقیرہ و حقیرہ جہاں آرا کہتی ہے کہ میں جب اپنی قسمت کی یاوری اور اپنے ستارۂ حیات کی ارجمندی کے باعث اپنے والد ماجد حضرت ظل سبحانی صاحب قران ثانی کے ساتھ خطہ پاک حضرت اجمیر پہنچی تو اٹھارہ شعبان المعظم سنہ ایک ہزار تریپن ہجرالنبوی سے لیکر روز آدینہ ہفتم ماہ رمضان المبارک (سنہ مذکور) تک کہ ہم ساگر تال کے کنارے بنی ہوئی عمارات تک پہنچے، اللہ پاک نے اپنی عنایت بے نہایت سے مجھے اس بات کی توفیق عنایت فرمائی کہ میں ہر روز اور ہر منزل پر دو رکعت نماز نفـــل ادا کرتی تھی اور ایک بار یٰسین (شریف) اور سورۂ فاتحہ کمال اخلاص و عقیدت کے ساتھ پڑھتی تھی اور اس کا ثواب حضرت پیر دستگیر خواجہ معین الدین چشتیؒ کی روح پرفتوح کو پہنچاتی تھی

جن ایام میں کہ ساگر تال کے کنارے بنی ہوئی، عمارات میں ہمارا قیام رہا میں، احساس ادب کی وجہ سے رات کو، پلنگ پر نہیں سوتی تھی، اور حضرت پیر دستگیر کے روضۂ اقدس کی طرف کبھی پیر کرکے نہیں لیٹتی تھی بلکہ اسکی طرف کبھی پشت کرکے بھی نہیں بیٹھتی تھی اور سارا سارا دن درختوں کے سایہ میں گذارتی تھی

حضرت والا [خواجۂ غریب نواز] کی برکت اور اس سرزمین فیض کی برکت سے مجھے جمیعت خاطر کی جو دولت مجھے حاصل ہوئی اور مجھ میں جو ایک روحانی ذوق پیدا ہوا میں اسے بیان نہیں کرسکتی میں نے ایک شب میلاد اور چراغاں کا بھی اہتمام کیا حضرت کے مقدس روضہ کی خدمت اور زیست کے لئے

جو مجھسے ہوسکتا وہ میں نے کیا اور آئندہ بھی کرتی رہونگی اور اس سلسلہ میں انشاء اللہ کوئی کوتاہی نہ ہوگی۔

اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر اور احسان ہے کہ پنج شنبہ کے دن، رمضان المبارک کی چودھویں تاریخ کو حضرت کے مرقد منور وروضۂ مطہر کی زیارت نصیب ہوئی ایک پہر دن باقی رہا تھا کہ میں آستانۂ عالی کی زیارت کے لئے گئی اور اپنے رخ زرد کو وہاں کی پاک مٹی پر ملا، خانقاہ کے دروازے سے لیکر روضۂ مقدس تک میں ننگے پیر زمین کو بوسہ دیتی ہوئی مزار اقدس کی طرف بڑھی، اور مرقد متبرکہ میں داخل ہوکر اپنے مرشد اعلیٰ کے مزار مقدس (قبر) کے گرد سات مرتبہ میں نے طواف کیا، اپنی پلکوں سے وہاں جاروب کشی کی اور اس کی خاک پاک کو اپنی آنکھوں کا توتیا بنایا

اس وقت اس فقیرۂ فانیہ کے دل میں ایک عجیب ذوق پیدا ہوا جسے تحریر میں نہیں لایا جاسکتا، میں انتہائے شوق کے اس عالم میں سراسیمہ ہورہی تھی میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کہوں اور کیا کروں قصہ مختصر یہ کہ میں نے پہلے تو عطر و عنبر، حضرت کی قبر مقدس پر اپنے ہاتھوں سے ملا اور پھولونکی وہ چادر جو میں اپنے سر پر اٹھاکر لائی تھی وہ حضرت کی معطر و معنبر قبر پر چڑھائی اور وہاں سے واپس آکر سنگ مرمر کی اس مسجد میں [جو میرے والد بزرگوار نے یہاں تعمیر کرائی ہے] میں نے نماز ادا کی اور پھر گنبد مبارک کے سایہ میں بیٹھ کر میں نے یٰسین شریف اور سورۂ فاتحہ پڑھی اور حضرت کی روح پُرفتوح کو اس کا ثواب پہنچایا شام کے وقت تک میں وہاں رہی اور قریب شام میں نے حضرت کے روضہ پر شمع روشن کی اور جھالرا کے پانی سے روزہ افطار کیا

یہ عجیب شام تھی جو اپنی دل آویزی کے اعتبار سے ہزار نورانی صبحوں سے بہتر تھی　اگر یہ بات میرے اختیار میں ہوتی کہ حضرت کے مزار کے قریب کسی گوشۂ عافیت میں رہ سکوں [کہ میں یوں بھی گوشہ عافیت کی بے حد متمنی رہتی ہوں] تو میں یہیں کسی حجرہ میں اپنی زندگی گذار دیتی اور حضرت کے مزار اقدس کے طواف سے بھی مشرف ہوتی رہتی

میں ناچار «با چشم گریاں و دل بریاں» درگاہ شریف سے رخصت ہوئی۔ گھر آئی اور تمام رات عجیب بے قراری میں گذری جب صبح ہوئی اور جمعہ کا دن آیا تو اعلیٰ حضرت نے شہر اجمیر بہشت سیر سے کوچ کا ارادہ فرمایا اور متوجہ اکبر آباد ہوئے»[1]

شہزادی کا یہ بیان تالیفی روایت میں تقریباً چار سال بعد کا اضافہ ہے جو «ذکر حضوری و نذرانۂ عقیدت» کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے

خاتم الکتاب کی عبارت اس سے پہلے فالممد کی جاچکی تھی اور مطبوع نسخہ میں بھی اس تالیف کی یہ عبارت موجود ہے۔

«.... این رسالہ مونس الارواح بتاریخ بست و ہفتم ماہ مبارک رمضان سال یکہزار و چہل و نہ ہجری باتمام رسید و خلعت اختتام پوشید

واحوال این بزرگان راکہ مقربان درگاہ احمدیت اند از کتب و رسائل معتبرہ باحتیاط تمام بیرون آوردہ بقید تحریر آوردہ شدہ و بااعتقاد این ضعیفہ آنچہ درین ثبت گردیدہ صحت تمام دارد۔ ۔ »[2]

اس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے سلسلے کے بزرگوں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی، حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر رح حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے حالات ہیں [جو معتبر کتب و رسائل سے اخذ کر کے لکھے گئے ہیں] اور ایسی کچھ کتابوں کا ان اذکار میں حوالہ بھی موجود ہے۔

شہزادی کا ذکر مختلف تاریخوں اور تذکروں میں آتا ہے اور اس کے حسن صورت و جمال سیرت کی طرف اشارے کے ساتھ آتا ہے۔ اہل شعر و سخن کی قدر

---

۱ مونس الارواح ۔ ۷۷

۲ ایضاً ۸۴

افزائی اور بخشش و انعام کا ذکر بھی موجود ہے ۔ یہ سب شہزادی کی خاندانی روایات اور شاہجہاں کی بیٹی کی حیثیت سے اس کے کرداروں کا حصہ تھا اس سے بھی بڑی بات اولیاء اللہ سے اس کا وہ روحانی رشتۂ عقیدت اور ان کی خدمت گذاری کا وہ جذبہ تھا جس میں وہ اپنے بھائی شہزادۂ دارا شکوہ کی ہم دل و ہم راز تھی. وہ اپنے اس بھائی سے بے حد محبت کرتی تھی اور اگرچہ وہ اس سے عمر میں ایک سال بڑی تھی لیکن اسے اپنا روحانی اتالیق Speritual guide تصور کرتی تھی

«رسالۂ صاحبیہ» میں اس کا حوالہ جگہ جگہ ملتا ہے شہزادی اولیاء اللہ کی تقدیس اور ان کے تصرفات کے بارے میں بہت ہی واضح عقیدہ رکھتی تھی اور خیال کرتی تھی کہ اللہ پاک کی بھیجی ہوئی پاک روحیں قیام دنیا کا سبب ہیں مونس الارواح میں اس نے لکھا ہے

«بدانکه سبحانه وتعالیٰ وجود مسعود اولیاء الله را موجب ثبات وجه استقراء عالم و عالمیان گردانیده وار برکت سعادت ریشاں جهان وجهانیاں را استقامت ومدارم بخشیده وجمیع فیوض وبرکات از یمن انفاس متبرکه این گروه والا شکوه از آسمان بر زمین می آید. . . »[۱]

اس ضمن میں شہزادی نے اس عقیدہ خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان سے ارادت و عقیدت اہل ایمان کے لئے سبب نجات و وجہ فیوض و برکات ہے.

یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اس عقیدہ کی ہمہ گیری کے باعث لوگ کسی مرشد کامل کی تلاش کو مقصد حیات بنائے ہوئے نظر آتے ہیں خود شہزادی بھی ملا شاہ بدخشی سے مرید ہونے سے پہلے اپنے کسی مرشد کامل کی تلاش میں تھی گجرات خورد میں شاہ دولہ کا شہرہ سنکر [جنکے احوال کے بارے شہزادۂ دارا شکوہ نے بھی لکھا تھا] اپنے سفر کابل کے دوران انکی خدمت میں نذر و نیاز کے طور پر کچھ تحفے روانہ کئے اور توجہ فرمائی اور دعا کے لئے

---

۱ مونس الارواح ۱۹

درخواست کی لیکن سکون قلب اور طمانیت خاطر کی دولت شاہ دولہ سے اس کو میسر نہ آئی ، آگے بڑھکر تال جلال گھکھڑ میں بابا عبداللہ سے رجوع کیا لیکن بات ندر و نیاز اور درویشانہ تحفے تحائف سے آگے نہ بڑھی۔

بہر حال کئی برس تک مسلسل تلاش و تجسس کے نتیجہ میں شہزادی کا دست طلب ملا شاہ بدخشی کے دامن ارادت و پیراہن سعادت تک پہنچا ۔ رسالہ صاحبیہ شہزادی کے اسی خلوص خاطـــر اور اولیاء اللہ کے ساتھ اس کی اسی بے پایاں عقیدت کا ایک دل آویز مرقع ہے۔

شہزادی کی یہ دوسری تصنیف بھی تقریباً اسی زمانے کی یادگار ہے جب مونس الارواح کی تالیف عمل میں آئی تھی دونوں میں صرف دو سال کا فرق ہے۔ مونس الارواح کا زمانہ تالیف جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے سنہ ۱۰۴۹ ھ ہے اور رسالہ صاحبیہ کا ۱۰۵۱ ھ ، مونس الارواح میں حضرت خواجہ بندہ نواز سلطان الہند شیخ معین الدین چشتی اور ان کے سلسلۂ عالیہ کے صوفیائے کبار کا ذکر ہے [جسکی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا جاچکا ہے] اور رسالہ صاحبیہ میں حضرت ملا شاہ بدخشی اور ان کے تین چار خاص مریدوں کا ۔ ان اذکار میں شہزادی کا قلم جب بھی صفحۂ قرطاس پر رواں ہوتا ہے عقیدت کے پھول بکھراتا ہوا گذرتا ہے ... . شہزادی نے خود اپنے اور ملا صاحب کے وہی حالات لکھے ہیں جن سے شہزادی کی نظر میں بحیثیت شیخ طریقت ان کی زندگی کے خاص خاص گوشے سامنے آتے ہیں

اس عہد کی مغل تاریخ کے بعض اہم واقعات پر بھی اس رسالے سے کہیں کہیں روشنی پڑتی ہے ، خاص طور پر کابل کی مہم سے متعلق ، جسکی سربراہی شہزادہ بلند اقبال محمد دارا شـــکوہ کے سپرد کی گئی تھی اور کمک کے طور پر خود اعلٰے حضرت ایک بڑے لشکر کے ساتھ کابل میں فروکش ہوئے تھے لیکن یہ مہم اپنے مرحلۂ اول ہی میں ناسازگاری حالات کا شکار ہوگئی اور ہجوم افواج و کثرت افراد کے باعث شاہی لشکر میں قحط کے آثار پیدا ہوگئے اور ولایت بلخ و بدخشان وخراسان کی طرف [جو مغل شہنشاہ کی نگاہ میں اس کے بزرگوں کی میراث

تھے] موکب شاہی کی بہضت کا ارادہ ملتوی کردینا پڑا۔

شہزادی کو اپنے عہد کے سیاسی واقعات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی یوں بھی شاہی زندگی کا یہ رخ اس کی درویشانہ طبیعت اور صوفیانہ مزاج سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔

شہزادی کی تحریر میں قدیمانہ انداز نگارش کی بہت سی جھلکیاں موجود ہیں اور تحسینی کلمات کے گچھے کے گچھے تحریر مطالب کے دوران آتے چلے جاتے ہیں تاہم ہم بیشتر مواقع پر اس کی تحریر صاف سادہ اور سلیس ہے اظہار عقیدت کے جن مواقع پر جہاں ہم اس کے شعور و شخصیت کا ایک جیتا جاگتا مرقع دیکھتے ہیں وہاں اس کے حسن تحریر کا خوبصورت عکس بھی ہمیں بے اختیار اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

شاہجہاں کی شدید علالت اور اس کے دوران مغل شہزادوں کی معرکہ آرائیوں میں سموگڈھ کے مقام پر دارا شکوہ کی شکست سے تیموری تخت کے لیے دارا شکوہ کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا اور کچھ دنوں کی ناکام کوشش کے بعد انجام کار شاہ جہاں کا یہ چہیتا بیٹا جیون بیگ کی سازش سے گرفتار ہوا اور عالمگیر اورنگ زیب [اپنے چھوٹے بھائی کے حکم سے جو اب تخت ہندوستان پر بحیثیت شہنشاہ جلوہ فرما تھا] قتل کردیا گیا شاہجہاں نے اپنی عمر کے آخری دس سال نظر بندی و قید تنہائی کے عالم میں گذارے اس تمام وقت میں اس درویش مزاج شہزادی نے اپنے والد بزرگ کی ہر طرح دل جوئی و خدمت کی۔

ان حالات نے اسے پہلے سے بھی زیادہ تصوف و روحانیت کی طرف مائل کردیا ہوگا۔ سنہ ۱۰۹۲ ھجری میں شہزادی نے دہلی میں انتقال کیا اس وقت اورنگ زیب برہانپور میں تھا کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ کو جہاں آرا کے انتقال پرملال پر بہت افسوس ہوا۔

حضرت محبوب الہی کی درگاہ میں آپ کے پائیں مزار شہزادی کو اس کی اپنی وصیت کے مطابق دفن کیا گیا یہیں وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

شہزادی کی قبر کا مرمریں محجر اور اس میں کٹی ہوئی نہایت نفیس جالیاں مغل عہد کی سنگ تراشی اور شہزادی کی اپنی پاکیزہ فطرت اور نفاست مزاج کا بہترین عکس پیش کرتی ہیں اور اس کا سنگ مزار اس کی درویش خوئی اور فقیرانہ افتاد طبع کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔

هـــو الحیّ القیوم

بغیر سبزہ نہ پوشـــد کسے مزار مـــرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

المقبرۂ فانیہ جہاں آرا بیگم مرید خواجگان چشت
بنت شاہجہان بادشاہ غازی انار اللہ بـــرہانہ
سنہ ۱۰۹۲ ھ

اس لوح مزار پر منقش شعر کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شہزادی کا اپنا شعر ہے۔ شہزادی کو شعر و سخن سے ایک گونہ لگاؤ بھی تھا مونس الارواح اور رسالۂ صاحبیہ میں اس نے اپنے متعدد شعر نقل کئے ہیں جو اس نے اپنے مرشد ملا شاہ بدخشی کی شان میں وقتاً فوقتاً کہے ہیں اور انہیں اپنی اس تالیف کے صفحات میں ثبت کرلیا ہے۔

بعض شعروں کے متعلق خود شہزادی نے یہ لکھا ہے کہ اسکی فرمائش پر کسی دوسرے شاعر نے لکھے ہیں بہرحال شہزادی کے موزوں طبع اور فی الجملہ ایک اچھا نثر نگار ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں

رسالۂ صاحبیہ کا فارسی متن پروفیسر محمد اسلم شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کا مرتب کردہ ہے موصوف کی اجازت ہی سے راقم الحـــروف نے اس کا ترجمہ کیا ہے اصل نسخہ اپاراؤ بھولا ناتھ لائبریری احمد آباد میں موجود تھا اس کو ابتداء پروفیسر محمد ابراہیم ڈارا مرحوم نے دریافت کیا تھا پروفیسر محمد اسلم نے اسے ودیا سبھا لائبریری سے نقل کیا صاحبیہ نام کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جہاں آرا کو بیگم صاحبہ کہا جاتا تھا ویسے صاحب مرشد و مولا کو بھی کہتے ہیں۔

« رسالہ صاحبیہ »

تالیف : شہزادی جہاں آرا بنت شاہ جہاں

ترجمہ : ڈاکٹر تنویر احمد علوی

(الف)

بے شمار تعریفیں اور ان گنت ستایشیں اس خدا وند قدوس کے لیے ہیں جو اپنی ذات میں بے مثل و یکتا ہے اور جسکی الوہی صفات میں تمثیل و تشابہ کی کوئی گنجایش نہیں اور ہزاراں ہزار درود و سلام حضور سرکار دو عالم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جن کے دین مُبین کی سچائی میں شکوک و شبہات کو دخل نہیں اور اُنکی پاک اولاد اور اصحاب کبار کی ارواح مقدس پر کہ ان میں سے ہر ایک ذات احدیث کا پرستار اور حضرت رسالت مآب کے لائے ہوئے دین کا ماننے والا اور خدمت گذار تھا اور جنہوں نے اس دین برحق کی پیروی کے سوا کسی سے کوئی نسبت نہیں رکھی۔ (رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین)

امّا بعد یہ ایک مختصر رسالہ ہے جسے اس فقیرۂ نحیف اور اولیاء اللہ کی اس خادمۂ ضعیف جہاں آرا بنت شاہجہاں نے ترتیب دیا ہے اللہ پاک اس کی کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور اس کے عیبو کی پردہ پردہ پردہ پوشی کرے (آمین)

اس مختصر رسالہ میں حضرت ارشاد پناہ ولایت دستگاہ، محقق اسـرار اللہ عارف باللہ مرشد والا ملا شاہ سلمہ اللہ تعالےٰ کی پاک زندگی اور سعادتوں سے بھرے ہوئے واقعات کا بیان ہے جو اس ضعیفہ نے بصاحت کے پیر دستگیر اور مرشد روشن ضمیر ہیں۔

اسی کے ساتھ ان اوراق میں اس ضعیفہ نے اپنا بھی کچھ کچھ احوال پر احتلال قلمبند کیا ہے کہ اس فقیرہ کے دل میں کس طرح طلب و آگہی کا ذوق پیدا ہوا کیسے حضرت والا سے الفت و عقیدت پیدا ہوئی اور میں نے حضرت ملا شاہ کا دامن تھاما، اس میں کچھ وہ حالات بھی درج ہیں جو اس رسالہ کی

تالیف کا سبب بنے جس کا نام فقرائے باب اللہ کی اس خادمہ اور حضرت ملا شاہ کی بارگاہ کی اس دریوزہ گرنے "رسالۂ صاحبیہ" رکھا ہے قلم شکستہ زبان کو یہ مجال کہاں کہ حضرت کی کتاب اوصاف کا[1] ایک حرف بھی صحیح طور پر لکھدے اور عجز خاطرہ کی زبان کج مج بیان میں یہ قدرت کہاں کہ وہ اس مرشد کامل کی صفات حسنہ کا (قرن در قرن مدت یابی کے ناوصف) کوئی شمہ بیان کرسکے لیکن حضرت کے احوال سعادت مآل کے بیان کو اپنے لیے فیض و برکت کا موجب مانتے ہوئے میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

اور اس کے ذیل میں اپنے احوال پر اختلال کی تحریر کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس فقیرۂ بے دستگاہ اور اس ضمیمۂ نامہ سیاہ کا نام حضرت کے اسم مبارک و احوال مقدس کے ذیل میں لکھدیا جائے شاید حضرت والا کے اسم شریف کی برکت و سعادت سے اللہ پاک اس فقیرۂ بے نوا کو بھی بخشدے (جس نے اپنی عمر عزیز کو بیہودہ باتوں میں صرف کیا ہے) اور قیامت کے روز حضرت کے مخلصین و معتقدین کے زمرہ میں شامل فرمائے۔

میں نے بعض کتابوں میں پڑھا تھا کہ پہلے بزرگوں نے اپنی اور دوسرونکی ہدایت کے لیے اپنے مشایخ کا احوال لکھا ہے کیوں نہ میں بھی اُنکی سنت پر عمل کروں ورنہ یہ فقیرۂ بے بضاعت اس قابل کہاں کہ حضرت ارشاد پناہ مولینا شاہ کے اوصاف عالیہ کے دریائے بیکراں سے ایک قطرہ بھی باہر لاسکوں یا اس مرشد حقیقی کے فضائل و فضائل کے بوستاں سے کوئی ایک پھول بھی چُن سکوں، اسی کے ساتھ، خود میں کس شمار قطار میں ہوں کہ حضرت کے حالات کے ساتھ، (گوناگوں خامیوں اور خرابیوں سے بھرے ہوئے) اپنے حالات کو سپرد قلم کرسکوں کہ یہ اندراج بھی ایک سوئے ادب سے کم نہیں۔

میں خدا کی ذات سے یہ امید رکھتی ہوں کہ جو بات، بیان واقعہ کی سی نوعیت رکھتی ہے، وہ بغیر کسی زیادتی اور نقصان کے زبان قلم سے تراوش پائے۔ اللہ پاک مجھے اس کی ترتیب و تکمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

---

۱ جو آپ کے پسندیدہ فضایل و برگزیدہ فضایل کی دستاویز شریف ہے۔

«حضرت ارشاد پناہ، ولایت دستگاہ، عارف باللہ ملا شاہ بدخشی کے حالات متبرکہ»

معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت والا کا وطن مالوف اور مولد شریف موضع «ارکسا» ہے (جو توابع بدخشاں ہے). حضرت صوفی علی الاطلاق اور یگانۂ آفاق میں عرفاں ذات میں یکتائے دوراں اور نکتۂ توحید کی رمز شناسی میں یکتائے زمانہ ہیں. پیروی رسوم سے منزہ اور مراتب و درجات کی ترقی و تنزل سے منزہ ہیں. حقیقت کے انتہاء سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں، جواہر وجود کا سرچشمہ اور لطف و عنایات کا منبع ہیں. رموز قرآں کے کاشف اور حقیقت کے بھیدوں سے واقف ہیں جہاں بیرنگی کے طلسم سے آزاد اور بے رنگی کی فضائے لطیف میں محو پرواز ہیں. بارگاہ الٰہی کے مقرب، شریعت و طریقت کے رمز آشنا ہیں اور معرفت ذات نامتناہی کے خزینہ دار ہیں.

حضرت دور موجود میں قطب الاقطاب اور غوث الآفاق ہیں. میرے شیخ طریقت اور میرے مرشد و مولا ہیں اور آپ کا نام نامی اور اسم سامی ملا شاہ ہے اللہ پاک آپکو سلامت رکھےاور مرتبہ بقا عطا فرمائے - موضع ارکسا روشتاق، توابع ملک بدخشاں سے ہے جیسا کہ حضرت والا نے اپنے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے.

ملک من از ملکہا ملک بدخشاں آمدہ
از بلاد روشتاق دار قرایا «ارکسا»

حضرت کے والد ماجد کا اسم شریف مولینا عبدی، بن مولینا سلطان علی، بن حضرت قاضی فتح اللہ ہے.

[اللہ پاک ان کی روحوں پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے]

حضرت کے قابل احترام اسلاف میں ہر شخص قاضی کے لقب سے امتیاز رکھتا تھا لیکن ان کا مقصود اعلیٰ اور مطلوب والا، راہ حق کی طلب اور ذات مطلق کی شناخت سے تھا، اس لیے یہ لوگ امور قضا سے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتے تھے، اور اس جہان فانی کے رنج و راحت کو اپنی نگاہ حق شناس میں کوئی مقام

نہ دیتے تھے اور اس جہاں گذراں کی مسرت و محنت کو یکساں شمار کرتے ہوئے اپنے اوقات گرامی کو اطمینان دل اور طمانیت خاطر کے ساتھ گذارتے تھے

ان عزیزوں میں سے ہر ایک نے وقت موعود آنے پر سفر آخرت اختیار فرمایا اور آغوش رحمت میں جگہ پائی.

میرے حضرت کی والدۂ ماجدہ کا نام بی بی خاتون تھا جو رابعہ وقت اور خدیجۃ زمانہ تھیں، بہت ریاضت و مجاھــدہ کرنے والی بی بی اور صاحبۂ حالات و مقامات خاتون تھیں، انہیں اسما و صورات میں عارضۂ کامل کا درجہ حاصل تھا انہوں نے اپنی عمر طبعی کی مختلف منزلوں کو طے کرکے وقت مقررہ کے آنے پر عالم فانی سے ملک جاودانی کی طرف رخ کیا اور جنۃ نما کو زینت بخشی

میرے مرشد مولانیما شاہ کے دو بھائی اور ایک بہن ہیں جو آپ سے عمر میں چھوٹے ہیں، بقید حیات ہیں اپنے وطن موضع ارکسا میں قیام پذیر ہیں. آپکے دونوں بھائیوں کے نام ملا بیگ محمد اور ملا سلطان علی ہیں یہ دونوں بھائی حضرت کی خدمت با برکت میں کسب فیض اور حصول سعادات کے لئے ادھر ھندوستان بھی آتے تھے، حضرت الہی اور وصول ذات نامتناہی کے مختلف مراحل طے کرکے آپ کے فرمان کے بموجب اپنے قریہ کی طرف واپس لوٹ گیے.

اپنی ہمشیرہ کو حضرت والا نے اپنی توجہ غائبانہ سے عالم باطن کی راہ دکھلائی اور مشغول (بہ حق) فرمایا علاوہ ازیں آپ کے بہت سے اہل وطن آپ کی باطنی توجہات کی بدولت بیر اس لئے وہ آپ سے عقیدہ درست اور اخلاص دلی رکھتے تھے، حضرت والا کی بیکـــراں بخشائشوں اور بے پایاں برکات سے بہرہ یاب ہوتے اور حضرت نے طریقۂ اویسیہ کے مطابق ان کی تربیت فرمائی

اس ملک اور اس دیار کے رہنے والوں کی ایک بڑی جماعت محض حضرت والا کے دیوان حقیقت رحمان کے مطالع اور مشاھدہ سے [کہ وہ شروع سے لیکر آخر تک معارف صفات اور حقائق ذات پر مشتمل ہے] اسرار توحید اور رموز الوہیت سے آگاہ اور مقامات طریقت اور مراتب حقیقت پر فائز اور گوناگوں فیوض و برکات سے بہرہ ور ہوئے اور انہوں نے ترقی کے اعلٰے مراحل طے کیے.

حضرت والا نے [کہ میرے مرشد ولایت پناہ اور مربّی حقائق دستگاہ ہیں] اپنے دیوان فصاحت قران و بلاغت نشان کا ایک نسخہ اس صحیفہ کو عنایت فرمایا جو بلند رتبہ قصاید اور شور انگیز غزلیات سے مزین ایک مرقع ہے اور اس کا ہر بیت لمعۂ نور اور ہر مصرع بیت المعمور ہے۔ یہ صحیفہ بھی کہ حضرت والا کے ساتھ اخلاص حقیقی اور ارادت تحقیقی میں حسود کو کسی سے کم تر نہیں جانتی، اس دیوان صداقت ترجمان کو شب و روز اپنے پیش نظر اور اس کے اشعار کو ہمیشہ ورود زبان رکھتی ہے، اور ان معرفت سے بھرے ابیات کو پڑھنے سے بے شمار فائدے اور بے نہایت فیوض و برکات اس صحیفہ کو حاصل ہوئے ہیں اس مدویہ کے عقید وخیال کے مطابق نکتہ ہائے توحید کو ملا شاہ سے زیادہ بہتر انداز سے اس زمانے میں کسی نے پیش نہیں کیا

میرے مرشد و مولا حضرت ملا شاہ نے زمانۂ طفولیت سے لیکر اکیس برس تک موضع «ارکسا» ہی میں زندگی بسر فرمائی ان سنین عمر تک پہنچنے کے دوران حضرت سے خوارق عادت اور بڑی بڑی کرامتوں کا ظہور ہوا، وہاں کے رہنے والوں کو میرے مرشد روشن ضمیر کی خدمت میں۔ کمال بندگی و اعتقاد حاصل تھا

بعد ازاں اپنے حال کو چھپانے اور ظاہری علوم کی تحصیل کے لیے حضرت نے بلخ کی طرف سفر اختیار کیا اور اہل ارکسا کو حضرت کی جدائی اور مفارقت نے بہت ستایا۔ سرزمینِ بلخ حضرت کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے مشرف ہوئی اور آپ علوم ظاهری کے کسب و اکتساب میں مشغول ہوئے بہت تھوڑی سی مدت میں حضرت نے علوم ظاہری کو حاصل کرلیا اور مرتبۂ کمال کو پہنچ گیے

چونکہ حقیقت الحقائق کی طلب کا ذوق اور معرفت حق کی جستجو کا شوق حضرت کی طبعیت پر غالب تھا اس لیے بلخ میں زیادہ دنوں تک قیام نہ فرماسکے اور اولاً سرزمین کشمیر کو اپنے مقدم فیض سے نورانی فرمایا اس وقت تک حضرت کی عمر شریف [کہ اللہ آپ کو سلامت تا قیامت رکھے] پچیس برس ہو گئی تھی اور سرزمین کشمیر کے قیام کے دوران بھی تین سال تک حضرت والا نے خود کو طالب علمی کے لبادہ میں چھپائے رکھا

چونکہ ابھی تک آپ کا دست طلب کسی پیر کامل کے دامن مراد تک نہ پہنچا تھا [جس کے تحت وہ کسی خاص طریقہ کو اختیار کریں اور ذکر حق میں مشغول ہوں] اس لیے کشمیر دل پذیر سے لاہور کا رخ کیا۔

اس زمانہ میں شہر لاہور حضرت میاں جیو میاں میر قدس اللہ شریف کے وجود مسعود اور انوارِ لامحدود سے مشرف و منور تھا جو صغیر و کبیر کے پیشوا اور جنید عصر تھے

سچ یہ ہے کہ میاں جیو [میاں میر] عارفوں کے شیخ طریقت واصلوں کے رہنمائے کامل، دریائے حقیقت کی موج بیکراں، شریعت و طریقت کے آسمان روشن کوہ عظمت و وقار، عارف نامدار، محققین کے سرخیل، اہل معرفت کے مقتدا اولیائے کبار کے سلسلہ کے دریکتا، عالی قدر مشایخ کے لیے اسوۂ جمیل، اہل زمانہ کے ہادی، بے عدیل موحدّوں کے امام، رموز توحید کے نکتہ شناس، حجاب و استتار کے پردہ کشاہ تھے۔

جب میرے مرشد حضرت ملا شاہ، حضرت میاں جیو کے احوال و مرتبۂ کمال سے آگاہ ہوئے تو کمال شوق کے ساتھ حضرت کی خدمت میں (لاہور) حاضر ہوئے حضرت میاں جیو مرشدی ملا شاہ کے صدق طلب اور جستجوئے حق کی سچی خواہش کو آزمانے کے لئے آپکی طرف سے دانستہ تغافل فرماتے رہے اور ایک سال تک حضرت کو اپنی خدمت بابرکت میں باریابی عطا فرمانے سے گویا دانستہ اجتناب فرماتے رہے اور آپکے حال پر توجہ فرما نہ ہوئے

خود حضرت والا ملا شاہ نے [کہ غلبۂ شوق، وفور ذوق، وصال حق کی طلب اور حقیقت مطلق کی دریافت کے شدید جذبہ کے زیر اثر، اکثر خورد و نوش سے بھی غافل رہتے تھے اور ہمہ وقت بحر شوق میں مستغرق اور بقائے ذات مطلق کے خیال میں محو رہتے تھے] میاں جیو کی ملازمت کو کبھی ترک نہ فرمایا

ایک سال اسی طرح گذر گیا حضرت میاں جیو نے جب حضرت والا کی طلب حق کو صادق اور آپ کو خدا جوئی کی خواہش میں ثابت قدم پایا تو عنایت

و مہربانی کے گہرے جذبات، جو حضرت میاں جیو کے دل میں موجزن تھے انکو ظاہر فرمایا اور اپنی صحبت میں باریابی عطا کی اور اسی وقت مشغول بحق فرمایا

چونکہ حضرت والا میں حق شناسی و حق دہی کی صلاحیت بدرجہ کمال تھی، جیسے ہی مشغوق بحق کیے گیے درجات عالیہ اور مراتب عُلیا تک رسائی میں دیر نہ لگی اور عالم ملکوت و عالم ارواح اور عالم مثال پر علوم باطنی کے ابواب حضرت ملا شاہ پر منکشوف ہوگیے۔ حضرت میاں جیو، میاں میر کی خصوصی توجہ کی بدولت میرے مرشد کے درجات عالی ساعت بساعت بلند سے بلندتر ہوتے رہے مختصر یہ کہ میرے حضرت نے ایس سال میاں میر کی صحبت میں گذارے کہ سراسر اکسیر کا حکم رکھتی تھی اس طریقہ پر کہ جاڑوں کے موسم میں لاہور قیام فرماتے تھے اور اپنے مرشد و مولا کی خدمت میں رہکر گوناگوں سعادتوں سے بہرہ مند ہوتے تھے اور گرمیوں کے موسم میں [چونکہ حضرت والا کا مزاج بہت گرم ہے] حضرت میاں میر سے رخصت لیکر کشمیر جنت نظیر میں رونق افروز ہوتے تھے اور ریاضت فائقہ اور محنت شاقہ میں اپنے اوقات شریف بسر کرتے تھے۔

حضرت کی ایک ریاضت یہ تھی کہ حضرت میاں جیو کی خدمت میں رہتے ہوئے ایس سال تک اور چند سال اس سے پہلے اور حضرت کی وفات کے بعد بھی، کہ اس پر پانچ سال کا عرصہ بیت رہا ہے، کبھی زمین پر پاؤں پھیلاکر نہیں سوتے لیکن آجکل زمین پر پہلوئے مبارک دراز فرماتے ہیں اور پہلو بدلتے بھی ہیں لیکن حضرت والا استراحت کے عالم میں بھی کبھی سوتے نہیں اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی پلک نہیں جھپکتی یہ بات حضرت نے خود اپنی زبان مبارک سے فرمائی ہے جو عالم خواب کی نفی کرتی ہے۔

اپنے مریدوں کی طرف توجہ خاص فرماتے ہوئے حضرت نے کہا ہے

تا چند خروشم کہ بیدار شوید
بیدار شوید کہ دشمن دل خواست

کبتک بار بار شور کرتے ہوے یہ کہا جاے کہ تم بیدار رہو، جاگو اور

جاگتے رہو کہ عالم خواب دلِ بیدار کا دشمن ہے۔ حضرت والد شوریدہ دل ہوگئے ہیں اور آپ نے دنیائے فانی کی مسرتوں اور لذتوں سے بیگانگی اختیار کرلی ہے اور غایت مجاہدہ ریاضت کے باعث حتمیات توحیـــد کے معراج تک رسائی حاصل کی ہے یہ جستجو ایک نورانی صبح کی طرح حضرت کے دید و دل پر چھاگئی ہے [کہ برکات الہی وفیـــوض لاانتہائی سے عبارت ہے] علم لدنی کے دروازے اور عالم ملکوت و جبروت ولاہوت کے پراسرار پردے، حضرت کی نگاہوں سے ہٹ گیے اور تمام حقایق، آپ کے دل حق منزل، پرمنکشف ہوگیے تمام حجابات اُٹھ گیے اور میرے مرشد اپنی مرادات عالیہ اور مطالب والا تک پہنچ گیے

فرماتے ہیں کہ اس فتح باب و حصول مرادات کی اس منزل، ســـیر اس سعادت عظمٰے اور دولت حضرت تک رسائی، کسی غیر اور غربت کے احسان کے بغیر ان روشن آیات الہی کے اقتضا سے مجھے حاصل ہوئی۔

«ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم»

یہ اللہ پاک کا فضل و رحمت ہے وہ جسے چاہے رحمت فرمائے اور وہ بہت بڑا فضل کرنے والا ہے

سچ یہ ہے کہ وصـــل ذات اور حصول معنی صفا کا یہ انـــدازہ، میرے حضرت سے مخصوص ہے اور ان پر اللہ جلّ شانہ کی عنایات بے پایاں کا اظہار ہے۔ حضرت کی ذات والا صفات کی تعریف کوئی کیسے کرسکتا ہے۔ جو کچھ کہ تحریر و تقریر میں سماتا ہے یا حرف و صوت کے ملبوس میں جلوہ گر ہوتا ہے یا عقل و اوہام حس کا احاطہ کرسکتے ہیں میرے مرشـــد و مولانا حضرت ملا شاہ بدخشی کی صفات عـالیہ ان سے بالاتر بلکہ منزہ و مبـرہ ہیں حضرت والا اپنے دوستوں اور باالاخلاص مریدوں کو اس طرح کی تجرید و تفریق کی دعوت نہیں دیتے اور ان سے کبھی اتنی مشقت و ریاضت نہیں کراتے۔

میرے اخوند کا منشائے دلی تو طبیعت کی یکسوئی خواہشات کی پیروی سے اِبا اور غیر حق سے ذہن و دل کی تجرید ہے اس لیے ایک حد تک بیداری شب

کے لیے حکم فرماتے ہیں اور گاہ گاہ بطور کنایہ کہتے ہیں کہ ہمارے دوستوں کو چاہیے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھیں مراقبے اور مجاہدہ میں شریک رہیں اور اس فرمایش کے مقصد، کاہلوں اور غفلت کاروں کی تنبیہ و سرزنش ہے۔

حضرت والا آج اسرار توحید کی تفہیم اور مراتب وحدت تک رسائی کے معاملہ میں روئے زمین کے توحید پرستوں اور رموز تجرید کے نکتہ دانوں میں بے مثل و یکتا ہیں اور آپکو [وجود بحث کے] محققوں کا سربراہ اور موحدین کا امام کہا جاسکتا ہے

حضرت کی زبان صدق ترجمان اور آپکا کلام سراپا الہام، تمام تر معنی توحید کا پردہ کشا ہوتا ہے اور جو نکتے آپکی بات بات سے پیدا ہوتے ہیں، اُن سے کیفیات تجرید کی نقش گری ہوتی ہے اور حضرت والا یگانگی و قربت کے رشتے سے اتنی ہم آہنگی اور غیریت و دوئی کے احساس سے اس درجہ دوری رکھتے ہیں کہ عالم غیب سے «سبحانی ما اعظم شانی» کے خطاب سے نوازے گیے ہیں حضرت کی یہ دو رباعیاں ان معنی پر دلالت کرتی ہیں

گر ذات و صفات، در برخ شخص کشاد
شد خانہ علم و دل از بینا آباد
سلطان کہ اوست و بایزید است گداش
ما اعظم شانیش، مبارکبا باد

ذات و صفات اگر اپنا دروازہ کسی شخص پر کھول دیا اور اس کا خانۂ دل انکے علم کی روشنیوں سے آباد ہوگیا تو بلاشبہ وہ سلطان اور بایزید اس کے دروازے کا فقیر ہے اور «ما اعظم شانی» کا لقب اسے مبارک ہو۔

رباعی

انسان چو بود بستۂ تن حیوانست
اقتاد بعالم دل او انسان است

افتاد نفس در عالم دل شد
«ملا اعظم شاہ» بخشش رحمان است

روح جب وابستۂ تن ہوتی ہے تو بمنزلہ حیوان ہوتی ہے اور جب دنیا سے اس نے اپنے ہوش و خرد کے ساتھ لو لگائی تو وہ گویا انسان کا عالم اختیار کرگئی اور جب اس مادری دنیا کی محبت سمٹ کر اپنے جان و تن سے وابستہ ہوئی تو دل اس کا مرکز عشق و عقیدت ہوگیا اور ان مراحل تعلق و تمشق سے گذر کر جب احساس وجود ذات بحث اور صفات الٰہیہ آئینہ بن گیا تو سنجانی ملا اعظم شاہ کے مرتبہ تک پہنچ گیا اور اب اسکی بات سخن رحمان بن گئی

حضرت والا اپنے صاحب اسرار دوستوں اور اخلاص شعار معتقدوں کے ما سوا کسی سے ہم صحبت نہیں ہوتے۔ اور میرے مرشد کی محفل میں مشاغل قدسی اور حقیقت وحودیت کی باتوں کے ماسوا کوئی بات کسی کی زبان و لب پر نہیں آتی اور حضرت [ملا شاہ بدخشی] کی محبت کو اللہ پاک نے اثر و نفود بخشا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی سنگ دل ہو حضرت کی نظر کیمیا اثر کی برکت اور نفس گرم کی تاثیر سے اس کے قلب میں نرمی و راستی پیدا ہوجاتی ہے۔

حضرت کے روے مبارک اور پرنور پیشانی پر نظر پڑتے ہی انشراح ظاہر و باطن اور حضوری خاطر میسر آجاتی ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے مرشد کے کلام صداقت نظام میں کچھ ایسی تاثر و دل آویزی، ودیعت فرمائی ہے کہ اکثر شیعہ فرقہ کے افراد نے حضرت کے ساتھ گفتگو کی اور وہ محض آپکی باتوں سے اس قدر متاثر ہوے کہ اپنے فرقہ کے عقائد سے تائب ہوکر مذہب اہل سنت والجماعت کے پیرو ہوگیے

بہت سے اہل کفر بھی آپکی توجہات کی برکت و سعادت سے روشنی و رہنمائی حاصل کرکے اپنے مسلک کفر و کافری سے بیزار ہوکر اسلام کے دین مبین پر آگیے۔

میرے حضرت کے نفس قدسی کو اللہ پاک نے معجزے کی سی جوبی بخشی ہے

کہ وہ طالبان صادق میں سے جب کسی کو مشغول بحق فرماتے ہیں اور روز اول جب اسکو طریقۂ شغل کی تلقین کرتے ہیں تو وہ شخص آپکی توجہ کی برکت اور آپکی صحبت کی سعادت سے کچھ اس طرح بہرہور ہوتا ہے تو حضرت رسالت پناہ سرور کائنات فخر موجودات رسول مقبول صلی اللہ علیہ و سلم کو اور آپکے چاروں خلفائے راشدین کو اور اصحاب کبار (رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین) کو، جو اس مجلس میں رونق افزا ہوتے ہیں، معائنہ و مشاہدہ کرتا ہے اور وہ شخص اس مجلس پر تقدیس میں رہتے ہوئے حضرت رسالت پناہ سے ہم سخنی کے مرتبۂ خاص پر سرفراز ہوتا ہے اور اپنے مطالب کو آپ کے حضور میں پیش کرتا ہے اور آپ کے مقدس و مبارک لبوں سے اس کا جواب باصواب سنتا ہے اور اسی طرح وہ اولیاء اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اور ان کے ساتھ گفت و شنود میں حصہ لیتا ہے اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جنہیں اس مراقبۂ اول میں کشف عالم ملکوت حاصل ہوجاتا ہے اور وہ اس مجلس مقدس کی برکت سے عالم ملکوت کی سیر کرتا ہے اور وہاں کے عجائبات [عالیہ] کی سیر کرتا ہے۔

آپکے ان یاران مقبول میں سے بعض وہ بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں شعور ذات اور تصور و جدت کچھ اس طــــرح میسر آتا ہے کہ وہ حضرت کی توجہات کی برکت سے مشاہدہ و معائنہ کرتا ہے، "خیال غـــیر سے" پاک و صاف ہوجاتا ہے اور اسپر مشاہدۂ جلوۂ حق سے ایک وجد وکیف کا عالم طاری ہوتا ہے جس پر وہ رفتہ رفتہ قابو پاتا ہے اور یہ شورش احوال کچھ کم ہوتی ہے حق سبحانہ تعالے نے میرے مرشد کو وہ قوت مرحمت فرماتی ہے کہ اگر کوئی صدق و خلوص کے ساتھ یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا تک پہنچ جائے تو آپ کے نفس قدسی اثر کی بدولت وہ بہت جلد اپنی مراد کو پالیتا ہے اس معنی کو آپنے بہت سی رباعیات میں بیان کیا ہے ان میں سے چند رباعیاں تیمناً و تبرکاً یہاں پیش کی جاتی ہیں

ہر کس کہ دروغ گفت اور است گناہ
گویم سخن راست، خدا ہست گواہ
چون ملا شاہ یافت، رہے تا درگاہ
در و واست، سروے مخلص ملا شاہ

جس شخص نے جھوٹ بولا گناہ اسکی گردن پر ہے میں تو خدا گواہ ہے کہ سچ بات کررہا ہوں جب ملا شاہ کو بارگاہ الہی تک پہنچنے کا راستہ مل گیا اب جو شخص بھی ملا شاہ کا مخلص ہوگا وہ اس راستے سے دروازۂ حق تک پہنچ جائیگا

رباعی

تا مدت بیت سال درجست وجو　(کذا)
دیدیم که طاہرا بیا بیمش بو ..
تحقیق شدایں در طلب خود بودیم
معلوم شداہ رمز که خود بودیم او

بیس سال ہم نے اسکی تلاش و جستجو میں گذار دیے تو معلوم ہوا کہ ہم عالم ظاہر میں بھی اسکی خوشبو کو پاسکتے ہیں . . . یہ بات تحقیق ہے کہ ہم اسکی طلب میں بھی خود اپنی تلاش میں تھے اور بالآخر یہ راز کھلا کہ ہم خود وہ ہی تو تھے جسکو ہم ڈھونڈ رہے تھے

رباعی

اندر پئے آں نگار شوخ و سرمست
بودم که شوم ز لعل اومست الست
ناگه یکبے حجاب خود دیدیم
درسینهٔ خوه یا فتمش دست بدست

ہم اس معشوق بے ہمتا اور نگار شوخ و سرمست کی جستجو میں مارے مارے پھرتے رہے اور اس تمنا میں رہے کہ اس کے لعل شکر کے بوسہ سے کبھی ہم بھی مست الست ہوجائیں ناگاہ ہماری نظر خود اپنے اور پڑی تو احساس ہوا کہ وہ تو ہمارے دل میں بیٹھا ہے اور اس کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں ہے

رباعی

توحید ز اہل راز گردی مارا
در مسند عز و ناز کردی مارا

مارا بخشودی صفت استغنا
شاد باش چوں بے نیاز کردی مارا

تو نے اہل راز میں سے ہمیں انتخاب کیا اور عـــزت و ناز کی مسند پر جگہ دی، ہم کو بے نیازی کی صفت سے متصف کیا، اے خـــوشا عنایات کہ تو نے ہمیں «استغنا» کی دولت سے مالا مال کیا

رباعی

گـر میل دلت معرفت اللّٰہ است
از خوبی معـرفت دلت آگاہ است
اے گرسنۂ از خوان گدایاں چہ خوری
شیریں و چرب لقمہ کہ پیش شاہ است

اگر تیرا دل معرفت الٰہی کی طرف مائل ہے اور عرفان حق کی کشش سے تیرا دل حق منزل آشنا ہے۔ تو سمجھ لے کہ کوئی بھوکا گدا گروں کے دسترخوان پر بیٹھ کر کیا کھائیگا وہاں تو ہے ہی کچھ نہیں اگر تجھے مرغ و شیریں لقمہ چاہیے تو وہ بادشاہ کے دسترخوان کی چیز ہے وہیں جاکر تجھے لذت و کام ودہن میسر آئے گی

رباعی

آں کس کہ زروئے صدق دولت خواہ است
او را بسوئے دیـــر دولـت راہ است
دولت یعـــنی معـــرفت ذات مطلـــق
ایں دولت، درخانۂ ملا شـاہ است

جو شخص کہ صدق و خلوص کے ساتھ تمنائے دولت رکھتا ہے اس سے کہدو کہ در دولت کی طرف تو راستہ کھلا ہے۔ دولت دراصل معـرفت ذات مطلق ہے اور یہ دولت بیدار ملا شاہ کے در دولت سے میسر آتی ہے۔

رباعی

آنکس که ر راه معرفت آگاه است
ملا شاه است که عارف این راه است
ار تاثیر ربان او معلوم است
کمر رور ملقب، ملسان الله است

حو شخص که راه معرفت سے آگاہی رکھتا ہے وہ ملا شاہ ہے که نشیب و فرار سے بخوبی واقف ہے اسکی رباں کی تاثیر سے معلوم ہوتا ہے که وہ آج «لسان الله» کے لقب سے بجا طور پر ملقب ہے۔

رباعی

ار حق بسما برول اسماء گردد
اسمے در حور کس مہیا گردد،،
نامم بامید و دولت شاہی داد،،
تا اسم موافق مسمے گردد،،

سراپردۂ بارگاہ حق سے حب آسمانوں پر برول اسما ہوتا ہے اور حو نام حس شخص کے مناسب ہوتا ہے وہ اسکو دیا جاتا ہے اس وقت میں میرا نام بادشاہ رکھا گیا اور مجھے دولت شاہی عطا کی گئی تاکہ میرا نام مجھے اسم کے ساتھ اسم بامسمّی ہوجائے

رباعی

مارا نه متاع دنیا و نه عقبی نیز
بے سامانیم مفلس و بے ہمه چیز
گفتن نه تواں دروغ، آرے داریم
ساماں بحق رسانیدن یار عزیز

ہمیں متاع دنیا و عقبی کچھ بھی تو حاصل نہیں، ہم بے سامان مفلس اور بے چیز ہیں لیکن اسپر بھی یہ جھوٹ نہیں کہ ہم اپنے یار عزیز کو حق تک پہنچانے کے لیے تمام نو سار و ساماں رکھتے ہیں۔

رباعی

اے کردہ فراز رحمت و راحت را
وے بردہ فر و ریاضت و محنت را
شاہا کہ تو در چشیم زدن بنمائی
تا عرش و فرش و دوزخ و جنت را

اے کہ تو نے راحت و راحت کے درجہ کو بلند اور ریاضت و محنت کو پست کر دیا ہے۔ اے بادشاہ تو پلک جھپکنے میں عرش و فرش اور دوزخ و جنت کو دکھلا دیتا ہے

رباعی

شاہا شک نیست ز اہل عرفانی تو
اندر توحیــــد در نکتہ دانی تو
یاران تو مرد مردا بند امروز
این تحقیق ہست شاہ مردانی تو

اے ملا شاہ، اس میں شک نہیں کہ تو اہل عرفان میں سے ہے اور رموز توحید کی عقدہ کشائی میں تو بے مثل ہے آج اے ملا شاہ تیرے دو میداں ہیں اور یہ بات تحقیق ہے کہ یہ سب اس لیے ہے کہ تو دو میداں ہے

رباعی

شاہا داری خانــــۂ دلہا آباد
آباد ترا خانــــۂ آبادی باد
این سان کہ تونی مفتح دلہا استاد
فتاح القلب، با یدت نام نہاد

اے ملا شاہ تو اپنی نگاہ معرفت آگاہ سے دلوں کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ اللہ پاک تیرے دل عشق منزل کو بھی آباد رکھے۔ جس طرح تو دلوں کی گرہ کشائی میں درجہ استادی رکھتا ہے اس کے اعتبار سے تو تیرا نام «فتاح القلب» رکھا جانا چاہیے

رباعی

از ظلمت رست ہر کہ روئے مہ دید
روئے مہ دید اوہم روئے نہ دید
ز اخلاص دوست ہر کہ روئے شہ دید
از ہر طرفے کہ دید وجہ اللہ دید

جس شخص نے ماہ تاباں کا رخ تاباں کو دیکھ لیا وہ اندھیروں سے چھٹکارا پاگیا اور جب چاند پر نظر پڑگئی تو باقی چیزیں نے دید رہ گئیں [کہ ان پر نظر داری کی ضرورت نہ رہی] جس نے اخلاص درست کے ساتھ ملا شاہ کے چہرے کو دیکھ لیا اب جس طرف اسکی نظر گئی سوائے «وجہ اللہ» کے اسے کچھ نظر نہ آیا

میرے حضرت ملا شاہ اپنے حال باکمال اور مرتبۂ جاہ و جلال کے مطابق بہت ہی دقیق اور بلند باتیں کہتے ہیں اور جس شخص کے مشام جا میں فی الجملہ بوئے عرفاں پہنچ چکی ہے اور حقیقت کی چاشنی جس کے کام و دہن کو میسر آگئی ہے وہ یہ جان سکتا ہے کہ حضرت والا کیا فرماتے ہیں جس ظاہر پرست و صورت بیں گروہ نے اپنے اعتقاد کے مطابق ان کے دیدۂ بصیرت سے انکار کو روا رکھا ہے وہ راہ حق سے غافل ہے میرے حضرت نے اس جماعت کے حق میں یہ فرمایا ہے

آنہا کہ ندارند سر لطف بہ من
در اعمال من ہمہ دارند سخن
قائل شریعت محمد ہستند
لیکن نہ طریقت محمد دشمن»

جو لوگ مجھ سے لطف و مہربانی کا رشتہ نہیں رکھتے اور میرے افعال و اعمال پر جو حرف گیری کرتے ہیں وہ شریعت محمدی کے قائل ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ وہ طریقت محمدی کے دشمن ہیں

حضرت ارشاد پناہ مرشدی ملا شاہ آج قطب زماں اور ہمارے اپنے عہد کے غوث دوراں ہیں ، اور طالبان حق کے مس وجود کو کندن بنانے کے لئے اکسیر کا حکم رکھتے ہیں اور آج دنیا گویا ان کے وجود منفرد کے سہارے قائم ہے « وہ سعادت مند کتنے خوش قسمت و ارجمند ہیں کہ حضرت والا کے ارادت مندوں کے نورانی حلقہ میں شامل ہیں » ان ارادت مندوں نے آپ سے تعلق خاطر اور رشتۂ عقیدت کو اپنا حرز جاں بنا رکھا ہے اور آپ کے دامن مراد کو اپنی ارادت مندی کے ہاتھوں سے تھامے ہوئے ہیں۔ اور دین و دنیا میں اپنا مقتدا اور پیشوا قرار دیا ہے۔ مریدوں کی تربیت و پرداخت کا جو ملکہ حضرت کو بارگاہ قدسیت پناہ سے بخشا گیا ہے وہ برسوں قرنوں میں جاکر کہیں ملتا ہے۔

رہر کس نباید ایں استاد شاگردی ، نہ ہر گوہر
بدخشاں باشد ، و ہر سنگ ریزہ ، لعل رخشانش

ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں کہ وہ اس طرح استاد بنے اور اس درجہ پر شاگردی کا حق ادا کرے نہ ہر موتی بدخشاں سے آتا ہے اور ہر سنگ ریزہ لعل ژمانی کی شکل اختیار کرتا ہے۔

حضرت والا خود اپنی زبان مبارک سے فرماتے ہیں کہ میری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی اور نہ اللہ پاک نے مجھے کسی ایسی بیماری یا عارضہ میں مبتلا کیا کہ میں ادائیگی نماز سے قاصر رہوں میں نے ہمیشہ وقت پر نماز ادا کی ہے اور آج تک یہی صورت ہے آپ اس بات کی طرف خصوصاً بہت توجہ فرما رہتے ہیں کہ نماز وقت پر ادا کی جائے اور باجماعت ادا کی جائے۔

ملا محمد سعید کی موجودگی میں کسی دوسرے کو اقامت کے فرائض نہیں سونپتے [کہ وہ حضرت والا کے مریدان خاص اور یاران باالاخلاص میں سے ہیں] [اور صاحب ریاضت و مجاہدہ اور اہل حال و مقامات عالیہ ہیں] اور جب ملا محمد سعید نہیں ہوتے تو خود اقامت فرماتے ہیں اور ظاہر شریعت کی متابعت پر بہت زور دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شریعت میں ظاہر و باطن کا کوئی فرق و امتیاز نہیں

پس ہر مسلمان اور سالک راہ حق کو چاہیے کہ وہ خود کو ظاہر شریعت سے آراستہ رکھے اور اپنے باطن کو شریعت کے باطن کے مطابق [کہ وہ عین مطابق ہے] ڈھالنے کی سعی کرے۔

فرماتے ہیں کہ اکثر علمائے ظاہر، کہ راہ معرفت اور طریق حقیقت کی بو، ان کے مشام جاں تک نہیں پہنچی ہے، ہم پر طعنہ زنی اور حرف گیری کرتے ہیں۔ حضرت ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم سے کوئی امر خلاف شریعت سرزد نہیں ہوا جسے مذہب کے منافی کہا جاسکے اور اگر ایسا ہے تو ہمیں بتلائیں تاکہ ہم بھی جان لیں کہ ہم فلاں کام خلاف شرع کررہے ہیں، یا کرتے رہے ہیں لیکن چونکہ یہ سب باتیں وہ از راہ گمان کرتے ہیں اس لئے وہ اپنے دعووں کے حق میں کوئی دلیل فراہم نہیں کرسکتے۔

میرے حضرت کی سیرت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ اہل دنیا، خاص طور پر سلاطین و امرا، سے نذر و نیاز قبول نہیں کرتے اگر کبھی ایسا کرتے بھی ہیں تو ایک دو روپیہ سے زیادہ نہیں آپ کے مخلصوں اور مریدوں میں سے ہر ایک آپ پر دل و جان نچھاور کرتا ہے، مال و متاع بھلا کیا چیز ہے؟ وہ لوگ جو بھی تھوڑی بہت فتوح یا نذرانہ لیکر آتے ہیں آپ اسے قبول فرمالیتے ہیں اور اسے دوسروںکی مدد و تعاون پر صرف کرتے ہیں۔

آجکل آپ کی خدمت میں ایک یا دو شخص بطور خادم رہتے ہیں اوائل میں کوئی خادم باقاعدہ نہیں رہتا تھا، ہاں اہل ارادت حضرت کے احوال پر نظر رکھتے تھے اس دور میں حضرت بہت ہی خلوص دوست اور تنہائی پسند تھے اور تجرید و تفرید کا تصور حضرت کے ذہن و زندگی پر غالب تھا

حضرت اکثر دو زانو بیٹھتے ہیں گاہ گاہ حضرت کی نشست چار زانو اور کبھی کبھی تکیہ کے سہارے سے بھی ہوتی ہے اور کبھی پاؤں پھیلا لیتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چاندنی رات میں نشست رہتی ہے اور کبھی تاریک گوشہ کو پسند فرماتے ہیں۔

جب کوئی شخص حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو دریافت احوال کے لیے اس سے دو تین باتیں پوچھتے ہیں. تمہارا نام کیا ہے. تم کہاں سے آرہے ہو. اس کے بعد دست مبارک فاتحہ کے لیے اُٹھاتے ہیں اور اس شخص کو رخصت فرما دیتے ہیں لیکن حضرت کے مخلص دوستوں اور ارادت مند ساتھیوں کی جو جماعت آپ کی خدمت میں رہتی ہے اس کی بات الگ ہے وہ صبح و شام خدمت سراپا سعادت میں حاضر رہ کر کسب فیوض و برکات کرتے ہیں اور گویا ہمہ وقت دیدار فیض آثار سے نوازے جاتے ہیں.

آپ کے احوال شریفہ کے بارے میں یہ بات خصوصیت سے کہی جاسکتی ہے کہ آپ کی زندگی دوام حضوری اور مشاہدۂ ذات مطلق کی محویت سے عبارت ہے آپ کا کھانا ، پینا ، بیٹھنا ، اٹھنا غرض کوئی عمل بھی اس سے خالی نہیں اس لیے ہمیشہ خوش وقت شگفتہ خاطر اور تبسم بہ لب رہتے ہیں اور طبیعت کی بندمرگی اور بے کیفی آپ کے یہاں دیکھنے میں نہیں آتی. کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرط انبساط میں آپ قہقہہ لگالیتے ہیں اور گاہ گاہ حضرت رسول مقبول کی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آپ اپنے قریبی دوستوں سے « مزاح المومنین» کے طور پر کچھ باتیں کرلیتے ہیں، چونکہ حضرت والا کو دوام مشاہدہ کی سعادت بھی میسر ہے اس لیے لطف و ظرافت کی باتیں بھی توحید اور نکتہ ہائے معرفت سے خالی نہیں ہوتیں.

آپ ہمیشہ بیدار رہتے ہیں اور جب گویہ دیـــدو دید کا سلسلۂ آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے تب بھی کسل و کاہلی یا نیند کا علبہ کہ لازمۂ بشریت ہے آپ کی روشن آنکھوں نور سے بھری پیشانی اور پاکیزہ بشرے سے ظاہر نہیں ہوتا.

حضرت کے وضو کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اکثر اپنے دست مبارک سے پانی ڈالتے اور وضو فرماتے ہیں اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی خادم آپ کو وضو کرائے. حضرت والا کا لباس یہ ہے کہ آپ خرقہ نہیں پہنتے ، جامہ ، زیب تن فرماتے ہیں اور اہل ولایت کی روش کے مطابق پھینٹے دار پگـــڑی باندھتے ہیں.

دستار ہمیشہ سفید ہوتی ہے اور اس کے نیچے " طاقی " رکھتے ہیں رنگین کپڑے کی دستار پسند نہیں فرماتے کبھی گول طاقی گرہ کی ہوا کے اپنے سر پر رکھتے ہیں اور کبھی طاقی کے گرد سرپیچ باندھتے ہیں

کپڑوں میں کوئی خاص اہتمام نہیں برتتے کم قیمت و بیش قیمت جیسا بھی کپڑا مل جاتا ہے پہن لیتے ہیں اکثر برمہ کا جامہ پہنتے ہیں کہ کشمیر کی ہوا بہت ٹھنڈی ہوتی ہے ۔

کھانے کی قسم کی کوئی شے آپکی منزل گاہ میں نہیں پکتی مریداں باخلاص اور یاران ذوی الاختصاص میں جو شخص بھی (حصول سعادت کے لیے) اپنے گھر سے جو کھانا لے آتا ہے آپ اسے رغبت کے ساتھ تناول فرمالیتے ہیں حضرت کے ارادت مندوں اور معتقدوں میں سے کوئی شخص اگر از راہ اخلاص دعوت آش دیتا ہے تو آپ بی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مقدس پر عمل کرتے ہوئے اسے قبول فرماتے اور اس کے گھر تشریف لے جاتے اور جو ماحضر وہ پیش کرتا ہے اسے نوش جان فرماتے ہیں

اور کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ ملکر ایک وقت کھانا کھاتے ہیں کبھی دو وقت ، طعام لذیذ ہو یا غیر لذیذ اسکی کوئی خاص اہمیت نہیں کبھی سیر تماشے کے لئے صحرا کی طرف بھی نکل جاتے ہیں اگر اس سیر دشت و صحرا کے مابین کھانے کے لیے کوئی چیز میسر نہیں آتی تو بے طعام رہتے ہیں۔ چونکہ آپ کی طبیعت میں گرمی بہت ہے اس لیے ہمیشہ ٹھنڈی چیزیں زیادہ کھاتے ہیں

چونکہ کشمیر دلپذیر کے اطراف و جوانب کا علاقہ بہت ہی سرسبز و خوش ہوا ہے اور طراوت و لطافت میں اپنی نظیر آپ ہے اس لیے حضرت والا اس دل آویز خطہ کی دید ، شاداب وادیوں کی سیر اور ان وادیوں میں گذرتی جوئباروں اور نہروں کے تماشے کے لیے جب نکلتے ہیں [کہ یہ اللہ پاک کی بہترین کاری گری و صنعت کی سیر ہے] اطراف شہر میں بھی تشریف لے جاتے ہیں اور چند روز شہر سے باہر رہ کر پھر اپنے مبارک قدموں اور وجود مسعود سے شہر اور اہل شہر کو

عزت بخشتے ہیں

کبھی گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور اکثر بے تکلفی کے ساتھ پیادہ پا سیر وسفر کے لیے نکل جاتے ہیں اس ملک کی سواری تو کشتی ہے اس لیے آپ گاہ گاہ کشتی میں بیٹھ کر بھی سفر کرتے ہیں۔

میرے مرشد حضرت ملا شاہ کے خوارق عادات بے شمار ہیں اور ان کو گنا نہیں جاسکتا اگر کوئی شخص ان میں سے کچھ کو بھی لکھنے بیٹھے تو کتاب تیار ہوجائے چونکہ حضرت کو ان کا اظہار فرمانا اچھا نہیں لگتا اس لیے انہیں لکھنے سے منع فرماتے ہیں حضرت کی سہل ترین کرامت یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے طالب کے باطن میں ہوتا ہے آپ ایک سطر میں اسے ظاہر فرمادیتے ہیں۔ حضرت کی یہ رباعی اسپر دلالت کرتی ہے

رباعی

چوں لاف موحدی زنی در ہر گو
باطن، ظاہر ساز، رکس ہر رہ مگو
در عالم دل «کن فیکون» پیدا کن
وحدت داری کن فیکون مگو»

تو جب توحید پرستی کا دعویٰ کرتا ہے اور اسی ایک نکتہ پر تونے ارتکاز اختیار کیا ہے تو گنبد کی طرح اب لڑھکتے پھرنے سے کیا فائدہ۔ جو باطن ہے اس کو ظاہر کرنا باقی ہر آدمی سے ادھر ادھر کی بات، ہرزہ گوئی سے زیادہ کچھ نہیں۔ عالم دل میں کن فیکون کی صورت پیدا کر، جب تجھے رمز وحدت کی شناسائی مل گئی تو اب «کن فیکون» کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی

میرے مرشد حضرت ملا شاہ کار مسیحائی کرتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تو کبھی کبھی مردوںکو زندہ کرتے تھے آپ ہیں کہ مردہ دلوںکو ہمیشہ کے لیے زندگی بخشتے ہیں غفلت، آدمی کے لیے موت سے بدتر ہے اور حضرت کے انفاس مقدس کی برکت سے غفلت طالبان کمال کے دل سے ہمیشہ کے لیے زایل ہوگئی زندگی اسی بات کا اظہار اور اسی حقیقت کی روشن علامت

وہی تو ہے۔

میرے مرشد حضرت ملا شاہ بدخشی کو اللہ پاک نے یہ قدرت و قوت بھی ودیعت فرمائی ہے کہ وہ اگر چاہیں، تو اس حدیث نبوی کے بموجب کہ «میری امت کے علما انبیاے بنی اسرائیل کی طرح ہیں» [علماءُ اُمتی کا نبیاے اسرائیل] مردۂ ظاہری کو زندہ فرمادیں لیکن آپ کرامات کی طرف توجہ فرما نہیں ہوتے بلکہ اس کے درپے رہتے ہیں کہ اپنی کرامات اور خوارق عادات کو دنیا سے چھپائے رکھیں، اور کبھی کبھی تو یہ مصرع بے اختیار آپ کی زبان صدق ترجمان پر آتا ہے۔

مصرعہ کشف را، کشف ساز و بر سر زن

کشف کو کشش بھی خوبا بنالے اور اپنے نفس کے سر پر مار

اور تقریباً بیس سال ہوگیے کہ حضرت والا نے (اللہ پاک آپ کو سلامت باکرامت رکھے) شہر کشمیر (سری نگر) کو اپناوطن بنالیا ہے اور اس طرح وہ سرزمین حضرت کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے رشک آسمان بنی ہوئی ہے آپ نے یہ رباعی اپنے قیام کشمیر سے متعلق فرمائی ہے

رباعی

افتاد بگوشۂ عالم عالم گیرم
واں گوشۂ بکشمیر بدو تعبیرم
شمع بدروں کورۂ روشن شد
ماہی بدروں چاہ شد دلگیرم

میں نے یہ خواب دیکھا تھا میں ایک گوشہ میں پڑا ہوں اور دنیا جہان میرے تصرف میں ہے۔ وہ گوشہ، شہر کشمیر ہے جو میرے اس خواب کی تعبیر بن گیا میری مثال اس شمع کی سی ہے جسے کسی کو زہ میں روشن کردیا گیا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ میں وہ مچھلی ہوں کہ وہ پانی میں تو ہے لیکن دجلہ و دریا میں نہیں کنویں میں ہے

الحق کہ حضرت والا اب سوائے کشمیر کے کہ وہ ایک گوشۂ ولایت ہے کہیں ادھر نہیں جاتے اور وہیں رونق افروز رہتے ہیں۔ اور وہیں سے ایک عالم ان سے فیض اُٹھاتا ہے اور حضرت کے سلسلہ سے وابستہ اہل ارادت [اللہ پاک آپ کو بقا و مسند امتی عطا فرمائے] آپ کی نظر کیمیا اثر اور الماس قدسی کی بدولت صاحبان کمال اور اہل مرادات بن گیے ہیں۔

لیکن آج حضرت کے مریدوں اور مخلصوں میں سے ملا محمد سعید اپنے ہم چشموں میں سب سے ممتاز اور سربر آوردہ ہیں ان کی اصل بھی روشتاق۔ علاقہ بدخشاں سے ہے اور حضرت والا سے بہت خویشی بھی رکھتے ہیں۔ آپکی خدمت میں رہ کر انہوں نے علوم ظاہری و باطنی کا خزانہ جمع کرلیا ہے اور صاحب مقامات و مراتب عالیہ بن گیے ہیں اور حضرت والا آپ کے حال پر توجہ فرماتے ہیں۔

اگر ملا محمد سعید حاضر ہوتے ہیں تو کسی دوسرے کو کار امامت سپرد نہیں فرماتے، ملا صاحب کا بہت ادب کرتے ہیں چونکہ حضرت کی رہائش گاہ ملا محمد سعید کے مکان کے قریب ہے تو اکثر اپنی تشریف آوری سے ان کی عزت بڑھاتے ہیں اور ان کے بیٹوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے ہیں اور بہت لطف و مہربانی سے پیش آتے ہیں

حضرت والا کے صاحب نسبت مریدوں میں دوسرے ملا مسکین ہیں وہ بھی ملک بدخشاں کے رہنے والے ہیں صاحب ریاضت و اہل مجاہدہ اور اہل حال و مقامات جلیلہ سے ہیں اور اپنے مریدوں میں سے حضرت والاً جن کو ابتداً تلقین و ارشاد کی منزل سے گذارتے ہیں انہیں ملا محمد سعید اور ملا مسکین ہی کے سپردکرتے ہیں کہ انہیں مشغول کریں (یعنی توجہ فرمائیں اور ذکر و شغل کی تلقین کریں)

ملا مسکین بھی علوم ظاہری سے حصۂ وافر رکھتے ہیں اور علوم باطنی کو حضرت کی خدمت کی برکت اور شرف ملازمت کے باعث انہوں نے بڑے پیمانہ پر اکتساب کیا ہے ۔ اوایل حال میں یہ سپاہی تھے جب طلب راہ حق اور خداجوئی کا خیال ان پر غالب آگیا تو سپاہ گری کو ترک کیا دس سال تک وہ اسی جستجو

میں رہے اور کئی مرتبہ اس خیال سے حضرت غفران پناہ، پیر دستگیر، میاں میر قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں بھی پہنچے مرید کرنے اور مشغول فرمانے کی درخواست کی ملا مسکین کی طرف سے اس التماس نے شرف قبولیت حاصل نہیں کیا تب آپ اُدھر سے مایوس ہوکر میرے اخوند حضرت ملا شاہ کی خدمت میں آئے

حضرت والا نے شروع شروع میں اس خواہش کو رد کیا یہاں تک کہ جب آخری بار حضرت کی خدمت میں باریاب ہوے اور حضرت والا نے ان کو طلب و ارادت میں پوری طرح راسخ و واثق پایا راست نہاد اور ثابت قدم دیکھا تو ان راہ عنایت قبول کرتے ہوے انکو اپنا مرید کیا اور «مشغول» فرمایا چنانچہ بہت تھوڑی سی مدت میں ملا مسکین عارف کامل بن گئے آج کل کشمیر میں قیام ہے اور شب و روز آستان سعادت حاضر رہتے ہیں میں اللہ تعالیٰ کے کرم نے عنایت سے امیدوار ہوں کہ مجھے بھی یہ دولت ارزانی فرمانی جائیگی اب اس کے ماسوا کوئی خیال اور خواہش میرے دل میں خطور نہیں کرتی

میرے مرشد حضرت ملا شاہ بدخشی کے دوسرے سعادت مند مریدوں میں ملا محمد حلیم ہیں کہ ان کو آپ نے اپنا بیٹا بنالیا ہے اور فرزندی کے اس خطاب سے دین و دنیا میں سربلندی بخشی

محمد حلیم کا نام گل بیگ ہے وہ بھی ولایت بدخشاں سے تعلق رکھتے ہیں حضرت والا دوسرے اہل ارادت کی بہ نسبت محمد حلیم کے ساتھ زیادہ مہربانی و عنایت فرمائی سے پیش آتے ہیں اور توجہ باطنی اور اعتقاد دلی بھی انکی طرف کچھ زیادہ ہے

آپنے انکو مشغول کیا ہے اور حضرت کے اپنے طریق میں جو مجاہدات اور ریاضتیں آتی ہیں محمد حلیم نے وہ سب کی ہیں اور انکا سلسلہ جاری ہے اس کے نتیجہ میں وہ صاحب حالات و مقامات ہوگیے ہیں

حضرت والا محمد حلیم کی بہت تعریف فرماتے ہیں اور وہ آپکی خدمت سراپا سعادت میں مثل اپنے سرورگ باپ کے، دوسروںکی بہ نسبت زیادہ قریب ہوتے

ہیں حضرت والا نے انکو نوکری کرنے کی اجازت بھی دے رکھی ہے اسی لیے وہ جوان سپاہی پیشہ ہیں

دوسرے مریدوں میں ملا محمد امین کشمیری ، ملا عبدالغنی کشمیری و ملا حبیب اللہ [کہ وہ سب صاحب علوم ظاہری و باطنی ہیں] اور حضرت ملا شاہ (صاحب) نے اس گروہ حق پردہ کے حق میں یہ رباعی فرمائی ہے ،

رباعی

اے تافتہ بر روئے تو نورے ز الہٰ
زاں نور ، بر روئے ہم بکشائی راہ
یاران تو اولیاے وقتند ہمہ ،
نازم بتو شاہ اولیاء ملا شاہ

اے کہ ترے چہرے پر انوار الٰہیہ کا پرتو موجود ہے اس نور سے تو دوسرونکو منور و بہرہ ور کر - ترے دوست تو سبھی اپنے وقت کے اولیاء اللہ ہیں اے ملا شاہ تو شاہ اولیاء اللہ ہے ، میں تجھ پر فخر و ناز کرتا ہوں

ان کے ماسوا بھی بہت ہیں کہ حالات عالیا اور مقامات عالیہ پر متاثر ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے میرے مرشد کی خدمت و ملازمت کو سرتاسر موجب برکت و سعادت گردانا ہے ، اپنے اوقات شریف میں داخل اور جماعۂ سوارمات تصور کیا ہے اور اسی وسیلے سے انہوں نے سعادت دارین و مرادات کو بہیں حاصل کی ہیں

ان میں سے ہر ایک سے حالات کی تحریر و نگارش پر اگر توجہ دوں تو یہ رسالۃ جسکا اختصار اس صحیفہ کے پیش نہاد خاطر ہے طول کو پہنچیگا اور دفتر دفتر ہوجائیگا اس لیے اسی مختصر بیان پر اکتفا کیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

جناب عبدالمجید باٹکا
جنرل سیکریٹری، انجمن اسلام بمبئی (۱)

انجمن اسلام بمبئی کے مدرسہ کی اولین عمارت

دنیا میں عظیم الشان عمارتیں ایک متعین مقصد کے لئے تعمیر کی جاتی ہیں مرور ایام سے وہ آثار قدیمہ بن جاتی ہیں یہ آثار اپنے دور کی سچی تصویر ہوتے ہیں اس آئینہ میں اس عہد کے تمام معاشرتی حالات، اقتصادی اشارات، ذہنی و فکری رجحانات اور دینی و دنیاوی میلانات کے خط و خال نہایت صاف نظر آتے ہیں یہ آثار اپنے زمانوں کی جد و جہد کی داستاں اور عظمت و جبروت کے واقعات سناتے ہیں ان میں عوام و خواص کے مسائل کے حل کی تدبیریں پوشیدہ ہیں اور یہ تعمیر کے حسن کارانہ تمنا کا بامعنی اظہار ہیں

انجمن اسلام بمبئی کے مدرسہ کی اولین عمارت، قدیم آثار کا ایک ایسا ہی نمونہ ہے اس کے اندرونی و بیرونی مناظر ہر ناظر کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتے اور اس کے دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں اور اس کی فکر و نظر کے سامنے تاریخ کا وہ دور پیش کرتے ہیں

جب سرسید نے ملک کے گوشہ گوشہ میں سفر کرکے مسلمانوں کو علم و فن کی تحصیل کی ترغیب دی عوام و خواص کے مختلف مسائل کے حل پیش کئے اور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ان میں بیداری پیدا کی اپنے زورِ بازو سے طوفان کے دھارے موڑے اور قوم کی ڈوبتی کشتی کو کنارے لے آئے ٹھیک اسی زمانے میں، بمبئی (مہاراشٹر) کے علاقے میں ایسے ہی ایک ناخدا، رہنما بدر الدین طیب جی نے مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب کی طرف خصوصی توجہ کی ہندوستان کی سیاسی اور تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لیا جنگ آزادی کے تاریخ کے صفحات اس کے گواہ ہیں

بدرالدین طیب جی نے ایک انجمن کی بنا ڈالی جس کے وہ صدر تھے۔ ان کی

بڑی خوبی یہ تھی کہ جب انہوں نے قوم کی فلاح و بہبودی کے لئے قدم اٹھایا تو لوگوں کے اعتراضات اور ملامت کی پرواہ نہ کی سن ۱۹۰۳ع میں وہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر تھے اس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تھا۔ ان کے نام سرسید کے خطوط سے ان کی عزت و عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بعد انجمن اسلام، ملک کا دوسرا قدیم اسلامی تعلیمی ادارہ ہے اس ادارہ نے تعلیم و تہذیب، ثقافت و سیاست غرض ہر میدان میں ملک و قوم کی گراں بہا خدمت انجام دی ہیں انجمن کی تعمیرات کی چاردیواری میں ہماری جدو جہد، جمود و پیش قدمی، شور و سکوت، سود و زیاں، نیک خدمات اور صالح اعمال کی تاریخ محفوظ ہے یہ ادارہ ہمارا قومی ورثہ ہے اس کا فیض دائم و قائم ہے۔ اس کی ماضی کی روایات شاندار، حال روشن اور مستقبل تاب ناک ہے

بوری بندر، وکٹوریہ ٹرمینس ٹائمز آف انڈیا کے دفتر کے قریب، اس انجمن کی اولین تعلیم گاہ، اسلامی طرز کی ایک حسین و جمیل عمارت ہے۔ اس کی خوبصورتی اور دیدہ زیبی، دلکشی اور رعنائی ہر دیکھنے والے کی نظر کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اس کے بلند مینار اور باب داخلہ پرشکوہ ہیں

یہ اولین درسگاہ، ایک وسیع قطعۂ زمین پر واقع ہے اس کے سامنے کے رخ پر، پتھر اور چونے کی نیم گری دیوار پر، لوہے کے جنگلے لگے ہیں دو بڑے آہنی دروازے ہیں اور ایک ذیلی دروازہ ہے اس کے بانیوں نے اس کے صحن میں سورج اور علم کی روشنی کے لئے مختصر دیواریں بنوائیں ان دروازوں کے ستونوں پر قبّہ نما ٹھوس گنبد ہیں داخل ہوتے ہی نظر ایک سرسبز و شاداب قطعۂ زمین پر ٹھہر جاتی ہے یہ کرکٹ کا لان ہے۔ باغیچہ کے غنچے اور پھول ہر آنے والے کا استقبال کرتے ہیں یہاں انسانی زندہ پھول اور غنچے بھی نظر آئیں گے کچھ لکھنے پڑھنے میں محو اور کچھ کھیل کود میں مصروف ہیں اس درسگاہ سے صدہا نامور ادیب، شاعر، سیاست داں، حکیم، ڈاکٹر، بیرسٹر اور وکیل نکلے ہیں۔ جن کی ملکی و ملّی خدمات پر ہم بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں۔

اس عمارت کے دائیں طرف ایک نئی عمارت ہے جو عصری تعلیمی تقاضوں

کے پیش نظر وجود میں آئی ہے۔ ایک بلند عمارت کے باب داخلہ پر، ایک منقش چوبی سرنامہ ہے۔ جس کے نقش و نگار بیل بوٹے نازک اور باریک ہیں۔ اس کے عقب میں اکبر پیر بھائی گرلس پالی ٹیکنک ہے۔

اس حسین و جمیل عمارت کے دونوں بازوؤں پر دو مینار اور باب داخلہ پر عجیب ساخت کا ایک بلند مینار ہے۔

باب داخلہ کا پرشکوہ مینار، چار مربع اور ایک مدور حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں مستحکم چوبی دروازہ ہے۔ دوسرے مربع حصہ پر تین محراب والے اور دو محراب والے مربع کمرے ہیں۔ یہاں عمارت، کریمی لائبریری کے ہال کی چھت سے اوپر اٹھتے ہوئے تین محراب والے ایک مربع کمرے تک چلی جاتی ہے۔ مینار کے مربع تعمیرات کی یہ طرز ہے۔ چوتھے تین محراب والے کمرہ پر ایک چوکور چھجہ ہے۔ جو کنگوروں کی ایک قطار پر لگا ہوا ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں۔ بڑے مینار کی مختصر شکل ہیں۔ ان کے گنبد ٹھوس ہیں۔ اس چھجہ پر گنبد کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس کی بڑی اور چھوٹی محراب والے دو حصے ہشت پہل مثمن ہیں۔ ان کی پتھر کی نازک اور نفیس جالیاں ہیں جو مختلف اقلیدسی اشکال بناتی ہیں۔ ان دونوں حصوں پر سے گنبد شروع ہوتا ہے۔ مدور گنبد تین حصوں میں منقسم ہے۔ خاکستری پتھر کی پھول دار پٹی، سفید پھول کی بھورے پتھر کی پٹی، اور لال رنگ کے پھولوں اور بیل بوٹوں والی پٹی۔

یہ پٹیاں مدور (گول) ہیں۔ پھولوں میں تناسب اور یکسانیت ہے۔ ان پر سے ایک دم گولائی لئے ہوئے گنبد کا حصہ شروع ہوجاتا ہے۔ جو کوہان نما مخروطی شکل کے حصوں پر جاکر ختم ہوتا ہے۔ گنبد کے رنگین نقش و نگار مٹ گئے ہیں دھندلے نشان پتہ دیتے ہیں۔ اوپر سفید کلس کا نشان ہے۔

اس عظیم الشان مینار کے باب داخلہ کے قریب تاریخ کے چند گوشے اور نوادرات دکھائی دیتے ہیں۔

ایک خوبصورت منقش چوبی ایستادہ پر ایک پرانا گھنٹہ لٹکا ہوا ہے۔ جس کا گجر تعلیم کے نظام اوقات کی تبدیلی کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ برسوں سے یہ گھنٹہ اپنا کام کررہا ہے۔ ان دنوں اس کی جگہ الیکٹرک بیل نے لے لی ہے۔ مگر عام تعطیل یا اچانک تعطیل کے موقعوں پر اس کی آواز کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتی ہے۔

چھت میں ایک منقش، خوبصورت جالی دار، پیتل کا فانوس آویزاں ہے یہ اس پرانے فانوس کی یاد دلاتا ہے جو یہاں سے غائب ہوگیا ہے۔

اندر دونوں طرف، دیوار میں سنگ مرمر پر انگریزی اور فارسی میں دو کتبات ہیں:

"ملکۂ وکٹوریہ کے عہد میں انجمن اسلام کی مساعی اور اہل اسلام کی اعانت سے اس مدرسہ کی بنیاد پڑی۔ حکومت بمبئی نے اس قطعۂ زمین کی بخشش کے علاوہ اڑتیس ہزار روپیہ کی امداد کی۔ اس کا سنگ بنیاد ۹ شعبان ۱۳۰۷ ھ مطابق ۳۱ مارچ ۱۸۹۰ء کو گورنر بمبئی لارڈ رے نے رکھا اور اختتام تعمیر کے بعد رسم افتتاح ۱۰ شعبان ۱۳۱۰ ھ مطابق ۲۷ فروری ۱۸۹۳ء کو گورنر بمبئی لارڈ ہیرس نے کی۔ معماری کے فرائض پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ نے انجام دئے۔ کل ایک لاکھ بتیس ہزار روپیہ خرچ ہوا"[1]

---

۱ - الحمد للہ والمنة — کہ ایں عمارت کہ مبارکہ انجمن اسلام است دریں زمان دولت اعلیحضرت پادشاہ انگلستان و قیصر ہندوستان ملکۂ معظمہ الشان وکٹوریہ بمساعی انجمن اسلام و اعانت اہل اسلام بنا شدہ و سرکار عظمت مدار دارالحکومہ بمبئی علاوہ بر بخشش یکقطعہ زمین گران بہا کہ ایں عمارت برآں قائمست مبلغ سی و ہشتہزار روپیہ امداد فرمودہ سنگ اساسش بتاریخ نہم شعبان ۱۳۰۷ ہزار و سیصد و ہفت ہجری مطابق بتاریخ سی و یکم مارچ ۱۸۹۰ ہزار و ہشتصد و نود عیسوی بدست نواب مستطاب لارد ری بہادر گورنر بمبئی نہادہ شدہ و پس از اختتام تعمیر رسم افتتاحش بتاریخ دہم ماہ شعبان ۱۳۱۰ ہزار و سیصد دہ ہجری مطابق بتاریخ بیست و ہفتم فبروری ۱۸۹۳ ہزار و ہشتصد و نود و سہ عیسوی بدست نواب حشمتماب لارد ہاریس بہادر گورنر بمبئی بسمت وقوع پذیرفتہ معماریش بمہرہ کفایت پرداران پبلک ورکس دیپارٹمنٹ مفوض بودہ و بر مبلغ یک لک و سی و سہ ہزار روپیہ انجام رسیدہ خداوند بیزوال از حوادث لیل و نہار نگاہش دارد و آنرا وسیلہ حسن حال و ترقی مسلمانان گرداند

آمین اللّٰہم آمین

صدر . بدرالدین طیب جی — سیکریٹری : عبداللہ مہر دھرمسی، فتح علی شیخ احمد

انگریزی کتبہ میں یہ اضافہ ہے کہ اس کی ڈیزائن جان ولاکس نے تیار کی۔ انجینئر جان آدمس کی نگرانی میں کام ہوا۔ تعمیر کا کام موجبر کاؤس جی مرزبان کو تفویض کیا گیا تھا

باب داخلہ سے ملحق عمارتوں کی تین اکائیاں ہیں پرنسپل کی آفس کے اوپر تین تین محراب والے دو کمرے، برآمدے اور اسکول لائبریری کا چار کمان برآمدہ والا کمرہ ہے آخر میں تین تین کمان (محراب) والے تین کمرے ہیں اس کا کچھ آگے بڑھا ہوا ہے اوپر چھت ہے جس کے رخ شمال و جنوب میں گرتے ہیں ایک جالی دار محراب والی تکونی دیوار چھت کا سہارا ہے

ان دونوں کے درمیان سات بلند کھڑکیوں والا وسیع و عریض کریمی لائبریری کا ہال ہے جو اس وقت انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا حصہ ہے اس کی دیدہ زیب چوبی چھت، منقش خوبصورت ٹائل کا فرش ہے۔ ۸ - ۹ فٹ کی بلند الماریاں قدیم عربی فارسی نادر مطبوعات اور مخطوطات کا ذخیرہ ہیں اس ہال میں اکابرین عمائدین کے جلسے، تقریریں اور ادبی مذاکرے ہوتے ہیں

اس کریمی لائبریری کے ہال کے درشنی رخ پر بلند و بالا محرابی کھڑکیاں ہیں، بلند ستون اس کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ بلندی حاصل کرنے کے لئے گھوڑ نعلی کمانوں کا طریقہ اپنایا گیا ہے جہاں دو کمانیں ملتی ہیں وہاں سورج مکھی پھول ہیں ان کا پس منظر رنگین ہے

درشنی رخ پر پہلے در کے سامنے سنگ مرمر کی سفید پٹی ہے۔ اس پر کاشی کاری کا نفیس کام ہے سفید زمین میں لال نیلے پھول ابھی تک اپنی بہار دکھا رہے ہیں اگرچہ بہار و خزاں کے کئی موسم ان پر سے گذر گئے مرمریں پتھر زمانے کے گرم و سرد سے ملگجا ہوگیا ہے۔ رنگ میں جگہ جگہ سے ریخت کے آثار نمایاں ہیں

باب داخلہ سے مغرب کی طرف، اوپر کریمی ہال میں جانے کے لئے ۲۹ چوبی تختوں کا زینہ ہے برآمدہ ہے اس سے ملحق دو کمرے ہیں۔ دوسرا زینہ

بھی ۲۹ چوبی سیڑھیوں کا ہے۔ اس کے اختتام پر دو کمرے ہیں اور ایک چھجہ ہے۔ بازو میں ایک کمرہ ہے

زینہ کے ہر در میں تین تین روشن دان ہیں ان میں رنگین شیشے خوبصورت کھڑکیاں ہیں شیشے کے ٹکڑے کو اقلیدسی اشکال — مربع، مثلث، مستطیل بناتے ہیں دونوں منزلوں پر کمروں میں دروازے، برآمدے اور چھجے ہیں۔ چھجوں کی دیواریں خاکستری رنگ کے پتھر کی ہیں۔ مغربی رخ پر کھڑکیوں میں حجری جالیاں مختلف ڈیزائن کی ہیں۔ کمروں میں چھت میں لکڑی کے شہتیر ہیں۔ ایک بڑا وسطی شہتیر چھوٹے شہتیروں کو اٹھائے ہوئے ہے

کریمی لائبریری ہال کے داخلی حصہ پر ایک بالکنی ہے۔ سنہ ۱۹۶۸ء سے قبل اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لائبریرین کا کمرہ تھا انسٹی ٹیوٹ کے پہلے ڈائرکٹر سید نجیب اشرف ندوی کا آفس اس سے الگ کر تھا۔ آج کل انسٹی ٹیوٹ کریمی لائبریری کے محل میں انجمن کے دفتر کے پہلے منزلہ پر واقع ہے۔ مغربی رخ پر ایک گیلری ہے اس کی چاروں کمانیں بوٹے دار ہیں پتھروں کے جوڑ سے یہ کمان بن جاتی ہے شمالی مشرقی کونے میں گنبد پر اوپر جانے کا سد راستہ ہے۔

باب داخلہ سے اندر کی طرف، زمینی منزل پر کوری دور سے متصل دو بڑے کمرے کریمی لائبریری ہال کو اٹھائے ہوئے ہیں اس سے متصل دو بڑے کمرے جنوبی رخ پر ہیں ان کا تقریباً ایک فٹ آگے بڑھا ہوا حصہ ایک اکائی بناتا ہے مگر پوری عمارت ایک ہے۔

جنوبی رخ پر دونوں جانب دو مینار ہیں۔ کمروں کے سامنے وسیع برآمدے ہیں بلندی حاصل کرنے کے لئے گھوڑ نعلی کمانیں ہیں۔ دوسری اور تیسری منزل پر دو دو کمرے ہیں۔ ان پر جانے کے لئے ۳۶ سیڑھیوں والے چوبی زینے ہیں۔ مینار سنگی ہیں زینے چوبی ہیں۔ دریچے ہیں، چھت ہے، گنبد ہے۔

ایک شمال، دو جنوب کے تینوں مینار ایک ہی طرز کے ہیں مینار ہشت

پہل کرسی پر کھڑے ہیں۔ ڈھائی منزلہ تعمیر ہے ہشت پہل مدور مینار کے ہر در میں دو دو روشندان ہیں ایک بڑا ایک چھوٹا ان میں رنگین شیشوں کی کھڑکیاں ایوراں ہیں دوسری منزل میں بھی یہی ترتیب ہے تیسری منزل نصف کے برابر ہے اس میں صرف ایک ایک روشندان ہے اس منزل پر سے گنبد کا ڈول شروع ہوتا ہے۔ گنبد کے حصوں کے چاروں طرف ایک چھجہ ہے وہ اوپر کی طرف اٹھے ہوئے سہاروں پر قائم ہے چھجے کے چاروں طرف دیوار کی روک ہے اس میں محرابیں بنی ہوئی ہیں۔

گنبد کا ڈول ہشت پہل کمان دار تعمیر سے شروع ہوتا ہے کمانوں میں پتھر کی نفیس اور نازک جالیاں ہیں کمانوں کے اوپر چھجے دار مربع نما مدور گنبد کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے گنبد تین حصوں میں منقسم ہے

خاکستری رنگ کے پتھر کا مدور حصہ، لال نیلے رنگ کی مدور پٹی اور گنبد بغیر کلس کا گنبد پر نقش و نگار کے رنگین نقوش باقی ہیں

جنوبی مغربی حصہ عمارت اور مینار سے متصل انجمن اسلام کا دفتر ہے۔ اور پہلے منزلہ پر انسٹی ٹیوٹ اور اس کی لائبریری ہے۔ اس کے آخری کنارے پر شمال مغرب میں، انجمن اسلام مدرسہ کے بالمقابل سوانی ہوسٹل ہے۔

یہ تعمیرات اپنے بانیوں کی سیرچشمی، دریا دلی اور کار خیر کی یادگار ہیں اگرچہ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں

اس ضمن میں علامہ اقبال کے اس خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے جو انہوں نے جہاز پر سے عدن سے پوسٹ کیا لاہور سے روانگی سے اس وقت تک کے سفر کے حالات لکھے ہیں۔ بمبئی کے ذکر میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب وہ ہارنبی روڈ سے گذر رہے تھے۔ تو انہیں ایک نہایت خوبصورت اور دلکش اسلامی طرز کی بنی ہوئی عمارت دکھائی دی۔ یہ انجمن اسلام ہائی اسکول کی بلڈنگ تھی سامنے میدان میں کچھ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اقبال کچھ

دیر تک اس عمارت کے حسن کا نظارہ کرتے رہے۔ پھر انہوں نے ایک لڑکے کو بلاکر پوچھا

«انجمن اس اسکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی کیا فنڈ نہیں ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہوسکتا ہیں کیوں کہ خدا کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول مسلمان سوداگر موجود ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلباء پڑھنے کے لئے نہیں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بمبئی میں اچھے اچھے کالج موجود ہیں اور جیسی تعلیم ان میں ہوتی ہے ایسی سر دست ہم یہاں دے بھی نہیں سکتے[1]»

۱- خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۸۳

ڈاکٹر یونس اگاسکر
شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی

ملک خوشنود کی مثنوی 'جنت سنگار'

چند معروضات

ملک خوشنود کی مثنوی 'جنت سنگار' کا تذکرہ سب سے پہلے مشہور انگریز مستشرق اور فہرست نگار جے ایف بلوم ہارٹ نے "برٹش میوزیم لائبریری کے ہندی، پنجابی اور ہندوستانی مخطوطات کی فہرست" (Catalogue of the Hindi Punjabi and Hindustani Manuscripts in the Library of the British Museum) مطبوعہ ۱۸۹۹ع میں کیا۔ مگر انھوں نے اس کا نام غلطی سے "ہشت بہشت" بتایا کیوں کہ یہ مثنوی امیر خسرو کی فارسی 'ہشت بہشت' کا ترجمہ ہے۔ بلوم ہارٹ نے دوسری غلطی یہ کی کہ اپنے زیر نظر مخطوطے مخزونۂ برٹش میوزیم لائبریری کے کاتب کو مصنف سمجھ لیا۔ اس مخطوطے کے تعلق سے بلوم ہارٹ کی فراہم کردہ معلومات حسب ذیل ہے[1]

ہشت بہشت or The Eight Paradises

A Poem on the loves of Bahram, apparently written in imitation of Amir Khusrau's Persian poem bearing the same title by Muhammed Shah Beg

سراؤں تجھ جو توں ہے پاک معبود
ہوا سب خلق و عالم تج سوں موجود

The author gives his name in the epilogue (fol 177 b) and states at the end of the poem that the work consists of 3250 distiches The poem bears no date but in the prologue there is a eulogy on the authors patron Muhammed Adil Shah of Bijapur who reigned A H 1036-1067 (A D 1626-1656)

---

۱ بلوم ہارٹ ص ۲۳

جہاں تک انتساب تصنیف کا تعلق ہے. ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اس غلطی کی طرف سب سے پہلے اشارہ کیا اور «اردو شہ پارے» میں ملک خوشنود کے تذکرے میں اس کی اصلاح کی مگر مثنوی کے صحیح نام کا پتا انھیں بھی نہیں چل سکا. اسے وہ «ہشت بہشت» ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں. ان کے ایسے الفاظ ملاحظہ ہوں.

«اس کی صرف دو مثنویوں کا ہمیں پتا چلا ہے (۱) یوسف زلیخا (۲) ہشت بہشت اور یہ دونوں غالباً خسرو کی اِنھیں ناموں کی مثنویوں کے ترجمے ہیں.»[۱]

«فی الوقت اس کی کتاب (یوسف زلیخا) کا کہیں پتا نہیں اور نہ اس کے متعلق کسی قسم کی معلومات حاصل ہوتی ہیں. البتہ دوسری کتاب «ہشت بہشت» کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے»[۲]

«برٹش میوزیم کے کیٹلاگ (دیکھو صفحہ ۲۸) میں غلطی سے مصنف کا نام محمد شاہ بتلایا گیا ہے حالانکہ وہ خوشنویس تھا اصل مصنف کا نام ملک خوشنود ہے جس کا ذکر بارہا مثنوی میں آیا ہے»[۳]

غالباً اخیر تک ڈاکٹر زور یہی سمجھتے رہے کہ اس مثنوی کا نام «ہشت بہشت» ہے چنانچہ تذکرۂ مخطوطات (ادارۂ ادبیات اردو) میں بھی انھوں نے اس مخطوطے کو اسی نام سے یاد کیا. علاوہ اس ادارۂ ادبیات اردو میں موجود اسی مثنوی کے ایک نامکمل و ناقص نسخے کو ایک اور مثنوی سمجھ کر اور اسے (بازارحسن) کا نام دے کر انھوں نے سہواً اس مسئلے کو اور بھی پیچیدہ بنادیا.

«محمد عادل شاہ کے حکم سے اس (ملک خوشنود) نے امیر خسرو کی دو مثنویوں (ہشت بہشت) اور (یوسف زلیخا) کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جن میں سے ایک یعنی (ہشت بہشت) برٹش میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ ہے.»[۴]

۱، ۲، ۳ اردو شہ پارے ص ۴۸

۴ تذکرۂ مخطوطات، جلد سوم ص ۳۰۳

آگے چل کر "ادارۂ ادبیات اردو" کے مخطوطے کے متعلق فرماتے ہیں

"اس (مثنوی) کا نام بھی معلوم نہ ہوسکا۔ (نارار حسن) راقم الحروف نے آغاز داستان کی ابتدائی ابیات کے پیش نظر اس کا نام قرار دیا ہے۔"[1]

"حسن سنگار" کو "ہشت بہشت" اور "نارار حسن" سمجھنے کی غلطی محترم نصیرالدین ہاشمی سے بھی ہوئی ہے (یورپ میں دکھنی مخطوطات) میں "مثنوی ہشت بہشت" کے زیر عنوان انھوں نے اسی مخطوطے کا تعارف پیش کیا ہے جس کا ذکر سب سے پہلے بلوم ہارٹ نے کیا تھا البتہ ڈاکٹر زور کی طرح ہاشمی صاحب نے بھی بلوم ہارٹ کی اس غلطی کی اصلاح کی ہے جو اس نے کاتب کو مصنف سمجھنے کے سلسلے میں کی تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں

"بلوم ہارٹ نے اس کے مصنف کے متعلق بھی دھوکا کھایا ہے اور کاتب کے نام کو مصنف تصور کرلیا ہے اس کا مصنف بیجاپور کا مشہور شاعر ملک خوشنود ہے۔ اشعار ذیل سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔

دلا تج لطف کا دارو ہی پاک
بندے خوشنود کا جیو ہے درد ناک

بندے خوشنود پر شہ کا نظر ہے
مرا حت نگر کے بیچ گھر ہے"[2]

ہاشمی صاحب نے کل پانچ اشعار درج کئے ہیں لیکن میں نے صرف ابتدائی دو اشعار نقل کئے ہیں کیوں کہ ان سے ایک اور دلچسپ فروگذاشت کا پتا چلتا ہے۔ یہی دو اشعار ڈاکٹر زور نے (تذکرۂ مخطوطات) میں بھی نقل کئے ہیں مگر انھیں ایک اور مثنوی "نارار حسن" مخزونۂ ادارۂ ادبیات اردو سے ماخوذ بتایا ہے۔

---

۱ تذکرۂ مخطوطات جلد سوم ص ۳۰۶

۲ یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۲۲۳

حالانکہ وہ برٹش میوزیم ہی کے مخطوطے کا ایک مزید ناقص نسخہ ہے تعجب اس پہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے ان اشعار کی موجودگی کے باوجود جو ہیں وہ خود «مثنوی ہشت بہشت» کے زیر عنوان درج کرچکے ہیں ، ڈاکٹر زور کے دریافت کردہ مخطوطے کو ایک مختلف مثنوی تسلیم کیا ہے «دکن میں اردو» میں (ملک خوشنود) کے تذکرے میں فرماتے ہیں

> "جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے ملک خوشنود نے قصائد بھی لکھے تھے مگر افسوس ہے کہ اس کا دیوان اب تک ہم دست نہیں ہوا البتہ دو مثنویاں ہم دست ہوتی ہیں ایک «ہشت بہشت» اور دوسری «بازار حسن» اول الذکر مثنوی کا ایک ہی نسخہ برٹش میوزیم میں ہے "[1]

> «ملک خوشنود کی دوسری مثنوی کا صحیح نام معلوم نہیں ہوتا مضمون کے لحاظ سے ڈاکٹر زور صاحب نے اس کو (بازار حسن) کے نام سے موسوم کیا ہے »[2]

آخری جملے سے پتا چلتا ہے کہ ہاشمی صاحب اس مثنوی کا نام (بازار حسن) نہیں کچھ اور سمجھتے ہیں شاید انھوں نے ذاتی طور پر ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطے کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ اسے (جنت سنگار) (ان کے خیال میں (ہشت بہشت) سے الگ کوئی اور مثنوی تسلیم نہ کرتے حیدر آباد میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے اس تحقیق کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی اس پر اب کون روشنی ڈال سکے گا ؟

جہاں تک ڈاکٹر زور کے تسامح کا تعلق ہے انھیں اس مخطوطے میں حمد و نعت اور مدح صحابہ کے بعد صرف میر محمد مومن (پیشوائے سلطنت گولکنڈا) کی مدح دیکھ کر دھوکا ہوا کہ یہ برٹش میوزیم کے مخطوطے سے الگ کوئی

---

۱ دکن میں اردو ص ۲۰۶

۲ ایضاً ص ۲۰۸

اور تصنیف ہے کیوں کہ برٹش میوزیم کے مخطوطے میں سلطان محمد شاہ کی مدح کی گئی ہے اور مدح میر محمد مومن کا وجود نہیں ہے البتہ ان کا یہ اندازہ درست معلوم ہوتا ہے کہ " یہ مثنوی گولکنڈے میں لکھی گئی ہے "[1]

قرائن سے لگتا ہے کہ (جنت سنگار) جسے (بہشت بہشت) اور (بازار حسن) کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے نہ صرف گولکنڈے ہی میں لکھی گئی ہے بلکہ اس وقت لکھی گئی ہے جب ملک خوشنود، میر محمد مومن کے دامن سے وابستہ تھا۔ اس کا تعلق دربار شاہی سے نہ تھا اسی لیے اس کی مثنوی کے اس نسخے میں سلطان محمد قطب شاہ یا کسی قطب شاہی بادشاہ کی مدح نہیں ملتی، صرف میر محمد مومن کی مدح ملتی ہے ڈاکٹر زور نے یہ پوری مدح نقل کی ہے جس کے آخری دو شعر اس امکان کی طرف پر زور اشارہ کرتے ہیں کہ ملک خوشنود، میر محمد مومن کے مائدۂ فیض کا راتبہ رہا تھا

جسدا کا لطف سر اوپر تمام ہے
سدا خوشنود جم جیو سوں غلام ہے
اچھو محمد اسم اس کے کمش میں سوں
نچھل شاہاں سے درویش ہے جوں[2]

جہاں تک مدح سلطان محمد عادل شاہ کا تعلق ہے غالباً ملک خوشنود نے اس کا اضافہ اُس وقت کیا ہے جب وہ بیجاپور کے دربار سے وابستہ ہوگیا تھا اور سُلطان کی فرمائش پر اپنی اسی مثنوی کو اُس کی خدمت پیش کرنے کا ارادہ کرچکا تھا۔

ایک امکان یہ بھی ہے کہ ملک خوشنود نے مثنوی گولکنڈا ہی میں شروع کی لیکن کسی سبب سے ادھوری چھوڑدی اور پھر سلطان محمد عادل شاہ کی فرمایش پر اُسے پورا کیا چنانچہ اُس نے مثنوی کے اختتام پر ایک شعر میں جو

۱ تذکرۂ مخطوطات، جلد سوم ص ۳۰۳
۲ ایضاً ص ۳۰۴

تاریخ تصنیف کچھ بھی ہو وہ عہد محمد عادل شاہ ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس وقت بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے جو نسخہ تیار کیا گیا ہوگا اس میں درباری مصلحت کے تحت مدح میر محمد مومن کو شامل نہیں کیا۔ غالباً یہی نسخہ یا اس کی نقل برٹش میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ ہے کیوں کہ اس میں مدح میر مومن شامل نہیں ہے۔ اس کے برعکس ادارۂ ادبیات اُردو کے نسخے میں مدح محمد عادل شاہ کا وجود نہیں ملتا۔ یہ نسخہ کلیاتِ ولی کے مخطوطے کے حاشیے پر مبتدی نے نقل کیا ہے اور ڈاکٹر زور کے بیان کے مطابق

« مدح میر مومن کے بعد اشعار داستان کے عنوان سے اصل قصہ شروع کیا ہے جس کی اِس مخطوطہ میں صرف ۱۲ ابیات موجود ہیں۔ بعد میں کسی وجہ سے مبتدی نے کتابت ترک کردی ہے۔»[1]

کتابت ترک کردینے کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مبتدی کے پیش نظر اس مثنوی کا وہی نامکمل نسخہ رہا ہو جو ملک خوشنود نے گولکنڈے میں قیام کے دوران تیار کرنا شروع کیا تھا اور مثنوی ادھوری رہ جانے کے سبب نامکمل رہ گیا۔ مُبتدی نے اِس خیال سے اسے نقل کرلیا ہوگا کہ آگے اس کا مکمل نسخہ یا مزید اشعار دستیاب ہونے پر اس کی تکمیل کرلی جائیگی۔ میرے اس خیال کو اس حقیقت سے بھی تقویت ملتی ہے کہ مُبتدی نے اس مخطوطے کی کتابت میں تقریباً انیس سال لگادیے ہیں اور ولی کا جو بھی کلام اُسے وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتا گیا، حاشیے پر اُس کا اضافہ کرتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کے یہ بیانات ملاحظہ ہوں

اس مخطوطے (کلّیاتِ ولی) کے آخری صفحات میں حسبِ ذیل دو تاریخیں درج ہیں جو دورانِ کتابت میں نکالی گئی تھیں۔ «غنیم بھاگا» ۱۱۲۹ھ اور «شہید مرزل خاص» ۱۱۳۷ھ ان کے نیچے ۱۱۵۲ھ لکھا ہے جو غالباً اس مخطوطے کی تکمیل کتابت کا سنہ ہے۔»[2]

«معلوم ہوتا ہے جس دیوان سے ابتدا میں نقل کی تھی اُس میں بعض غزلیں اور نظمیں درج نہیں تھیں یا ولی نے اُس وقت تک لکھی ہی

۱ تذکرۂ مخطوطات (جلد سوم) ص۳۰۵
۲ ایضاً ص ۲۹۶ تا ۲۹۷

نہ تھیں جب مستدی کو بعد میں یا کسی دوسرے دیوان سے یہ غزلیں
وغیرہ ملیں تو وقتاً فوقتاً حاشیے پر اضافہ کردیا ہے "[1]

مستدی نے ولی کا کلام نقل کرلینے کے بعد خود اپنا کلام درج کیا ہے جس میں ولی کی بیس سے زیادہ غزلوں کی تضمین کے علاوہ نصرتی ، ہتیم اور سالک کے اشعار کی تضمینیں بھی شامل ہیں "اور چونکہ یہ مستدی کا مسودہ ہے اس لیے جگہ جگہ اشعار میں بعد کو ترمیم و اصلاح بھی کی گئی ہے "[2]

مستدی نے جن شعرا کے کلام کی تضمینیں کی ہیں وہ سب سوائے نصرتی کے اُس کے ہم عصر اور اورنگ آباد یا حیدر آباد سے متعلق ہیں اس لیے اُن کے کلام کا حصول اس کے لیے چنداں دشوار نہ تھا جہاں تک نصرتی کا تعلق ہے ، مستدی نے اُس کے صرف ایک مصرع پر غزل لکھی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیجاپور کے شعرا کے کلام سے اسے زیادہ دلچسپی یا واقفیت نہ تھی ایسے میں ملک خوشنود کی مثنوی کے اُس نسخے کا جو بیجاپور میں ترتیب دیا گیا تھا ، اُس تک پہنچنا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا اس کے برعکس اُس نامکمل نسخے کا جو گولکنڈے میں تیار ہورہا تھا یا اس کی ایک آدھ نقل کا جو حیدر آباد یا اُس کے اطراف میں محفوظ رہ گئی ہوگی ، اُس کے ہاتھ لگنا ممکنات سے ہے اس کے علاوہ مستدی نے جس طرح ولی کا کلام حاصل کرکے اور اُسے اپنے مخطوطے کے حاشیے پر درج کرکے اس کلیات کو مکمل کیا ہے اس سے اُس کی تکمیل پسند طبیعت کا پتا چلتا ہے اگر اُسے "جنت سنگار" کا مکمل نسخہ دستیاب ہوتا تو وہ اُسے بھی ادھورا نہ چھوڑتا خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ اُس نے بائیس سال اس مخطوطے کے لکھنے میں صرف کیے ہیں میں جانتا ہوں کہ ان تمام قرائن کے باوجود میرے معروضات کو قیاسات ہی قرار دیا جائیگا لیکن جب تک اس سلسلے میں مکمل تحقیق نہیں ہوجاتی ، ان قیاسات کو قابل اعتنا سمجھنا چاہیے

---

۱ تذکرہ مخطوطات (جلد سوم) ص ۲۹۵ تا ۲۹۶

۲ ایضاً ص ۲۹۷

جہاں تک مثنوی کی تاریخ تصنیف کا تعلق ہے ہاشمی صاحب نے اسے ۱۰۵۶ ھ مطابق ۱۶۴۵ع قرار دیا ہے اور مثنوی کے اس شعر کو اس استنباط کی بنیاد بنایا ہے [1]

ملک خوشنود موتی صاف رولیا
اپس کے ناو کا تاریخ بولیا

ملک خوشنود کے اعداد سے یہی سنہ برآمد ہوتا ہے لیکن شمس اللہ قادری صاحب نے "تاریخ زبان اُردو" میں "ملک خوشنود نے سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش سے ۱۰۵۰ ھ میں 'ہشت بہشت' کا دکنی میں ترجمہ کیا" کی گواہی دی ہے مگر اس سلسلے میں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مذکورۂ بالا شعر کو بنیاد بناکر ۱۰۵۰ ھ ہی کو تاریخ تصنیف قرار دیا ہے کیوں کہ انھوں نے ملک خوشنود کی قرأت ملک خشنود کی ہے جس سے "خوش" کے "و" کے عدد محذوف ہوجاتے ہیں لیکن اس کی وضاحت نہیں کی ہے کہ اُنھوں نے "خوشنود" کو "خشنود" کیوں پڑھا ہے اور نہ ہی ہاشمی صاحب کے برآمد کردہ اعداد سے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمس اللہ قادری صاحب نے جو خوشنود کو 'خوشنود' ہی لکھتے ہیں، کس بنیاد پر اس مثنوی کی تاریخ تصنیف ۱۰۵۰ ھ بتائی ہے اور اگر جالبی صاحب کے پیش نظر نسخوں میں (اُنھوں نے انجمن ترقی اُردو پاکستان کے کتب خانۂ خاص میں اس کے دو نسخوں کے موجود ہونے کا ذکر کیا ہے)[3] اس کا نام ملک خشنود لکھا گیا ہے تو دیگر نسخوں میں 'ملک خوشنود' کیوں درج ہے اور اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟ اس فرق سے تاریخ تصنیف میں چھے سال کا اختلاف پیدا ہوجاتا ہے اس لیے اس پر بھی غور کیا جانا چاہیے

۱ یورپ میں دکھنی مخطوطات (بار اول ۱۹۳۲ع) ص ۲۲۴ اور دکنی میں اُردو (نیورو ایڈیشن ۱۹۸۵ع) ص ۱۹۸

۲ دیکھیے تاریخ زبان اُردو ص ۸۳

۳ دیکھیے تاریخ ادب اُردو (جلد اول طبع دوم ۱۹۸۶ع) ص ۲۹۳

امیر خسرو کی « ہشت بہشت » اور ملک خوشنود کی « جنت سنگار » کے تقابلی مطالعے کا مسئلہ مستقل تلاش و تفحص کا موضوع ہے اس لیے اس پر دونوں مثنویوں کے مکمل نسخوں کو زیر نظر رکھے بغیر کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ ترجمے کی صحت و اہمیت اور ملک خوشنود کے طرز بیان سے متعلق ہمارے محققین کی آرا کے اختلاف کے پیش نظر چند سوال ضرور اٹھائے جاسکتے ہیں۔ پہلے ڈاکٹر زور کے بیانات پر نظر ڈالیں کہ اس مسئلے پر سب سے پہلے انھوں نے ہی روشنی ڈالی ہے « اُردو شہ پارے » میں اس مثنوی کا تعارف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> « اگر اس مثنوی کا فارسی « ہشت بہشت » سے مقابلہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے خوشنود نے نہایت ایمانداری کے ساتھ بلا کم و کاست ترجمہ کیا ہے اور اس میں ایک بھی نئی بات کا اضافہ نہیں کیا »[1]

آگے چل کر اس کے طرز بیان پر اس طرح رائے زنی کرتے ہیں

> « اس مثنوی کا طرز بیان کسی قدر نرالا اور پیچیدہ ہے ۔ جب اس کا مقابلہ دکھنی مثنویوں بہرام و گل اندام مصنفہ طبعی اور دولت و امین کی مثنوی بہرام و بانو حسن سے کیا جاتا ہے تو یہ کسی قدر دقیق معلوم ہوتی ہے حتی کہ اس میں اسی زمانے کی لکھی ہوئی مثنوی « خاور نامہ » کی سی بھی سادگی نہیں پائی جاتی ۔ »[2]

ہاشمی صاحب نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

> « یہ مثنوی فارسی کا ترجمہ ہے اس میں خوشنود نے اپنی جانب سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے ۔ رستمی کے « خاور نامہ » کی طرح اس کی زبان صاف نہیں ہے ۔ »[3]

---

۱ ص ۴۹

۲ ص ۴۹

۳ دکن میں اردو ص ۱۹۸

"اگرچہ اس مثنوی کا بیان ضرور پیچیدہ ہے اور اس زمانے کی دوسری مثنویوں خاور نامہ، بہرام و حسن بانو سے دقیق ہے مگر پھر بھی شاعر کی قادر الکلامی اور کہنہ مشق شاعری کی کافی طور پر وضاحت ہوجاتی ہے "[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان دونوں بزرگوں کے برخلاف ملک خوشنود کے ترجمے کو اصل سے منحرف بتایا ہے اور اس کے فنی اثر کی کمی کو اس انحراف کا نتیجہ قرار دیا ہے

"ہشت بہشت" اور "جنت سنگار" کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ مسلسل اور بیت بہ بیت نہیں ہے کہیں اشعار چھوڑ دیے گئے ہیں، کہیں بڑھادئے گئے ہیں، کہیں مفہوم کو لے کر اپنی زبان میں ادا کردیا گیا ہے، کہیں ترجمے کو لفظی رکھا ہے۔ اکثر اشعار میں ردیف و قافیہ کو بدل دیا ہے کہیں معنی میں تبدیلی کردی ہے کہیں رمزیات و تلمیحات کو بدل دیا ہے اس عمل نے اصل مثنوی کی اثر انگیزی کو بری طرح مجروح کیا ہے [2]

"ترجمے میں اصل سے دور ہوجانے کی وجہ سے "جنت سنگار" کا وہ فنی اثر کمزور پڑگیا جس کی امید اصل کے مطابق رہنے سے کی جاسکتی تھی "[3]

جالبی صاحب نے اپنے بیان کی تقویت میں خسرو کی "ہشت بہشت" اور ملک خوشنود کی "جنت سنگار" سے دو دو اقتباسات جن میں یکساں مضامین منظوم ہیں، پیش کرکے تقابلی مطالعے کی کوشش کی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر زور اور جناب نصیر الدین ہاشمی نے رائے دینے میں قدرے عجلت سے

---

۱ یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۲۳۱

۲ تاریخ ادب اُردو حصّہ اول ص ۲۵۵ تا ۲۵۶

۳ ایضاً ص ۲۵۷

کام لیا اور دونوں مثنویوں کے تقابل میں زیادہ کاوش نہیں کی۔ چنانچہ ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ ملک خوشنود نے اصل میں کوئی حذف و اضافہ کیا ہی نہیں ہے۔ دونوں مرحومین نے خسرو کی مثنوی کے اسلوب و طرز بیان یا فن اور ملک خوشنود کے طرز بیان اور فن کے تفاوت پر اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ البتہ رستمی کے «خاور نامے» طبعی کی «بہرام و گل اندام» اور امین و دولت کی «بہرام و حسن بانو» کے اسالیب سے اس کا موازنہ ضرور کیا ہے اور اسے موخر الذکر تین مثنویوں سے دقیق اور پیچیدہ بتایا ہے۔ مجھے ان بیانات سے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

خوشنود کے کلام کے مطالعے سے یہ بات اُبھر کر واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ ایک قادر الکلام اور پختہ مشق شاعر ہے۔ اور مختلف اصناف سخن خصوصاً مثنوی، قصیدہ، مرثیہ و غزل، پر یکساں قدرت رکھتا ہے اُس کی پرورش بھی گولکنڈے کے ادبی ماحول میں ہوئی اس لیے اُس کی زبان بیجاپور کے شعرا کے مقابلے میں زیادہ صاف اور پختہ ہے۔ اُس کی مثنوی «جنت سنگار» اُس کی فن کارانہ دسترس کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے اور کثافات و قرأت کی خامیوں پر قابو پاکر اُس کے اپنے دور کی زبان کے تناظر میں اِس کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں پیچیدگی و دقت کا نشان تک نہیں ملتا۔ زبان کی قدامت کے سبب اُس کے طرز بیان میں جو غرابت و نامانوسیت نظر آتی ہے وہ زمانی فصل کا نتیجہ ہے جس کے لیے اُسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ڈاکٹر زور، جناب ہاشمی اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے ملک خوشنود کے جن معاصرین کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے کلام کے حوالے دیے ہیں، اُن سب کے کلام میں اُس خامی کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس کی مثال دے کر خوشنود کے کلام کو کم تر بتایا گیا ہے۔

اسی طرح جمیل جالبی صاحب کی یہ بات بھی دل کو نہیں لگتی کہ «ترجمے میں اصل سے دور ہوجانے کی وجہ سے (جنت سنگار) کا وہ فنی اثر کمزور پڑ گیا ہے جس کی اُمید اصل کے مطابق رہنے سے کی جاسکتی تھی۔» سچ تو یہ ہے کہ شاعری کا مکمل ترجمہ ایک ناممکن العمل کام ہے۔ اصل شاعر کا پایہ جتنا بلند ہوگا

ترجمہ اُسی قدر دشوار ہوگا۔ خسرو اور اُس کی مثنوی "ہشت بہشت" کی فنی عظمت و رفعت سے کون واقف نہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ خسرو کا فن کسی صورت کسی اور زبان میں مکمل طور پر نہیں ڈھل سکتا اس کے علاوہ جن نامور شعرا نے خسرو کے کلام کو اُردو میں ڈھالا ہے اُنھوں نے ترجمے کی صحت و مطابقت اصل کی بنیاد پر نہیں، اپنی فنی صلاحیت اور طبع زاد اسلوب کے سبب شہرت اور ادبی مقام پایا ہے۔ وہ اگر لفظی ترجمے کو اہمیت دیتے اور خسرو کی تمام تشبیہات، تلمیحات، رمزیات کو اُردو میں جوں کا توں منتقل کرنے پر زور دیتے تو خسرو کے ساتھ ساتھ اپنے فن پر بھی ظلم کرتے۔ درحقیقت مطابق اصل ترجمے کا مطلب اصل کے مفہوم کو اپنی زبان کے سانچے اور انداز بیان میں اس طرح ڈھالنا ہے کہ اصل مصنف کا مقصود و منشا پورا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ترجمہ ہمارے قدیم شعرا کو بہت کم مقصود ہوتا تھا وہ تو اکثر اپنے فن اور اسلوب کا سکہ جمانے یا اُن کی داد پانے کے لیے اِس میدان میں اترتے تھے اس لیے ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ منشائے مصنف کو ہمیشہ مقدم سمجھیں۔ البتہ جو کم تر درجے کے مترجمین تھے اُنھوں نے لفظی ترجمے کو زیادہ اہمیت دی جس کے نتیجے میں نہ تو اصل مصنف کا کمالِ فن سامنے آسکا اور نہ ہی اُن کی اپنی فنی صلاحیت میں وسعت اور چمک پیدا ہوسکی۔ ملک خوشنود سے بھی اگر ہم یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ خسرو کے کلام اور فن کو ہوبہو اُردو میں منتقل کرے (کیوں کہ یہ بڑے سے بڑے شاعر کے بس سے باہر بات ہے) تو ہمیں اُس کے فن سے شکایت نہ ہوگی۔ میری رائے میں "جنت سنگار" کا فنی جائزہ ایک ترجمے کی حیثیت سے نہیں ایک طبع زاد تصنیف کی صورت میں لیا جائے تو ہمیں خوشنود کے فن سے مایوسی نہیں ہوگی اور وہ ایک نہایت کامیاب مثنوی نگار نظر آئیگا۔

• •

کل ہند اساتذۂ اردو جامعات ہند

گیارھویں کانفرنس کی روداد

دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے ہیں اور اسی طرح دو سال کے بعد تیکنیکی مراحم اور دوسرے وقتی مسائل کا مقابلہ کرکے آخرش ۲۵ سے ۲۷ اپریل ۱۹۸۶ع کو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی یونیورسٹی اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے زیر اہتمام کل ہند انجمن اساتذۂ اردو کی گیارھویں کانفرنس کا انعقاد انجمن اسلام بمبئی کی اولین عمارت میں ہوا

۲۵ اپریل کی صبح دس بجے یونیورسٹی کلب ہاوس (چرچ گیٹ) کے آڈیٹوریم میں کانفرنس کا افتتاح وائس چانسلر پرنسپل ایم ڈی لمیئے نے کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے صدر بلدیۂ بمبئی جناب دتا ملواڈے نے شرکت کی اور ڈاکٹر محمد حسن صدر انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند نے صدارت کے فرائض انجام دئے اور ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صدر انجمن اسلام نے مندوبین و حاضرین کا استقبال کیا

تقریباً ایک سو پچاس مندوبین حضرات نے شرکت کی۔ مندوبین اساتذۂ اردو کی تعداد اور بھی زیادہ ہوتی اگر انجمن اساتذۂ اردو کے منتظمین نے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ انجمن اسلام کا محنت و خلوص سے ساتھ دیا ہوتا۔

مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا (صدر انجمن اسلام بمبئی)، کانفرنس کے ڈائرکٹر پروفیسر ایس ایس گوریکر (ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) اور ایڈوکیٹ جناب عبدالستار دری والا (شریک معتمد انجمن اسلام بمبئی) کی مساعی قابل مبارکباد ہیں کہ یہ کانفرنس مخالفت اور مزاحمت کے باوجود بالآخر بمبئی میں اپریل ۸۶ع کے اواخر میں منعقد ہوکر رہی اور اس کانفرنس کا افتتاح ۲۵ اپریل ۱۹۸۶ع کو ہوا

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا نے اپنی استقبالیہ تقریر میں فرمایا۔[1]

"انجمن اسلام بمبئی، اس کے اراکین اور مختلف اداروں کے سربراہوں اور اہالیان بمبئی کی جانب سے صدر انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند، مندوبین حضرات اور آپ تمام صاحبان کا استقبال کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت نکال کر اس کانفرنس میں شرکت کی۔ جناب لینھے صاحب اپنی مصروفیات کے باوجود شرکت فرماکر افتتاح کر رہے ہیں۔ صدر ملدیہ بمبئی بطور مہمان خصوصی تشریف فرما ہیں۔

میں بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، یو جی سی، بمبئی کارپوریشن اور دیگر اداروں کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں ہر ممکن مدد کی۔

میں انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کے صدر اور عہدیداروں کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے ۱۹۸۴ع میں ہماری دعوت کو قبول کیا مگر ناگزیر حالات کی وجہ سے یہ کانفرنس دسمبر ۱۹۸۵ع میں منعقد نہ کی جاسکی۔ انجمن کے صد سالہ جشن کی تقریبات اس ماہ سے شروع ہورہی ہیں۔ اور یہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے

آپ جانتے ہیں کہ مہاراشٹرا صوبہ اور اس کے بین اقوامی شہر بمبئی میں اردو کے ساتھ اچھا سلوک ہورہا ہے یہاں شمال کی مانند لسانی تعصب نہیں ہے۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم اور اس کے معیار کے بارے میں رپورٹوں میں ہماری پس ماندگی کے اسباب ہماری غفلت اور کوتاہیاں ہیں۔

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ع میں ناکامی کے بعد شمالی ہند اور اس مغربی علاقہ کی تعلیمی حالت میں بڑا فرق تھا۔ شمال میں سرسید احمد خاں نے تعلیم کی تحریک اور مہم شروع کی۔ ان کی کوشش آج ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی

۱　ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا، صدر انجمن اسلام بمبئی، نے اپنا خطبۂ استقبالیہ کل ہند اساتذۂ اردو جامعات ہند کے گیارھویں اجلاس منعقدہ ۲۵ اپریل ۱۹۸۶ع میں پڑھا۔

شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ ع کو سرسید کے مدرسہ دارالعلوم کی تاسیس ہوئی۔

۲۱ فروری ۱۸۷۴ ع کو محمد علی روگھے، قمرالدین طیب جی اور بدرالدین طیب جی اور ان کے رفقائے کار نے انجمن اسلام بمبئی کی بنیاد رکھی مسلمانوں کو علم و فن کی تحصیل کی ترغیب اور تحریص دلائی۔ ہنٹر کمیشن کی رپورٹ شاہد ہے کہ ان دانشوروں نے تعلیم نسواں، صنعتی تعلیم اور زراعتی تعلیم پرکافی زور دیا تھا۔

۱۹۰۳ ع میں انجمن اسلام اسکول (بوری بندر) کی شاندار عمارت وجود میں آئی اس موقع پر ۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ ع سے یکم جنوری ۱۹۰۴ ع تک آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کا اجلاس بمبئی میں ہماری دعوت پر ہوا۔

انجمن کے ارباب حل و عقد کی پرخلوص کاوشوں اور بےلوث خدمات نے جو پودا لگایا تھا، وہ ایک چھتنار درخت کی شکل اختیار کرگیا ہے۔ اس کی گھنیری چھاؤں میں طالبان علم و فضل بیٹھے ہوئے ہیں وہ قطرہ ایک دریا بن گیا ہے۔ سینکڑوں اس کی فیض سے سیراب ہورہے ہیں۔ اس کا فیض جاری اور ساری ہے

انجمن اسلام کے زیر اہتمام چلنے والے اداروں میں صابو صدیق انسٹی ٹیوشن آف پالی ٹیکنک، انجینرنگ کالج، اکبر پیر بھائی کالج آف کامرس، اکبر پیر بھائی گرلس پالی ٹیکنیک، معین الدین حارث جونیر کالج آف ایجوکیشن، پبلک اسکول پنچ گنی، سیف طیب جی ہائی اسکول اینڈ جونیر کالج، گرلس ہائی اسکول اینڈ جونیر کالج باندرہ، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ کئی گرلس اور بوائز ابتدائی اور ثانوی مدارس، تین یتیم خانے، ادبی پرنٹنگ پریس وغیرہ شامل ہیں۔

ان اداروں کے ذریعہ انجمن نے گراں قدر تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں۔ ان اداروں میں ہماری کامیابی اور ناکامی، جمود اور تعطل، شور و سکوت کی داستانیں محفوظ ہیں۔ انجمن کی تاریخ کے مطالعہ اور ان کے مشاہدہ سے آپ کو ہمارے بزرگوں کی محنت کا اندازہ ہوسکے گا۔

ان قابل احترام بزرگوں نے جو قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے اس "ورثہ" کی حفاظت، اس کو خوب تر اور مفید تر بنانے میں تمام موجودہ اراکین سرگرم عمل ہیں۔ نئے ارادے اور منصوبے بھی ہمارے سامنے ہیں۔

اردو کے تعلق سے انجمن اسلام کی خدمات کے سلسلے میں یہ عرض کروں کہ اس ادارے نے ابتدا ہی سے اپنی تعلیمی پالیسی میں اردو کو مرکزی مقام دے رکھا ہے۔ مہاراشٹرہ اور گجرات کے علاقوں کے مسلمانوں کی ثقافتی اور مذہبی زبان اردو ہی ہے۔

انجمن اسلام نے اپنے پہلے جلسے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کی تمام کاروائی اردو میں ہوگی عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اور انجمن کی سالانہ رپورٹ اردو میں چھپتی رہی انجمن نے ادبی جلسوں کا باقاعدہ اہتمام کیا اس کی ماہانہ اور سالانہ نشستوں میں بدر الدین طیب جی، قمرالدین طیب جی، نواب محسن الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مولوی ذکاء اللہ، مولانا شبلی نعمانی سید حسین بلگرامی، سر ضیاء الدین، مولانا سید سلیمان ندوی، جیسے قدآور شخصیتوں نے خطاب کیا اور مفید مشورے دئیے۔

اردو کا اہم مسئلہ رسم خط اور طباعت کا ہے۔ سرسید احمد اور مولانا آزاد نے ٹائپ کی چھپائی اختیار کرنے پر زور دیا۔ ۱۹۲۸ ع کے احمدیہ اجلاس میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے اس مسئلہ کی اہمیت پر زور دیا انجمن نے اس سلسلہ میں تعاون کیا۔ اس کی رپورٹیں، رسالہ نوائے ادب اور نصاب کی کتابیں ٹائپ میں آنے لگیں۔

ہر تعلیمی سطح پر انجمن نے حکومت کی مدد کی۔ عوام کی خدمات کی ہم نے ہروقت اور ہر وقت، حکومت کے ایوانوں میں اردو کی بات پہنچائی اپنی مانگ رکھی اور حکومت نے ہمارا ساتھ دیا۔

یہاں یہ واضح کردوں کہ اردو کو زیر دست اور محکوم بنانے کی یہاں کوئی تحریک نہیں ہے اور ایسی کوئی کوشش اس علاقہ میں سرسبز نہیں ہوسکتی

یہاں زبان و ادب سنتوں کے اشیرباد اور صوفیوں کی دعاؤں کے سایہ میں پروان چڑھتا رہتا ہے۔ ان کی تخلیقات ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان شہ پاروں کو آپ حضرات مجھ سے بہتر جانتے اور سمجھتے ہیں۔

اردو عوام کی محبوب زبان ہے اس کا رس اور جادو سینما گھروں سے لے کر مشاعروں اور ادبی محفلوں تک پھیلا ہوا ہے

اساتذہ کی کانفرنس نے اردو کے مختلف مسائل اور امور پر اپنے قیام سے آج تک غور و خوض کیا ہے ان مسائل کے حل تلاش کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ آج اردو کے دانش وروں کے پیش نظر ذیل کی باتیں ہیں:

(ا) اردو کا جائز مقام (ب) تعلیمی نظام میں اردو کی حیثیت (ج) اردو ذریعۂ تعلیم - ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی سطح پر (د) نئے نصاب کی تشکیل (ہ) دانش گاہوں میں تحقیقی کام کی شیرازہ بندی (و) اردو کے اداروں، تنظیموں، کتب خانوں کا قیام (ز) کتابوں اور رسالوں کی اشاعت اور ان کے مطالعہ اور خریداری کی ترغیب (ح) رسم خط کا تحفظ (ی) نئی نسل کو اردو کی اہمیت سے آگاہی اور (ک) درس و تدریس کے مسائل وغیرہ وغیرہ۔

ان امور کے بارے میں آپ کے فیصلوں سے ہمیں نئی راہیں ملیںگی، نیا شعور پیدا ہوگا نوایا عزم کے ساتھ اردو کی ترویج و اشاعت میں ہم قدم اٹھائیں گے۔

۱۹۰۳ ع کی آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں بدر الدین طیب جی (صدر انجمن اسلام) نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا

> "بمبئی کی کانفرنس سے عمدہ نتیجے پیدا ہوں گے اور قومی اغراض میں انجمن اسلام بمبئی اور یہ کانفرنس ہمیشہ ایک دوسرے کی مددگار رہیں گی "

اس بیان کے پیش نظر میں اپنے ساتھیوں کی اور اپنی جانب سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اردو کے مقصد کی خاطر ہم ہر مہم میں آپ کے برابر کے شریک ہیں۔ اب میں وائس چانسلر پروفیسر ایم ڈی لمیٹے صاحب سے درخواست کرونگا کہ وہ کانفرنس کا افتتاح کریں "

پروفیسر ایم ڈی لیمئے نے افتتاح کرتے ہوئے فرمایا :[1]

"خوشی کی بات ہے دس اجلاسوں کے بعد انجمن اساتذۂ اردو کا گیارھواں اجلاس بمبئی یونیورسٹی اور اس کے الحاق شدہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی زیرنگرانی اور یو جی سی کی سرپرستی میں ہورہا ہے۔ اردو زبان ایک شیریں اور مثالی مشترکہ زبان ہی نہیں ہے بلکہ اتحاد و یک جہتی کی زبان ہے۔ بمبئی نے ہمیشہ ہر چیز میں پہل کی ہے اور اردو کے تعلق سے بھی ہماری یونیورسٹی نے ہندوستان کی جدید زبانوں کے ساتھ اردو کو اپنے نصابات میں جگہ دی ہے۔ اس اعتبار سے بمبئی کے پہلے تین قدیم کالجوں میں الفنسٹن کالج، ولسن کالج اور سینٹ زیویرس کالج نے اردو زبان و ادب کی پڑھائی کا خاطر خواہ اہتمام کیا اور سینٹ زیویرس کالج میں پروفیسر سید محمد سعید رضا، الفنسٹن کالج میں مرزا حیرت اور ولسن کالج میں پروفیسر صادق کی خدمات کو کوئی فراموش نہیں کرسکتا حتیٰ کہ سینٹ زیویرس کالج نے اپنی روایات کو قائم رکھا اور پروفیسر سید محمد سعید رضا کے ساتھ پروفیسر این ایس گوریکر نے کوئی چار دہائی تک اردو زبان و ادب کی پڑھائی کے ساتھ اس کی ترویج و اشاعت میں خاطرخواہ حصہ لیا۔ پچاس پچپن سال قبل اسماعیل یوسف کالج کے قیام کے ساتھ اردو زبان و ادب کی تعلیم کے ساتھ تحقیق کی طرف بھی توجہ کی گئی جس کے لئے استاد الاساتذہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب نے ایم اے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالے تیار کرنیکا سلسلہ شروع کیا اور تاحال اسماعیل یوسف کالج کے ساتھ سینٹ زیویرس کالج اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے بڑھاوا دیا اور پروفیسر ندوی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر مدنی اور پروفیسر گوریکر نے تحقیقی مقالے لکھوانے میں طلبہ کی ہرممکن مدد کی اور تاحال کوئی تیس سال سے چالیس طلبہ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے جس کے لئے اساتذہ اردو بمبئی یونیورسٹی میں ندوی صاحب مدنی صاحب، گوریکر صاحب، جعفری صاحب، داوی صاحب اور شیخ صاحب قابل مبارکباد ہیں

---

۱ پروفیسر ایم ڈی لیمئے، وائس چانسلر، بمبئی یونیورسٹی نے کل ہند اساتذۂ اردو جامعات ہند کے گیارھویں اجلاس میں افتتاحی خطبہ پڑھا

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا انعقاد جسکے زیر نگرانی یہ کانفرنس ہورہی ہے ۱۹۴۷ء میں پروفیسر ندوی صاحب کی ایما پر ہوا اور اس کے پہلے ڈائرکٹر بھی وہی تھے ۔ بعد میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی صاحب بنائے گئے اور انکے بعد ۱۹۷۵ء سے پروفیسر این ایس گوریکر صاحب ڈائرکٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ ادارہ بھی اپنی نوعیت کا جنوبی ہند کا پہلا تحقیقاتی ادارہ ہے جس میں ایم اے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تحقیقی کام بھی ہورہا ہے اور ایک تحقیقی رسالہ بنام نوائے ادب ۱۹۵۰ء سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ۔ یہ ایک معیاری رسالہ ہے جو ہندوستان سے باہر بھی مقبول ہے ۔

ہماری یونیورسٹی تنگ نظر نہیں ہے بلکہ اور زبانوں کے ساتھ حال ہی میں ہم نے اردو کا شعبہ مہاراشٹرہ ریاستی اردو اکادمی کے تعاون سے قائم کیا ہے اور اردو شعبے کے صدر ڈاکٹر اے ایس دلوی بنائے گئے ہیں مجھے امید ہے کہ یونیورسٹی کا یہ شعبہ اردو کی ترقی اور ترویج میں برابر کام کرتا رہیگا اور یہ گنگا جمنی زبان قومی یک جہتی کو عام کرنے میں اہم رول ادا کریگی

آپ کی اس کانفرنس کا افتتاح کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اسی کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں پرمغز مقالے پڑھے جائینگے اور اس طرح اردو کے کاز کو استحکام حاصل ہوگا آپ سب نے اور خصوصاً ڈاکٹر جمخانہ والا صدر انجمن اسلام اور کانفرنس کے ڈائرکٹر پروفیسر گوریکر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ سنہری موقع عطا کیا اور مجھے یہ عزت بخشی »

رسم افتتاح کے بعد مہمان خصوصی جناب دتا ملواڈے صاحب صدر بلدیہ بمبئی نے حاضرین سے خطاب کیا اور کہا ۔[1]

« اردو زبان اتحاد کی زبان ہے جس نے ‹ انقلاب زندہ باد › کا نعرہ دیا اور ‹ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا › کا ترانہ دیا ۔ ہم مہاراشٹر کے شہری اردو کی مخالفت نہیں کرتے ہیں بلکہ ہم اردو کو ہندوستان کی زبان تصور کرتے ہیں اور ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدارس میں اردو کی نہ صرف تعلیم کا اہتمام ہے بلکہ

---

۱ عالیجناب دتا ملواڈے صاحب صدر بلدیۂ بمبئی نے بحیثیت مہمان خصوصی کے کل ہند اساتذۂ اردو جامعات ہند کے گیارھویں اجلاس کو خطاب کیا ۔

اردو مدارس کے قیام میں ہم نے زبردست حصہ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مراٹھی کے بعد اردو کا نمبر آتا ہے۔ مزید فرمایا کہ اردو کی ترویج و تحفظ کی خاطر ہماری کارپوریشن اور ہم مہاراشٹر کے باشندے ہر ممکن تعاون دینے کے لئے ہروقت تیار ہیں »

انجمن اساتذۂ اردو کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا :[1]

«آج ہم انجمن اساتذۂ اردو جامعاتِ ہند کی گیارہویں کل ہند سالانہ کانفرنس کے موقع پر ایسے صوبے کے پایۂ تخت میں جمع ہوئے ہیں جہاں اردو تعلیم کی صورت حال دیگر صوبوں کے مقابلہ میں نسبتاً بہتر ہے۔ جنوب مغربی ہند کا یہ دروازہ جسے عرف عام میں بمبئی کے نام سے پکارا جاتا ہے، صرف ہندوستانی معیشت کی شہ رگ ہی نہیں ہے بلکہ علم و ادب و صحافت اور تہذیبی و لسانی اختلاط و ارتباط اور ترسیل کا بھی یہ ایک اہم مرکز ہے۔ کیمرہ، اسکرین اور آواز کی یہ عظیم نگری اپنی فلموں کے ذریعہ اردو کی جو خدمت انجام دے رہی ہے اسے تاریخ کبھی فراموش نہ کرسکے گی اسی شہر میں انجمن اسلام وہ عظیم ادارہ بھی ہے جو گذشتہ ایک صدی سے ملک و قوم کی شاندار خدمات انجام دے رہا ہے۔ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند اس ادارے کے برگزیدہ بانیوں کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے اور انجمن اسلام کے منتظمین اور اس کے بلند حوصلہ قائد جناب ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا کو انجمن اسلام کے سو سالہ جشن پر ہدیہ مبارکباد پیش کرتی ہے انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند بمبئی یونیورسٹی اور اس کے وائس چانسلر اور انجمن اسلام اور کانفرنس ڈائرکٹر کی بھی شکر گذار ہے جن کے فراخدلانہ تعاون کی وجہ سے بمبئی میں یہ کانفرنس ممکن ہوسکی ہے امید ہے کہ اس سہ روزہ کانفرنس میں اردو تعلیم و تدریس اور اردو تحقیق و نصابات کے سلسلہ میں کھلے ذہن کے ساتھ بحث ہوسکے گی اور مثبت نتائج برآمد ہوسکیں گے

---

۱ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، جنرل سیکریٹری انجمن اساتذۂ اردو نے کل ہند اساتذۂ اردو جامعات ہند کے گیارہویں اجلاس میں یہ سالانہ رپورٹ پیش کی۔

انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند بھی اگلے سال اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کرے گی۔ اس عرصے میں انجمن دس کانفرنسیں منعقد کرچکی ہے۔ جن کے جائے وقوع شمال میں سرینگر سے لے کر جنوب میں مدراس اور ملاپرم اور مشرق میں رانچی بہار سے لے کر ٹونک راجستھان تک رہا ہے۔ جن میں ہندوستان کے مختلف خطوں اور علاقوں کے اردو اساتذۂ اردو جامعات ہند اپنی سالانہ کانفرنسوں کے ذریعہ کل ہند سطح پر اردو اساتذہ کو یہ مواقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے تعلیمی تجربات، علمی تحقیقات اور ادبی نظریات میں دوسروں کو شریک کرسکیں، اپنے مسائل کا حل تلاش کرسکیں اور اردو طریقۂ تعلیم اور اردو نصابات کے مختلف پہلوؤں پر غور کرسکیں کہ اسے کیسے بہتر بنایا جائے اور کس طرح اسے قومی زندگی، عصری تقاضوں اور ملکی ضرورتوں کو ہم آہنگ کیا جائے اور انجمن نے اپنے مجلہ جامعات ہند میں نصابات، تعلیم اور تحقیق سے متعلق جہاں اہم مضامین شائع کئے ہیں وہاں مختلف یونیورسٹیوں میں ہونے والے تحقیقی کاموں سے بھی اردو اساتذہ کو روشناس کرایا ہے۔ جو حضرات کسی وجہ سے سالانہ کانفرنسوں میں شریک نہیں ہوسکے ہیں ان کے لئے انجمن نے یہ مواقع اپنی ریاستی کانفرنسوں کے ذریعہ فراہم کئے ہیں تاکہ باہمی تبادلۂ خیال کے ذریعہ معلومات کے دائرہ کو وسیع کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ یوں تو گذشتہ چوبیس سال میں متعدد ریاستی کانفرنسیں ہوچکی ہے لیکن گذشتہ چند سالوں میں انجمن نے جن ریاستی کانفرنسوں کا اہتمام کیا ہے ان میں رانچی، میسور اور ٹونک کی کانفرنسیں قابل ذکر ہیں۔

کالج اور یونیورسٹیاں تو برگ و بار ہیں شجر علم کی اصل شاخیں اور جڑیں تو ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں پیوست ہیں۔ ان کو نظر انداز کرکے ہم اردو تعلیم خصوصاً کالج اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کو بہتر نہیں بناسکتے۔ ان اسکولوں کے اساتذہ وہ عظیم انسان ہیں جو خود چھپروں میں رہ کر اور ٹوٹی ہوئی کرسیوں میں بیٹھ کر اپنے طالب علموں اور شاگردوں کے لئے کالج و یونیورسٹی اور دفاتر کی اعلیٰ شاندار عمارتوں میں داخل کراتے ہیں۔ انجمن نے ان اساتذہ سے قریبی رشتے کی روایت کو استوار کیا ہے۔ انجمن کی خواہش ہے کہ ہمارے تمام ہی اردو اساتذہ اس رشتے کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کو زیادہ مستحکم بنیادیں فراہم کریں

انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند اگرچہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ کی واحد نمائندہ جماعت ہے لیکن وہ دیگر سطح کے اردو اساتذہ کی انجمنوں کے ساتھ بھی اشتراک و تعاون کرتی رہی ہے اور ان کے مطالبات کو افسران بالا تک پہنچانے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں یہ روابط زیادہ مضبوط ہوئے ہیں کرناٹک میں گوکاک کمیشن کے خلاف احتجاج کرنے، کرناٹک میں اردو ڈائریکٹریٹ کے قیام، اردو انسپکٹر آف اسکولز کے تقرر اور آنگن واڑی اسکولوں میں اردو کو شامل کرنے کے سلسلہ میں انجمن نے ہمیشہ کرناٹک راجیہ اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کے مطالبات کی نہ صرف تائید کی ہے بلکہ صدر انجمن نے کرناٹک کے وزیر اعلیٰ شری رام کرشن ہیگڑے سے ملاقات کر کے ان مطالبات کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔ اسی طرح انجمن نے آل راجستھان اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن اور اترپردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے اردو اساتذہ کے مطالبات کو ان کی ریاستوں کے وزیر اعلیٰ اور متعلقہ حکام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

انجمن کی یہ بھی کوشش رہی ہے کہ مختلف صوبوں کی اردو اساتذہ کی انجمنوں کا ایک رابطہ اجلاس دہلی یا کسی دوسرے مقام پر بلائے تا کہ ان انجمنوں کی قوتوں کو منظم کر کے صحیح سمت اور رفتار کے ساتھ آگے بڑھایا جائے۔ اس سلسلہ میں ابتدائی خط و کتابت بھی انجمن کرچکی ہے لیکن بعض مسائل کی وجہ سے ابھی یہ کام تشنۂ تکمیل ہے۔

آپ اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ حکومت نے اہل اردو کے شدید مطالبات کے بعد اردو ثانوی مدارس تو قائم کردیئے ہیں لیکن محکمۂ تعلیم میں چونکہ اردو داں حضرات موجود نہیں ہیں اس لئے محکمۂ تعلیم کے افسران نہ تو اردو اسکولوں کے مسائل سے واقف ہیں اور نہ ان اسکولوں سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے اسکولوں کا نظم و نسق روز بروز بگڑتا جارہا ہے اس لئے انجمن حکومت سے پرزور مطالبہ کرتی ہے کہ جن صوبوں میں اردو میڈیم اسکول ہیں وہاں اردو ڈائریکٹریٹ بھی قائم کیا جائے اور اردو میڈیم اسکول کے معائنہ کے لئے اردو انسپکٹر آف اسکولز مقرر کئے جائیں تا کہ ان اسکولوں کا تعلیمی معیار بہتر ہوسکے۔

تعلیم اور جمہوریت کے ساتھ یہ کیسا مذاق ہے کہ جس شہر میں جمہوریت کا سب سے بڑا ادارہ پارلیمنٹ اور مرکزی سرکار کے دفاتر موجود ہیں اور جو ہندوستان کا پایہ تخت ہے وہاں چــــراغ تلے اندھیرا ہورہا ہے کہ دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں میں ہندی سیکشن بھی کھول دیئے گئے ہیں اور ان اسکولوں میں ایسے ہیڈماســــٹر اور پرنسپل مقرر کئے گئے ہیں جو اردو سے قطعی ناواقف ہیں اور اردو میڈیم اسکولوں کو ہندی میڈیم اسکولوں میں تبدیل کرنے کی کوشش میں مسلسل مصروف ہیں۔ اگرچہ اس سال ہندی سکشن میں داخلے نہیں دیئے گئے ہیں لیکن غیر اردو داں ہیڈماسٹر اور پرنسپل حضرات کے تبادلے ہنوز عمل میں نہیں آئے ہیں جس کے لئے کوششیں جاری ہیں۔ اردو تعلیم کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ دوسرے مضامین کے استاد جو صرف ایک ہی مضمون پڑھاتے ہیں ان کے لئے ٹریننگ لازمی ہے لیکن اردو کا استاد جو ایسے ادب کی تعلیم دیتا ہے جس میں تمام سماجی علوم شامل ہیں اس کی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے چنانچہ انجمن مرکزی اور ریاستی سرکاروں سے یہ مطالبہ کرتی رہی ہے کہ موجودہ ٹیچر ٹریننگ سینٹروں میں اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا بھی مناسب بندوبست کیا جائے۔ اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا ایک مرکز لکھنؤ میں تو قائم ہوگیا ہے جو اتــــرپردیش جیسے بڑے صوبے کے لئے ناکافی ہے۔ انجمن درخواست کرتی ہے کہ ہر عنبر اپنے اپنے صوبوں میں اردو اساتذہ کی ٹریننگ کے مطالبات کو زیادہ قــــوت کے ساتھ پیش کریں اور ساتھ ہی وہ اردو اساتذہ کے لئے ریفریشر کورس کا بھی مطالبہ کریں کیونکہ طریقۂ تعلیم روز بروز بدلتا جارہا ہے جس کے لئے اردو اساتذہ کو بھی تیار کرنا ضروری ہے تاکہ وہ قومی دھارے سے ہم آہنگ رہیں۔ انجمن کے مطالبہ کے تحت اس سال دہلی اردو اکادمی نے اردو اساتذہ کے لئے ایک ریفریشر کورس شروع کیا ہے امید ہے دیگر صوبوں کی اردو اکادمیاں اور محکمۂ تعلیمات بھی اس کی پیروی کریں گے

انجمن اساتذۂ اردو کا مرکزی اور ریاستی سرکار سے ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے کہ ہندوستان کی ان تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جہاں ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں اردو کے شعبے بھی قائم کئے جائیں اور جن علاقوں میں اردو بولنے والی آبادی موجود ہے وہاں اردو میڈیم اسکول کھولے جائیں اور تمام سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں میں اردو بحیثیت مضمون پڑھانے کا بھی بندوبست کیا جائے

جیواجی یونیورسٹی گوالیار میں اردو کا شعبہ قائم ہوچکا ہے۔ جودھپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اصولی طور پر یونیورسٹی میں اردو شعبہ کے قیام کو تسلیم کرلیا ہے اور بعض اطلاعات کے مطابق وہاں اردو شعبہ اگلے سال تک قائم ہوجائے گا۔ اسی طرح بی۔ آر۔ شموگہ پروجکٹ میں ایم اے کی سطح پر اردو تعلیم کو تسلیم کرایا گیا ہے۔ انجمن کی ان تمام کوششوں کے باوجود کیرلا اور اڑیسہ ایسے صوبے ہیں جہاں یونیورسٹی میں اردو کا کوئی شعبہ نہیں ہے۔ کالجوں میں اردو تعلیم صرف بی اے کی سطح تک محدود ہے۔ ان صوبوں میں ایم اے اردو کی تعلیم اور ریسرچ کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے جس کی وجہ سے یہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو سخت دشواریاں پیش آرہی ہیں اور انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے دوسرے صوبوں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ انجمن اپنی ہر کانفرنس اور یوم اردو کے موقع پر ان صوبوں کے وزیر اعلیٰ اور وائس چانسلروں سے اردو شعبوں کے قیام کا مطالبہ کرتی رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا ہے۔ امید ہے کہ انجمن موجودہ کانفرنس میں یا اس کے بعد ایسے وسائل پر غور کرسکے گی جو ان صوبوں کی یونیورسٹیوں میں اردو شعبوں کے قیام کو ناگزیر بنادیں۔

انجمن اساتذۂ اردو ناگپور، پونہ، مراٹھواڑہ اور منگلور یونیورسٹیوں میں ایک عرصہ سے شعبۂ اردو کے قیام کا مطالبہ کرتی رہی ہے تاکہ یہاں کے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ انصاف ہوسکے۔ لیکن ان یونیورسٹیوں کے منتظمین نے ابھی تک انجمن کے مطالبات پر کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ انجمن اس سلسلے میں بھی مقامی اساتذہ کے تعاون سے اپنی کوششوں کو جاری رکھے گی۔ اسی طرح نئی قائم شدہ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی جو قومی اہمیت کا ایک اہم تعلیمی ادارہ ہے۔ انجمن نے اس یونیورسٹی میں بھی ایک مکمل شعبۂ اردو کے قیام کا مطالبہ کیا ہے جس کے مثبت نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اس وقت ہندوستان میں ۲۶ مراسلاتی کورس کے مراکز ہیں جن میں سے صرف میسور یونیورسٹی کے مراسلاتی کورس میں ایم اے اردو کی تعلیم کا انتظام ہے لیکن اس سے شمالی ہند کے طلبہ فائدہ نہیں اٹھاسکتے اس لئے انجمن دہلی

یونیورسٹی سے یہ مطالبہ کرتی رہی ہے کہ اپنے مراسلاتی کورس میں ایم اے کی سطح پر اردو تعلیم کو بھی شامل کرے۔ اس سلسلہ میں انجمن کو ابھی تک کوئی تسلی بخش جواب وصول نہیں ہوا ہے انجمن جلد ہی ایک وفد لیکر دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملاقات کا ارادہ کررہی ہے اور اس سلسلہ میں دیگر ذرائع بھی زیر غور ہیں۔

آپ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ جن یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں وہاں کے اردو اساتذہ اپنے اپنے علمی کاموں میں مشغول ہیں اور مستقبل میں ان کی ترقیات کے امکانات بھی روشن ہیں اور ان شعبوں میں تعلیم و تدریس کا کام بھی بحسن و خوبی انجام پارہا ہے۔ ان شعبوں کے فارغ التحصیل طلبہ بھی امتیازی شان رکھتے ہیں لیکن جن یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کا بندوبست تو ہے لیکن اردو کا ابھی تک مکمل شعبہ قائم نہیں ہوا ہے اور پروفیسر و ریڈر کی آسامیاں ابھی وضع نہیں کی گئی ہیں یا ان پر ابھی تک کسی کا تقرر کیا گیا ہے ان یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ اور طلبہ برابر ناانصافی کا شکار ہیں چنانچہ انجمن بنگلور یونیورسٹی، گلبرگہ یونیورسٹی، کرناٹک یونیورسٹی (دھارواڑ)، راجستھان یونیورسٹی (جے پور)، اودے پور یونیورسٹی میں اردو پروفیسر شپ کے قیام کا مطالبہ کرتی رہی ہے بنگلور یونیورسٹی اور گلبرگہ یونیورسٹی میں تو پروفیسر شپ اور میسور یونیورسٹی کے مراسلاتی کورس میں ریڈرشپ کے قیام کو اصولی طور پر قبول کرلیا گیا ہے باقی یونیورسٹیوں میں بھی پروفیسر شپ کے قیام کے لئے انجمن اپنی مسلسل جدوجہد کو جاری رکھے گی

این سی ای آر ٹی قومی اہمیت کا ادارہ ہے جو پہلی جماعت سے بارھویں جماعت تک کے نصابات تیار کرتا ہے انجمن مذکورہ ادارہ سے مسلسل یہ مطالبہ کرتی رہی ہے کہ دیگر زبانوں کی طرح وہاں اردو کا بھی علیحدہ شعبہ قائم کیا جائے اور نصابات کے کاموں کی نگرانی کے لئے پروفیسر، ریڈر اور لکچرر مقرر کئے جائیں انجمن کی طرف سے بار بار یاد دہانی کے باوجود اگرچہ این سی ای آر ٹی میں اردو کا علیحدہ شعبہ تو قائم نہیں ہوسکا ہے البتہ ایک ریڈر اور ایک لکچرر کا تقرر عمل میں آچکا ہے۔ شعبے کے علیحدہ قیام اور پروفیسر کے تقرر کے سلسلہ میں کوششیں جاری ہیں۔

اردو نصابات کی تجدید نو اور تربیت کا کام بھی وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے جاگیر دارانہ نظام اور تہذیب دم توڑچکی ہے لیکن ہم ابھی تک اس زمانے کا نصاب ہی اسکولوں اور کالجوں اور جو طلبہ کی ذہنی سطح، وقت اور زمانے کے تقاضوں سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہے جس کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان فاصلہ روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ انجمن نے نصابات کی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر وحید الدین کی ذ مہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے سات دن کے ایک ورکشاپ کی منظوری حاصل کی تھی تا کہ نصابات کی تجدید نو کا خاکہ مرتب کیا جاسکے لیکن پروفیسر ملک کے ریٹائر ہونے کے بعد ان کے جانشین نے اس کام کی اہمیت کو نظر انداز کردیا۔ اب یہ کام یو جی سی نے علی گڑھ یونیورسٹی کے سپرد کیا ہے امید ہے کہ اس کے بہتر نتائج برآمد ہوں گے

اگر آپ اردو کے پس منظر میں ہندوستان کے نقشے پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہوجائیگی کہ کل ہند سطح پر اردو کی مجموعی صورت حال تسلی بخش نہیں ہے جن صوبوں میں اردو کے امکانات کسی قدر روشن تھے وہاں نئے رنجمل ارم کی تحریک کی وجہ سے اردو کے لئے نئے خطرات پیدا ہوگئے ہیں جس نے ان علاقوں کے اردو داں حضرات کو از سرنو سوچنے کے لئے مجبور کردیا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں انہیں کس حکمت عملی کو اختیار کرنا پڑے گا اردو کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا اس کے اپنے ہی گھر دہلی اور اترپردیش میں کرنا پڑرہا ہے ان علاقوں میں جب بھی اردو کا مطالبہ زور پکڑتا ہے اس کو نت نئے حیلوں اور بہانوں کے ذریعے ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے دہلی میں اردو کے مقابلے میں پنجابی کو ہوا دینے کی کوشش کی گئی ہے الیکشن کے موقعوں پر جنتا پارٹی، تیلگو دیشم اور کانگریس نے جو وعدے کئے تھے وہ بھی ابھی تک پورے نہیں ہوئے ہیں دستور میں اردو کو جو مقام دیا گیا ہے اس کو برابر نظر انداز کیا جارہا ہے ریاستوں کے تنظیم نو ۱۹۵٦ ع کے آرٹیکل ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹ میں جو ضمانت دی گئی تھی کہ ہر بچہ کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے اس پر بھی ایمانداری سے عمل نہیں ہورہا ہے سہ لسانی فارمولے کے تحت جدید

زبانوں کی تعلیم کے ساتھ اردو کے لئے جو گنجائش نکالی گئی تھی اسے جدید زبانوں میں سنسکرت کو شامل کرکے سہ لسانی فارمولے کی روح کو مجروح کرنے اور اردو کے امکانات کو کم کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔ مرکزی سرکار کے سینٹرل اسکولوں سے اردو کے تعلیمی سلسلہ کو منقطع کردیا گیا ہے کل ہند سطح پر اردو کی موجودہ صورت حال ہندوستان کے ہر جمہوریت پسند کے لئے مسلسل تشویش کا باعث ہی ہوتی ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستانی سماج میں مختلف سطح پر جو لسانی لڑائی جاری ہے وہ آئین اور اسکی تعمیل کے مابین وسیع خلیج کو پر کرنے کا ایک حصہ ہے۔ آئین سے آگے کی بات تو ابھی بہت دور نظر آتی ہے لیکن اردو میں ابھی تک کوئی ایسی منظم اور مضبوط تحریک وجود میں نہیں آئی ہے جو اس آئینی جدوجہد کا آغاز کرسکے اور ہندوستانی دستور اور اس پر عمل کے درمیان جو بیورو کریسی، رجعت پسندی، تعصب اور غیر جمہوریت پسند عناصر کی دیوار حائل ہے اسے کمزور کرسکے۔ اس سلسلہ میں انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند نے دو کوششیں کی تھیں۔ پہلی کوشش سیاسی نوعیت کی تھی ۱۹۷۸ع میں انجمن نے ممبران پارلیمنٹ کا ایک نمائندہ اجلاس دہلی میں بلایا تھا تاکہ ان کے سامنے اردو کا مقدمہ پیش کرسکے اور وہ پارلیمنٹ میں ایک غیر سرکاری اردو بل پیش کرنے کے لئے آمادہ کرسکے اس کام میں کسی قدر پیش رفت بھی ہوئی تھی اور انجمن کے ایک وفد کو وزیر اعظم اور دیگر وزرا سے ملاقات کا موقع بھی فراہم کیا تھا۔ لیکن یہ کام ملک میں سیاسی انتشار کے نظر ہوکر رہ گیا دوسری مرتبہ ۱۹۸۴ع میں انجمن نے مختلف سیاسی جماعتوں کا ایک نمائندہ اجلاس بھی دہلی کے ویسٹرن کورٹ میں بلایا تھا جس میں اردو کے مسائل پیش کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت بھی کی گئی تھی کہ اردو والے کسی دوسرے کو اردو پڑھنے کیلئے مجبور کرنا نہیں چاہتے ان کا تو صرف اتنا مطالبہ ہے کہ جو لوگ اردو پڑھنا چاہتے ہیں یا جن کی مادری زبان اردو ہے انہیں اردو پڑھنے پڑھانے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ انجمن کے اس جلسہ میں ترقی پسند سیاسی جماعتوں کے علاوہ دیگر جماعتوں نے شرکت کو پسند

نہیں کیا جس سے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کی ذہنی سطح کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سچی بات سننے کو بھی تیار نہیں ہیں

اسی سلسلے کی ایک کڑی انجمن کی طرف سے ایک غیر سرکاری اردو کمیشن کے اعلان کا قیام اعلان بھی ہے۔ انجمن نے ۱۹۸۴ء میں یوم اردو کے موقع پر یہ طے کیا تھا کہ شری اندرکمار گجرال، شری خوشونت سنگھ، شری کلدیپ نیر اور پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو ملک میں انتظامی اور تعلیمی سطح پر ملک کی موجودہ صورت حال کے بارے میں اپنی رپورٹ مرتب کرکے شائع کریگا لیکن یہ کام ابھی ابتدائی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے کیونکہ ملک کے حصوں سے مواد جمع کرنے اور مختلف علاقوں کا دورہ کرنے کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہے وہ ابھی انجمن کے پاس موجود نہیں ہیں لیکن اس کام کی اہمیت آج بھی ختم نہیں ہوتی ہے اور اس کے لئے مختلف افراد اور اداروں کے تعاون کی ضرورت ہے تاکہ اگر ہم اردو کو انصاف نہ بھی دلا سکیں تو کم سے کم اعداد و شمار فراہم کرکے انصاف کیلئے اردو کا مقدمہ تو عوام کے سامنے پیش کرسکیں اور ان بلند بانگ دعوں اور اعلانات کی قلعی کھول سکیں جو آئے دن اردو کو مراعات دئیے جانے کے نام پر کئے جاتے رہے ہیں۔

جہاں تک دوسری کوشش کا تعلق ہے وہ خود شناسی اور احتساب کی تحریک ہے انجمن اساتذۂ اردو نے اپنے مدراس کانفرنس ۱۹۸۳ء میں یہ طے کیا تھا کہ ہر سال ۳۱ مارچ کو اردو کے تمام استاد ملک گیر سطح پر یوم اردو منائیں گے تاکہ وہ اپنے کاموں کا جائزہ لے سکیں کہ انہوں نے اب تک اردو کے لئے کیا کیا ہے اور آئندہ کیاکرنا چاہتے ہیں اور اردو تعلیم اور اردو اسکولوں کے معیار کو کس حد تک بہتر بنایا جائے تا کہ ان اسکولوں کے طلبہ بھی روشن مستقبل کی ضمانت بن سکیں جہاں ابھی تک اردو تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے وہاں کس طرح بندوبست کیا جائے۔ اس موقع پر اردو اساتذہ مناسب تجاویز بھی منظور کرتے ہیں جنھیں ریاستی اور مرکزی حکومت کو بھیج دیا جاتا ہے یوم اردو کی اس تحریک کے توقع سے زیادہ مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں اس کے ذریعے

مختلف سطح کے اردو اساتذہ، طلبہ، ریسرچ اسکالرز، اردو ادبا و شعرا اور اردو دوست تعلیمی و غیر تعلیمی ادارے اور اردو انجمنوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور اجتماعی سطح پر اردو کے بارے میں غور و فکر کرنے کا موقع ملا ہے اور جذباتی رویوں سے سنجیدہ فکر کی شکل اختیار کرنی شروع کردی ہے اور وہ افراد اور انجمنیں بھی جو گذشتہ چند برسوں سے خاموش نظر آتی تھیں اب پھر متحرک نظر آنے لگی ہیں جسے خوش آیند اور نیک فال کہا جاسکتا ہے یوم اردو کے سلسلے میں انجمن دہلی میں غالب اکادمی کے صدر اور سکریٹری اور مدراس میں ڈاکٹر ایس کے قادری بانی و سرپرست مرتضویہ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن (مدراس) کی بھی شکرگزار ہے جن کا بے لوث اور پرخلوص تعاون انجمن کو مسلسل حاصل رہا ہے اس سال یوم اردو کے موقع پر ڈاکٹر ایس کے قادری نے مدراس میں اردو کی ترقی کے لئے پچیس ہزار روپے دینے اور ایک اردو اسکول قائم کرنے کا بھی اعلان کیا ہے جس کے لئے وہ مزید شکریہ کے مستحق ہیں

انجمن نے مدراس کانفرنس کے موقع پر ایک کروڑ کے محفوظ سرمایہ سے کل ہند سطح پر ایک اردو ٹرسٹ کے قیام کا خواب بھی دیکھا تھا تاکہ ملک گیر سطح پر اردو کے تعلیمی اور غیر تعلیمی اداروں کے مابین ربط و تعاون قائم کراسکے اور ان کے نظم و نسق کو بہتر بنانے، ان کی کوششوں کو منظم کرنے اور نئے اداروں کے قیام کو ممکن بنانے کے لئے تکنیکی اور مالی امداد فراہم کراسکے اس ٹرسٹ کا ابتدائی جلسہ جناب عابد علی خاں مدیر سیاست کی وساطت سے حیدرآباد میں منعقد ہونا طے پایا تھا اور کچھ حضرات اس مقصد کے لئے حیدرآباد پہنچ بھی گئے تھے لیکن آندھرا پردیش کے سیاسی بحران کے باعث عین وقت پر اس جلسہ کو ملتوی کرنا پڑا ملک میں سماجی اور فلاحی اداروں نے جو فضا قائم کی ہے اس کی موجودگی میں انجمن کسی کے سامنے دست طلب دراز کرنے میں جھجھک محسوس کرتی ہے اور اسے ابھی تک ایسے مخیر حضرات ملے نہیں ہیں جو انجمن کو اعتماد کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرسکیں لیکن یہ کام اس نوعیت کا ضرور ہے کہ اگر انجمن نہیں تو دوسرے

ادارے اور افراد اپنے طور پر اس کام کو کرنے کا بیڑا اٹھائیں اس سلسلے میں انجمن کا ہر ممکن تعاون انہیں حاصل رہے گا

اس موقع پر یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے پس منظر میں نئی مجوزہ پالیسی کی جو گائیڈ لائنز سامنے آئی ہیں اس میں اگرچہ پرانی تعلیمی پالیسی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے لیکن اس پالیسی میں تضاد بھی موجود ہیں اور اس کے ترتیب دینے والے مرکز اور ریاستوں کی تعلیمی پالیسی میں عدم مطابقت، اور بعض صوبوں میں تعلیم اور تعلیمی معیار کی غیر معمولی پستی اور تعلیمی فنڈ میں کمی کے باعث نتائج و عمل کے اعتبار سے مایوس نظر آتے ہیں جس کا اثر اردو تعلیم پر پڑیگا لیکن سردست ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ نئی مجوزہ تعلیمی پالیسی میں ہائی اسکول تک سائنس اور ریاضی کو لازمی قرار دینے اور آرٹس گریجویٹ کی تعداد کو کم کرنے اور تکنیکل تعلیم کو فروغ دینے پر جو زور دیا گیا ہے اس کا اردو تعلیم پر کیا اثر پڑیگا. ظاہر ہے کہ ملک میں سائنس اور تکنیکل تعلیم کی اہمیت، ضرورت اور فروغ سے کون انکار کرسکتا ہے اس کے فروغ سے ملک میں انقلابی سماج آئیگا، لوگوں کے ذہن بدلیں گے اور روزگار کے مزید مواقع حاصل ہونگے۔ ملک میں مزید خوشحالی آئے گی لیکن کسی بھی ملک میں مشینوں اور مشینی ذہنوں کے ساتھ مہذب اور صحت مند سماج کی بھی ضرورت ہے جس کے لئے تکنیکل تعلیم کے ساتھ ادب کی تعلیم بھی ضروری ہے اس کے علاوہ سائنس اور تکنیکل تعلیم کو جلد بہتر اور مفید نتائج اسی وقت برآمد ہوں گے جب مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے گا چنانچہ اس موقع پر اردو والوں کو بھی یہ حکومت سے یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے ان کے لئے اردو میں سائنس اور تکنیکل تعلیم کا بندوبست کیا جائے تاکہ اردو والے بھی ملک کے عام دھارے سے ہم آہنگ رہیں

میرا یہ بھی فرض ہے کہ میں انجمن کے تمام ممبران اور عہدیداران کا شکریہ ادا کروں جن کا بھرپور تعاون مجھے حاصل رہا ہے۔ اور ان کے مخلصانہ تعاون کی وجہ سے ہی اس رپورٹ کا ترتیب دینا ممکن ہوسکا ہے اسی کے ساتھ میں

آپ سب کی طرف سے انجمن کی خدمت میں ہدیۂ تشکر بھی پیش کرتا ہوں جن کی ولولہ اور فکر انگیز قیادت کی وجہ سے انجمن نے یہ منزلیں طے کیں ہیں۔"

رپورٹ کے بعد ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت پیش کیا اور فرمایا :[1]

"مبارک ہے وہ سرزمین جس نے محبت اور اتحاد کی زبان پڑھانے والوں کو ملک کے کونے کونے سے کھینچ بلایا۔ مہاراشٹرہ محض ہندوستان کا دھڑکتا ہوا دل ہی نہیں ہے کہ اس میں پھیلا ہوا صنعتوں اور کارخانوں کا جال پورے ملک کو روٹی روزی دیتا ہے بلکہ محبت اور مستعدی کا پیغامبر بھی ہے یہ صوبہ بعض روایتوں کے مطابق ولی اور سراج دونوں کا صوبہ تھا بعض کے نزدیک صرف سراج کا اور اس سے پہلے گیانیشور اور نام دیو جیسے نہ جانے کتنے نام ہیں جنھوں نے اس زبان کو پروان چڑھایا جو اردو کی ماں ہی اس کے بعد یہیں اردو کے ڈرامے کا فروغ ہوا، یہیں آغا حشر نے اپنے فن کی داد پائی، اور یہیں کے رسالوں اور اخباروں نے بڑھ چڑھ کر اردو کی خدمت کی اور یہ سلسلہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تک قائم ہے۔ جو آج ہمارا میزبان ہے۔ ہم اہل مہاراشٹرہ کی نوازشوں اور اہل بمبئی کی عنایتوں کے شکرگزار ہیں جنھوں نے یہاں مل بیٹھنے کا موقع دیا۔

یہ موقع بڑا مبارک ہے ملک کی سالمیت کے خطرے میں پڑجانے کی باتیں چاروں طرف کی جارہی ہیں اور جب سالمیت خطرے میں ہو تو سالمیت پیدا کرنے والے سبھی عناصر بھی خطرے میں ہوتے ہیں۔ اردو زبان و ادب ملک میں تہذیبی سالمیت کے امین ہیں۔ ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کناروں تک علاقوں کی سرحدیں پار کرتی، فرقوں اور مذہبوں کے تفرقوں کو مٹاتی یہ زبان رومانی اور انقلاب کے گیت گاتی آئی ہے اور سالمیت کی زبان ملکی سالمیت کے ساتھ خطرے میں ہے اور یہ خطرہ کچھ آج سے نہیں پچھلے انتالیس برس سے ہے۔

درست ہے کہ اس خطرے کو ٹالنے کا مطالبہ حکومت سے کیا جانا چاہئے

---

۱ ڈاکٹر محمد حسن صدر انجمن نے کل ہند اساتذۂ اردو جامعات ہند کے گیارھویں اجلاس میں یہ خطبۂ صدارت پڑھا۔

ملک کے آئین نے اردو کو جو جمہوری حق دے رکھے ہیں ان پر عملدرآمد کرنے کا فرض حکومت پر عاید ہوتا ہے۔ اردو والے ملک بھر میں یہ مطالبہ کرتے آئے ہیں اترپردیش میں بیس لاکھ اور بہار میں دس لاکھ دستخطوں سے صدر جمہوریہ کی خدمت میں محضر پیش بھی کئے گئے مگر یہ خطرہ ابھی تک ٹلا نہیں ہے۔ بہار میں ضرور اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل گیا مگر ملک کے باقی حصوں میں وہی حال ہے بلکہ اس سے بھی بدتر

یہ صحیح ہے کہ ہمارے ایک ہاتھ میں محضر اور عرضداشت اور دوسرے میں کشکول رہا ہے اور اس حالت میں ہم تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں یہ جائز اور مناسب بھی ہے اور اردو والے، خاص طور پر اردو کے اساتذہ، ہندوستان کے عام شہری کی حیثیت سے اپنے اس جمہوری حق کو ایک لمحے کے لئے بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں مگر یہ جدوجہد صرف اردو والوں کی نہیں ہے ملک کی سبھی جمہوری طاقتوں کی ہے جمہوریت کی سب سے بڑی پہچان یہی ہوتی ہے کہ لسانی اور دیگر اقلیتیں اس نظام میں کتنی مطمئن ہیں

کہا جاتا ہے کہ خود ہم نے اردو کے لئے کیا کیا؟ مطالبہ درست ہے۔ بے شک ہمیں خود بھی بہت کچھ کرنا ہے مگر کم سے کم ہر تعلیمی سطح پر اردو پڑھانے کے انتظام کا کام تو بنیادی طور پر حکومت ہی کا ہے اور ہم اسے اس کا فرض یاد دلانے سے باز نہیں رہ سکتے یہ کہا جائے کہ اردو کی تعلیم اور اس کی بقا کی ساری ذمہ داری اردو والے خود ہی قبول کرلیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا گویا ہر شہری اپنے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری سے حکومت کو مبرا قرار دے کر خود ہتھیاروں سے لیس ہوکر سویا کرے کیا یہ صورت حال خطرے سے خالی ہوگی!

کہا جاتا ہے کہ اردو کے اساتذہ خود اپنے بچے اور بچوں کو اردو نہیں پڑھا رہے ہیں سچ یہ ہے کہ جب پرائمری اور سیکنڈری سطح پر ان علاقوں کے سبھی اسکولوں سے اردو کی تعلیم کا انتظام ختم کردیا گیا جہاں یہ اردو اساتذہ رہتے ہیں یہی نہیں اکثر ان شہروں میں بھی اس قسم کے انتظامات نہ رہے تو پھر ان اردو اساتذہ کو اس قسم کا الزام دینا کس حد تک درست ہے!

لیکن ایک کم چالیس سال تک صبر اور کشکول کا سہارا لینے کے بعد آج ہمارے سامنے کیا راستے ہیں ؟ باتیں بہت ہوئیں، دلیلیں بہت دی گئیں لیکن ان کا خاطر خواہ اثر ابھی تک نہیں ہوا ہے اب شاید وہ وقت ہے کہ بقول جگر اردو والے خود اپنے ہی سوز باطنی سے شمع غیر فانی سے نکالنے پر غور کریں۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ سب اردو بولنے والے نہ سہی اردو کے اساتذہ ہی سہی متحد اور مستعد ہوجائیں اور انتیس سال کے انتظار اور جمود کو ختم کردیں آخر ہم کروڑوں کی تعداد میں ہیں اور ہماری آواز کے پیچھے جمہور کی آواز ہے اس لئے ہم اتنے بے بس بھی نہیں ہیں جتنا ہم نے سمجھ رکھا ہے آخر ہم ایسی زندہ اور توانا زبان پڑھاتے ہیں جس نے اڑتالیس برس لمبی تاریکی اپنوں اور غیروں کی مدد کے بغیر کاٹی ہے ؎

چھوٹا نہیں اپنوں سے کوئی تیرِ ملامت

پہلی بات یہ ہے کہ اس جمہوری جدوجہد کی واضح شکل سامنے آئے۔ ہماری پارلیمنٹ میں اردو داں ارکان کی کمی نہیں اور اردو دوست اور جمہوریت پسند ممبران بھی کم نہیں ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ پارلیمنٹ کے سامنے اردو کو مختلف ریاستوں کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا بل پیش ہو خواہ اسے پیش کرنے والا ممبر کوئی بھی ہو اور خواہ اس بل کو کتنے ہی ووٹ کیوں نہ ملیں مگر اردو کے جمہوری حق کی یہ آواز ملک کے سب سے بڑی آئینی ایوانوں میں اٹھنی ضرور چاہئے اس کے لئے ہر علاقے کے اردو اساتذہ کی یہ بھی کوشش ہونی چاہئے کہ ان علاقے کے ممبر پارلیمنٹ کی حمایت انہیں حاصل ہو اور وہ اس بل کی تحریک یا تائید کرسکیں

ہماری انجمن اردو اساتذہ کی انجمن ہے اور ہم سب اساتذہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ ہیں مگر ہوا، خوشبو اور پانی کی طرح تہذیب اور تعلیم بھی ناقابل تقسیم ہیں۔ یونیورسٹیوں میں اردو طلبہ کہاں سے آئیں گے اگر کالجوں اور اسکولوں ہی میں اردو کی تعلیم نہ ہو۔ اس لئے ہر سطح پر اردو کی تعلیم و تدریس کے کام کو

سنبھالنا ہمارا فرض ہے۔ اس کے لئے بھی ہمت اور حوصلہ سے ذرا بساط سے بڑھکر کر کچھ کر گزرنا ضروری ہے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی میزبانی میں یہ بات ذرا بھروسہ اور اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ آج ہمیں ملک گیر سطح پر ایک اردو تعلیمی ٹرسٹ کی ضرورت ہے جو کہ ملک کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے اردو اسکولوں کی شیرازہ بندی کرسکے، نئے تعلیمی ادارے اور اردو ذریعۂ تعلیم کے پولی تکنیک اور تکنیکی ادارے کھول سکے اور اردو کی تعلیمی ضروریات پورا کرسکے

ہماری خوش نصیبی ہے کہ ملک میں دس سے زیادہ اردو اکادمیاں کام کررہی ہیں بعض کے مالی وسایل محدود ہیں بعض کے وسایل اتنے محدود نہیں ہیں لیکن ان اکادمیوں سے دو امیدیں تو قایم کی جاسکتی ہیں اول یہ کہ ہر اکادمی اپنی ریاست میں کم سے کم ایک اردو ماڈل اسکول چلائے اور اس سلسلے میں اگر اس کے اختیارات نہ ہوں تو انہیں حاصل کرے یہ ان کا جمہوری حق ہے دوسرے اپنے علاقے کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی منظور شدہ اردو کی نصابی کتابوں کی اشاعت بعض اکادمیوں نے یہ کام شروع کیا بھی ہے اس طرح کم سے کم اردو کی نصابی کتابوں کا شکوہ جاتا رہے گا۔

آج بنیادی مسئلہ محض نصاب کا نہیں ہے اردو کے لئے نئے کورسوں کا ہے اول تو زمانے نے بساط اس طرح الٹی ہے کہ ادبیات کی تعلیم ہی سائنس اور تکنالوجی کے مقابلے میں کمتر سمجھی جانے لگی ہے، دوسرے جب تک روزگار کی نوعیت بالکل بدل گئی اب زبان اور ادب کی مہارت محض تعلیم و تدریس میں کام نہیں دیتی ترجمہ، صحافت، ریڈیو، ٹیلی ویژن، تعلیم بالغاں اور Archives کی دستاویز شناسی میں زیادہ کام آتی ہے، یہ بھی درست ہے کہ اردو اب صرف ہندوستان، پاکستان ہی میں نہیں برطانیہ، جرمنی، امریکا، کناڈا، سویڈن، ناروے اور بعض خلیجی ممالک میں اچھی خاصی بڑی آبادیوں کی زبان ہے اور وہاں تعلیم و تدریس ہی نہیں ریڈیو، ٹیلی ویژن، تجارت وغیرہ کے لئے بھی تربیت یافتہ اردو دانوں کی ضرورت ہے اس کے علاوہ ارسر نو ان آبادیوں اور ان کے ادب کو بھی نئے انداز سے

سے دیکھنے اور پرکھنے کی بھی گنجائش پیدا ہوتی ہیں۔ لازمی ہے کہ اردو آبادیوں کی پھیلتی بڑھتی اور بدلتی ضرورتوں کے مطابق اردو کے کورس بھی بدلیں اور ایسے پرچے داخل نصاب کئے جائیں جو ان ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

یہی صورت حال اردو تحقیق کی بھی ہے۔ ماضی کا ہم پر حق ہے اور ماضی کو پہچانے بغیر ہم مستقبل کا چہرہ نہیں پہچان سکتے مگر یہ بھی درست ہے کہ مستقبل کا حق ہم پر ماضی سے بھی زیادہ ہے اور جو مستقبل کی آہٹ نہیں سن سکتا وہ ماضی اور حال دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مستقبل سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے اور اردو کی بین الاقوامی برادری کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہماری یونیورسٹیوں کو نئے اقدامات کرنے ہونگے۔ ہماری ادبی اور علمی تحقیق کے بنیادی مقصد کو اس نئے سیاق و سباق میں دیکھنے دکھانے کی کوشش ہونا چاہئے

ابھی تک ہم نے اردو میں تحقیقی سرمایے پر کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے ہمارے پاس ہندوستان اور بیرونی ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں ہونے والے کاموں کی کوئی جامع فہرست نہیں ہے ہندوستان اور بیرونی ہند میں چھپنے والے تحقیقی مقالوں اور مضامین کی وضاحتی فہرست کا کام بھی ہونا ابھی باقی ہے۔ اس طرح ہندستان میں اردو ادب کی تاریخ کے بہت سے گوشے ابھی تک تحقیق طلب ہیں اور جن گوشوں پر کام ہوا بھی ہے ان میں سے اکثر پر نئے بین الاقوامی سطح کی تنقیدی شعور سے کام کرنے کی گنجائش ہے۔

جہاں تک ایم اے کی سطح پر نئے کورس شروع کرنے کا سوال ہے شاید ہر سطح کے اردو معلموں کی تربیت کے لئے اختیاری مضمون کی حیثیت سے ایم اے میں نئے کورس شروع کئے جاسکتے ہیں اسی طرح ریڈیو، ٹیلی ویژن، ترجمہ اور مخطوطات شناسی کے نئے کورس بھی شروع کئے جاسکتے ہیں اور یہ ایسے مضامین ہیں جن کی ضرورتیں روز بہ روز بڑھ رہی ہیں۔

ہندستان، پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک میں اردو آبادیوں سے اور ان کی

تعلیمی ضرورتوں سے بھی ہماری واقفیت اور رابطے اور گہرے ہونے چاہئیے۔ اردو آج ایک ملک کی نہیں مشرق و مغرب کے کئی ملکوں کی زبان ہے۔ یہ رابطے قایم ہونے تو اردو والوں کو نئے امکانات حاصل ہونگے اور انہیں نئی بطر ملے گی۔

غرض آج اردو کی تعلیم و تدریس کے سامنے نئے افق ہیں۔ بے شک خطرات اور اندیشے قدم قدم پر دامن گیر ہوتے ہیں، بیزاری اور مایوسی آڑے آتی ہے مگر امید اور حوصلے کی روشنی راہ دکھاتی ہے۔ بے شک اتحاد اور دل جمعی سے جو کام ہوسکتے تھے وہ سرانجام نہ ہوسکے، بے شک ہماری کارکردگی بہتر ہونی چاہئیے تھی، بے شک اردو کی تعلیم کے بنیادی مرحلے بھی ابھی طے نہیں ہوتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ہم مایوسی اور بیزاری کی تاریکیوں کو چھانتے ہوئے امید کا ایک چھوٹا سا ٹمٹماتا ہوا دیا لیکر برابر آگے بڑھتے رہے ہیں۔ ہماری رفتار سست سہی مگر آگے کی طرف ہے ہمارے سامنے مسائل بڑے سہی مگر دھیرے دھیرے ان سے نپٹتے رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جس زبان و ادب سے ہمارا رشتہ ہے اس میں خود اتنی توانائی اور قـوت ہے کہ وہ سالہا سال کی بے انصافیاں برداشت کرنے کے بعد بھی زندہ ہے۔

ابھی منـزل دور ہے راہ کی مشکلیں بھی کچھ کم نہیں لیکن انسانوں کی ہمت اور حوصلے کا امتحان ایسے ہی موقع پر ہوتا ہے۔ اس وقت اردو کی تعلیمی دنیا نئی ضرورتوں کے مطابق اپنے کورسوں اور اپنے نصابوں کی تدوین کرسکتی ہے اور اپنے ذریعے جمع کرکے اردو زبان و ادب کو نیا رخ دینے میں کامیاب ہوسکتی ہے ضرورت ہے تو استقلال اور اتحاد کی۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری بمبئی کانفرنس سے انجمن کی زندگی ہی میں نہیں اردو تعلیم و تدریس میں بھی نئے باب کا آغاز ہوگا۔

افتتاحی تقریب کے آخر میں انجمن اسلام کے جنرل سیکرٹری جناب عبدالمجید پاٹکا صاحب نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ بعد میں کانفرنس کے چھ اجلاس ہوئے جن کی صدارت ڈاکٹر وہاب اشرفی (رانچی)، ڈاکٹر شریف احمد (دہلی) ڈاکٹر رضی الدین احمد (نیروبی)، ڈاکٹر داوی (بمبئی) اور ڈاکٹر مظہر اعظمی (جموں) نے فرمائی۔ ان اجلاسوں میں فکر انگیز مقالے پڑھے گئے اور آخری اجلاس

میں چند مفید تجاویز پاس کی گئیں جو ہر لحاظ سے اردو زبان و ادب کی بقا و تحفظ کے تعلق سے تھیں۔

آخری اجلاس میں مہاراشٹر کے ان اردو اساتذہ کو جو اب سبکدوش ہوگئے ہیں شال اور سندات سے نوازا گیا۔ ان میں پروفیسر گوریکر، پروفیسر جعفری، پروفیسر مشتاق، پروفیسر حضرت شیخ، پروفیسر افتخار، پروفیسر سومی اور پروفیسر حمیدہ ریاض قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ مہاراشٹر کے مختلف اداروں سے اردو اساتذہ میں پروفیسر مدنی (بمبئی)، پروفیسر رفیع الدین (ناگپور)، پروفیسر شہاب (پونہ) پروفیسر پٹھان (بمبئی)، پروفیسر نعیم الدین (امراؤتی)، پروفیسر عابدی (امراؤتی) اور پروفیسر عصمت (اورنگ آباد) کو نظر انداز کیا گیا تھا جبکہ انکی خدمات قابل قدر ہیں۔ یہ تہنیتی تقریب اقراء سوسائٹی (اندھیری) کی جانب سے منعقد کی گئی تھی جسکے روح رواں ڈاکٹر شفیع شیخ ہیں

انجمن اسلام اور اسکے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے منتظمین انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کے سربراہ اور منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے انکو اردو کی خدمت کرنے کا موقع دیا، ساتھ ہی پرنسپل منشی (مہاراشٹرہ کالج) پرنسپل سوتھر والا (برہانی کالج)، پرنسپل حسین (صابو صدیق انجینرنگ کالج) مہاراشٹرہ اردو اکادمی (بمبئی) اور جامعہ بمبئی کی خدمت میں بھی ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں جن کے تعاون سے یہ کانفرس کامیاب رہی۔ آخر میں ان تمام خواتین و حضرات کے بھی شکر گذار ہیں جنھوں نے ہر ممکنہ مدد دیکر اساتذۂ اردو کی گیارہویں کانفرس کے انعقاد میں ہاتھ بٹایا اور کانفرس کو کامیاب بنایا

(پروفیسر) نظام الدین ایس گوریکر
(کانفرس ڈائرکٹر)

●

کتابی دنیا

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
(تبصرہ نگار)

فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق

(تبصـــرہ)

زیر نظر کتاب فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق ایک تحقیقی مقالہ ہے جس کو ڈاکٹر شعیب اعظمی صدر شعبۂ انڈو اسلامک و انڈو ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) نے ترتیب دیا۔ دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۷۲ع میں ڈاکٹریٹ عنایت کی۔ مقالہ نگار ڈاکٹر شعیب اعظمی نے نظر ثانی کرکے شائع کیا اور ایک زبردست ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انگریزی اور اردو میں کوئی ٹھوس اور مستند کتاب خاندانِ تغلق کے متعلق نہیں تھی مگر ڈاکٹر موصوف کی اس کتاب نے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کردیا ہے

ابتدائیہ میں ڈاکٹر اعظمی بجا طور پر فرماتے ہیں کہ سلاطینِ تغلق کا زمانہ عہد وسطیٰ کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہے جس میں خاندانِ تغلق کے حکمرانوں نے ایک طرف زبان و پرچم کے ذریعے ملک کو متحد کیا تو دوسری جانب دور دراز علاقوں کو اپنے زیرنگیں کردیا، ایک طرف صوفیائے کرام اور علمائے عظام کے ساتھ ساتھ دانشوروں، ہنروروں اور صنعت کاروں کو اپنے زیر سایہ پروان چڑھایا تو دوسری جانب فنونِ لطیفہ کی بالعموم اور مصوری، موسیقی اور تعمیرات کی بالخصوص سرپرستی کرکے اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا اور یہی وجہ ہے کہ تغلق فرمارواؤں کے دور حکومت میں جہاں امیر خسرو جیسے مشہور شاعر، خواجہ نظام الدین اولیاء

جیسے مختار صوفی اور ضیاء الدین برنی جیسے نامور مورخ پیدا کئے وہاں انکے آثار و ملفوظات کی روشنی میں اس عہد کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور علمی تاریخ کا بھرپور جائزہ بھی ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس بلند پایہ کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلے باب میں معاشی اور معاشرتی حالات کا تجزیہ کیا ہے تو دوسرے باب میں تغلق خاندان کے حکمرانوں کے مذہبی کردار پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ تیسرے میں مشائخ کبار کی دینی اور ملکی خدمات پر روشنی ڈالی ہے تو چوتھے اور پانچویں ابواب میں نثری اور شعری تخلیقات اور تالیفات کا جائزہ لیا ہے بلکہ شعرائے کرام کے کلام پر اجمالی تبصرہ بھی کیا ہے آخری باب متفرق کتبات اور ابیات پر مشتمل ہے جو کافی معلوماتی ہے

المختصر یہ کتاب ادب و تاریخ کے اعتبار سے بہت اہم ہے اور ایک مستند کتاب کا درجہ رکھتی ہے

کتابت اور چھپائی کے ساتھ گیٹ اپ بھی عمدہ ہے اس کتاب کی ہر اچھی لائبریری میں پذیرائی ہونا ضروری ہے

● ● ○

فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق مرتبہ ڈاکٹر شعیب اعظمی
مکتبہ جامعہ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶
قیمت ۵۰ روپے

●

Edited by Dr Nizamuddin S. Gorekar, MA, Ph, D, D Litt
Director, Anjuman - i - Islam Urdu Research Institute, Bombay 400 001
Published by Mr Abdul Majeed Patka, B Com (Hons)
General Secretary Anjuman - i - Islam, Bombay 400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay 400 008

مقالہ

مذہبیات

محمد اسحاق

حضرت مجدد الف ثانی اور فیضی و ابوالفضل کے تعلقات و اختلاف پر ایک اجمالی نظر

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۸۶ع
جلد ۱۳۷ ، شمارہ ۴، ص ۲۸۹ - ۳۰۰

شیخ ملا مبارک اور اسکے دونوں بیٹے فیضی و ابوالفضل اپنے علم قرآن، فہم حدیث، فقہی نکتہ شناس، فلسفہ و منطق کی مہارت تامہ، ذہنی ادراکی، معاملہ فہمی سیاسی فکر و نظر، مدبرانہ مزاج و طبعیت اور مباحثہ و مناظر کی پر تاثیر طاقت لسانی کی بدولت درباری علماء پر حاوی ہو گئے تھے چونکہ بادشاہ بنیادی اساسی اسلامی تعلیمات سے نابلد تھا۔ اسلئے گندم نما جو فروش علماے شہر کی ضلالت میں شرعی قوانین، شعائر اسلامی اور دینی نظام کی افادیت، اہمیت اور ہر زمان و مکاں میں انکی ضرورت اور انطباق کے بارے میں انکا ایمان تشکک و ارتیاب کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا

جب گلشن اسلام کے غنچے و گل و برگ دین بیزاری اور الحاد کے شعلوں میں جھلس رہے تھے اسوقت پنجاب سے آگرہ آکر ۹۸۸ ھ میں شیخ احمد سرہندی الملقب مجدد الف ثانی نے تبلیغ و ارشاد کے ذریعے رفع شرک بدعت اصلاح معاشرہ، امر و نہی کی تلقین اور جاہ طلب علماے دربار کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا سد باب شروع کیا

عبدالرحمن محسن انصاری

قرآن - عظیم ادب کا معیار

ماہنامہ برہان دہلی جولائی ۱۹۸۶ع جلد ۹۸
شمارہ ۱ ص ۸ - ۲۲

قرآن کوئی مسلسل تقریر یا مصنف کتاب نہیں۔ اس کا اسلوب بے نظیر ہے اس میں عقاید بھی ہیں حکایتیں اور تمثیلیں بھی، عبرت آموزی بھی، دعوت مشاہدہ بھی ڈراوا بھی خوشخبری بھی غرض مضامین کی تکرار ہر بار ایک نئے معنی اور نئے لطف کے ساتھ اسکے بیان کی بار کی کبھی نہیں جاتی اسکا ادب حق ہے اور اسکے ہر اسلوب سے حق کا اثبات ہوتا ہے

صاحبزادہ شوکت علی خاں

تاریخ غریبی

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جولائی ۱۹۸۶ع
جلد ۱۳۸ شمارہ ۱ ص ۵۴ - ۶۳

یہ ایک ضخیم اسلامی تاریخی مثنوی ہے جس میں نہ صرف تاریخی مواد ملتا ہے بلکہ ثقافتی اقدار، عصری رجحانات اسلامی روایات، علوم و فنون کے آثار و اعلام، علمی مباحث، معاشرتی، مذہبی اور تمدنی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

تاریخ غریبی کی زبان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بارھویں صدی ہجری کے نصف اول میں ہندوستانی زبان کا چلن راجستھان میں بھی تھا اس اعتبار سے اردو کی ساخت و پرداخت بھی متعین کرنے میں یہ ایک اہم دستاویز ہے۔

تاریخ غریبی میں سات سو صفحات ہیں اور دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جسکا ذکر پروفیسر محمود شیرانی نے کیا ہے جبکہ عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک راجستھان والے نسخہ میں کل ۸۲۵ صفحات ہیں اور کم و بیش دس ہزار سات سو پچیس اشعار ہیں جسکے ہر صفحہ پر تیرہ سطور کا مسطر متعین ہے تیسرا نسخہ سیکر سے دستیاب ہوا ہے جو اول و آخر سے ناقص ہے

پہلی بار اسی ضخیم مثنوی تاریخ غریبی سے اردو کے لسانی ارتقاء میں راجستھانی اثرات پوری طرح واضح ہوتے ہیں اسکے ذریعہ نہ صرف لسانی ارتقاء میں راجستھان کا اثر دکھائی دیتا ہے بلکہ راجستھان کے مختلف بالخصوص مارواڑی اور ڈھونڈاری زبانوں کے اثرات، تصریفی قواعد، ضرب الامثال وغیرہ کا عکس طور سے اثر ملتا ہے۔

ابوالکلام قاسم شمس

ابن الجـــوزی

ماہنامہ برہان دہلی اپریل ۱۹۸۶ع جلد ۹۷
شمارہ ۴ ص ۳۹ - ۴۹

عبد الرحمن نام، کنیت ابو الفرج اور لقب جمال الدین تھا۔ ان کے جدّ اکبر جعفر الجوزی تھے اسی نسبت سے ابن الجوزی کے ساتھ مشہور تھے انکا سلسلہ نسب پندرہ پشتوں کے بعد حضرت ابوبکر صدیق سے جاملتا ہے۔

ابن الجوزی بغداد کے درب حبیب میں تقریباً ۵۱۰ھ میں پیدا ہوئے انکے والد تانبے کے تاجر تھے ابن الجوزی تین سال کے تھے کہ انکے والد کا انتقال ہوگیا والدہ اور پھوپھی نے تعلیم و تربیت کی سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ انھوں نے دوسرے شیوخ کے مقابلے اپنے ماموں شیخ ابوالفضل محمد بن ناصر سے زیادہ استفادہ کیا

ابن الجوزی وعظ کے میدان میں بہت آگے تھے۔ وہ فن وعظ میں منفرد تھے ۵۷۰ھ میں ابن الجوزی نے بغداد کے درب دینار میں مدرسے کی بنیاد رکھی اور وہاں درس دینے کا سلسلہ شروع کیا اسی سال وعظ میں قران مجید کی تفسیر بھی پوری کردی عالم اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مجالس وعظ میں پورے قران کی تفسیر کی ہے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی

محدثِ کبیر علامہ محمد بدر الدین حسنی مراقشی ثم دمشقی

ماہنامہ الفـــرقان لکھنؤ مئی ۱۹۸۶ع
جلد ۵۴ شمارہ ۵ ص ۲۱ - ۲۸
تیسری قسط

علامہ بدر الدین صرف علم و فضل، اخلاق و عادات میں یکتائے روزگار نہیں تھے بلکہ زہد و عبادت، مجاہدہ ریاضت میں بھی انکی مثال صدیوں میں ملے گی وہ بڑے عالم نہیں تھے بلکہ بلند پایہ عارف ربانی بھی تھے اور صوفیائے کرام کے بلند احوال و مقامات پر فائز تھے

علامہ کی عمر ستاسی سال ہوئی پیرانہ سالی کی وجہ سے مختلف امراض میں گرفتار تھے۔ آخرش ۲۸ جون ۱۹۳۵ع کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے

مولانا عبد السلام ندوی

عبادات اور علامہ اقبال

ماہنامہ ذوق نظر حیدر آباد ہند مئی ۱۹۸۶
جلد ۲ شمارہ ۵ ص ۵ - ۱۲

عادات و عبادات کے لحاظ سے ڈاکٹر اقبال ایک عجیب معجون مرکب بلکہ مجموعہ اضداد ہیں

اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی کے پیدا کرنے میں خود انکی افتاد طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ ورنہ در حقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت سے انکو خاص شغف تھا۔ نماز بھی پڑھتے تھے مگر چھپ کر ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ میں گفتار کا غازی ہوں۔ اقبال پر مذہبیت کا رنگ کچھ نہ کچھ شروع سے تھا جو آخر میں غالب آگیا لیکن یہ مذہبیت ایک خاص رنگ کی تھی وہ ملا نہیں تھے۔ اقبال نے ہمیشہ ملائیت سے گریز کیا ہے وہ رند بھی تھا۔ صوفی بھی تھا فلسفی بھی تھا۔ قلندر بھی تھا مگر مسلمہ مفہوم کے لحاظ سے ان میں سے کسی صنعت کا اطلاق ان پر پوری طرح نہیں ہوسکتا۔

سید یحیی نشیط

اردو میں حمدیہ شاعری

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۸۶ع
جلد ۱۳۳ شمارہ ۲ ص ۱۳۰ - ۱۴۸

مذاہب عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ خدا کا تصور کسی نہ کسی صورت میں ہروقت موجود رہا ہے۔

عربی و فارسی کی طرح اردو کے شعری سرمائے میں حمدیہ شاعری کو خاص مقام حاصل ہے۔ اردو شعرا اپنے دیوانہ کی ابتدا حمد سے کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے

اردو کی حمدیہ شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) شرعی حمد
(۲) فلسفیانہ حمد
(۳) متصوفانہ حمد

مجموعی حیثیت سے اردو کی حمدیہ شاعری جلال و جمال کی حامل، نشاط انبساط اور کیف و سرور کی شاعری ہے جو عقیدت و ایمان کے لحاظ سے نہ صرف بصیرت افروز بلکہ عشق کے والہانہ جذبات کی صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قاری کی دل گہرائیوں تک اتر جاتی ہے۔

عبدالرحمان محسن انصاری

قرآن عظیم ادب کا معیار

ماہنامہ برہان، دہلی جلد ۹۸ شمارہ ۱
جولائی ۱۹۸۶ ع ص ۸-۲۲

قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کا آسمانی صحیفہ ہونے کو بہ دلائل ثابت کیا گیا ہے اس کے مضامین و موضوعات کا آیات کے حوالوں سے احاطہ کرتے ہوئے آج کی سائنسی و تکنیکی زندگی کے مقابلے میں قرآن کو اپنانے کی دعوت دی گئی ہے تاکہ آخرت کی ابدی زندگی میں سرخ روئی نصیب ہوسکے۔ تمام علوم و فنون اور مظاہر تہذیب کو باہم متحد رکھنے کے لیے ایک مرکزی نقطہ درکار ہے وہ نقطہ اللہ ہے یہی مرکزی نقطہ آج مغربی اقوام اور اُن کے متبع اقوام نے کھودیا ہے جس کے سبب تباہی اور انتشار پھیل رہا ہے اس لیے آج قرآن کی طرف دنیا کو بلانے کی ضرورت ہے مضمون میں خیالات کی بے ربطی پائی جاتی ہے عنوان سے مطابقت بھی کم ہے۔

ادبیات

ڈاکٹر محمد علی اثر

محمد قلی کی غزلیں

ماہنامہ سب رس حیدر آباد، مارچ اپریل ۱۹۸۶ ع جلد ۴۶ شمارہ ۳-۴، ص ۳-۶

محمد قلی کا ضخیم دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں کم و بیش تمام اصناف شعر پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔

محمد قلی نہ بلند پایہ عالم تھا نہ فلسفی و حکیم۔ اس نے اپنے محسوسات اور تجربات زندگی کو سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی اس کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ وہ ایک خوشگوار اور اردو کا اولین صاحب دیوان شاعر ہے

جمنا داس اختر

پنجاب میں اردو صحافت

ماہنامہ آجکل دہلی، جولائی ۱۹۸۶ع
جلد ۴۴ شمارہ ۱۲ ص ۷-۱۱

برصغیر میں اردو صحافت کی تاریخ قلمبند کرتے ہوئے کوئی بھی پنجاب کو نظر انداز نہیں کرسکتا اس ضمن میں منشی دیوان چند کے اخبارات گوجرانوالہ ملتان، راولپنڈی اور پیشاور کے اخبارات «اخبار عام» «پیسہ اخبار» «وکیل» «ہندستان»، «زمیندار»، «انقلاب» اور

«سیاست»، «بندے ماترم» «پرتاپ» اور «ملاپ» اور روز نامہ ہند «سماچار» جالندھر کا ذکر کیا ہے

ڈاکٹر منظر اعظمی

اردو کی ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا سرسری جائزہ

ششماہی نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۸۶ء
جلد ۳۶ شمارہ ۱ ص ۱ - ۲۱

اردو میں کچھ رجحانات قوی ہیں کچھ کم قوی رجحانات ہیں اور کچھ معمولی رجحانات قوی رجحانات میں ابہام گوئی کا رجحان مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کا رجحان، سلیس نثر نگاری کا رجحان ہیئتی تجربوں کا رجحان، قومی شعور اور شاعری کا رجحان، ادب لطیف کا رجحان بھاشائی اسلوب اور موضوع کے احیا کا رجحان اور ایہام اور لب و لہجے کی تبدیلی یا جدیدیت کا رجحان شامل ہے

کم قوی رجحانات میں مرثیوں میں رزم کا رجحان، انگریزی کے زیر اثر انگریزی الفاظ کے استعمال کا رجحان، گھن گرج اور بلند آہنگی کا رجحان اور مذہبی احیائیت کا رجحان شمار ہوسکتا ہے۔ معمولی رجحانات میں زنانہ پن اور نسائیت کا رجحان وغیرہ شامل ہیں۔

تحریکوں میں صحیح معنوں میں منظم تحریکیں دو تھیں ترقی پسند تحریک اور ادب اسلامی کی تحریک، غیر منظم یا نیم منظم تحریکوں میں فارسیت کی تحریک، مخالف ایہام گوئی کی تحریک اور علی گڑھ تحریک شامل ہیں

تاج پیامی

جناب حفیظ فارسی
ایک غزل گو شاعر

ماہنامہ گلس احمد آباد، جون جولائی ۱۹۸۶ء جلد ۹، شمارہ ۱۰۳ - ۱۰۴
ص ۲۳ - ۳۱

حفیظ صاحب نے اپنی غزلوں میں غزل کی روایت کو تحفظ بخشا۔ وہ روایتی نہیں روایت پرست ضرور ہیں وہ رسمی تقلید نہیں کرتے بلکہ غزل کی روایت کے معیار و اقدار کو اپنی غزلوں میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو بروئے کار لاتے ہیں۔

انکی غزلیں دور حاضر کے مسائل اور حالات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں جدیدیت پسند تحریک کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی

احراحسنی کا نظریۂ فن اور اصلاح سخن

ششماہی نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۸۶ع
جلد ۳۶ شمارہ ۱، ص ۲۲ - ۴۳

احراحسنی کا نظریۂ تنقید عربی و فارسی شعریات پر مبنی ہے اور فن اصلاح سخن سے ماخوذ ہے فن اصلاح سخن پر احراحسنی کی تین کتابیں ملتی ہیں یعنی (۱) اصلاح الاصلاح (۲) میری اصلاحیں حصہ اول اور (۳) میری اصلاحیں حصہ دوم اگرچہ اصلاح الاصلاح کو اولیت حاصل ہے لیکن ان صاحب نے میری اصلاحیں (اول و دوم) میں اپنے تنقیدی نظریات کو پیش کیا ہے اور انکی روشنی میں اصلاحوں کا جائزہ لیا ہے۔

اصلاح سخن کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرنے کے بعد اپنے تنقیدی نظریات کو دو حصوں میں تقسیم کرکے انکی تشریح کی ہے (۱) محاسن سخن اور معائب سخن

محاسن سخن میں علم معانی بیان اور بدیع کے بنیادی نکات پیش کئے ہیں، منقوں پر زور دیا ہے جو ہیئت کے لئے جمال آفریں ہیں اور معائب سخن میں زبان

قوائد عروض اور قافیے کے ان عیوب کی نشاندھی کی ہے جن سے شعر کا صوری حسن مجروح ہوتا ہے۔ انھوں نے عیوب شعر میں شترگربہ، علو، حشو، تعقید، دم انتقال، ضعف تالیف، غرابت، اخلال تکلف، تکرار، اہمال، تطویل، اتصال انتقال، تنافر، تقدیم و تاخیر، عدول، قطع تخفیف، تشدید قصر، مد، اسکان تحریک، وصل، منع صرف، منع نحو تعبیر، تواناتی اضافت، مخالفت قیاس لغوی حروف علت کا گرنا، شکست ناروا، اجتماع ردیفین، ناموزونیت، اور عیوب قوافی (ایطا وغیرہ) کو خاص طور پر شامل کیا ہے اور ۴۷ متروکات کی فہرست پیش کی ہے

مقالہ ہذا میں احراحسنی کے بعض بنیادی تنقیدی نظریات کا عروضی پہلو، فنی پہلو اور لسانی پہلو سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے

ڈاکٹر انور سدید

ادب ۱۹۸۵ع برصغیر پاک و ہند کے اردو آئینے میں

ماہنامہ کتاب نما دہلی اپریل ۱۹۸۶ع
جلد ۲۶ شمارہ ۴، ص ۳۳ - ۴۰

مئی ۱۹۸۶ع جلد شمارہ ۵، ص ۳۹ - ۴۶
جون ۱۹۸۶ ع جلد ۲۶ شمارہ ۶، ص
۵۵ - ۶۰

مندرجہ بالا شماروں میں ۱۹۸۵ع میں اردو ادب کی تحلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے الہامیات، ملفوظات، طنز و مزاح، پیروڈی کالم نگاری، سفرنامہ، خاکہ اور شخصیت آپ بیتی، یاد نگاری، سوانح عمری، خطوط ملاقات نگاری، ڈرامہ، تنقید، تحقیق، اقبالیات، غالبیات، ویریبات، عسکریات ترجمے، تبصرے، ادبی رسائل اور اخبارات مذاکرے، دیباچے اور وفیات اور مرحومین کا تذکرہ کیا ہے۔

پروفیسر کلیم سہسرامی

دیوان ہاشم

ششماہی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۸۶ ع
جلد ۳۶ شمارہ ۱، ۴۷ - ۸۳

بنگلہ دیش کی ڈھاکہ یونیورسٹی میں قلمی نسخوں میں جتنے بھی دستیاب ہیں ان میں «دیوان ہاشم» واحد نسخہ ہے جسکی ضخامت کافی ہے اور ہر طرح سے مکمل کہا جاسکتا ہے۔ قلمی نسخوں کی فہرست میں اس کا نمبر ۲۸۶ ہے۔ اس نسخے میں کل ۱۹۸ ورق یعنی ۹۳۶ صفحے ہیں۔ دیدہ زیب نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔ سرخ و سیاہ جدولیں بنی ہوئی ہیں بعض جگہ کرم خوردہ لیکن مرمت شدہ ہے۔ شاعر کے حالات کی تفصیل اس میں نہیں ملتی۔ البتہ اسکا نام یوں درج ہے «خواجہ محمد ہاشم ابن محمد قاسم الکشمی البدخشانی برہانپوری»

دیوان کی ورق گردانی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو مختلف اصناف سخن پر عبور تھا۔

دیوان ہاشم میں مجموعی طور پر غزلیات و رباعیات کے حصے جاندار اور قابل توجہ ہیں۔ شاعر نے اپنے آپ کو ایک جگہ فارسی شعر و ادب کے عارف وصوفی حضرت فرید الدین عطار اور دوسری جگہ عربی زبان کے شاعر لبید سے مماثلت و مشابہت دی ہے۔

ڈاکٹر یعقوب عمر

حافظ شیرازی اور علامہ اقبال

ماہنامہ ذوق نظر حیدر آباد هند مئی ۱۹۸۶ع
جلد ۲ شمارہ ۵، ص ۴۴ - ۴۵

حافظ کو اگر تصوف سے شغف تھا بھی تو منفی تصوف سے یعنی عرفانی سلاسل کے اس طبقے سے جنھیں ملامتی

یا عنداللہ نامقبول قرار دے دیا گیا ہے۔ انکی تعلیمات کو ہمیشہ مشکوک نظر سے دیکھا گیا۔ ایک طرف اہل شریعت انکے خلاف تھے تو دوسری طرف خود اہل طریقت وہ طبقہ بھی انہیں اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا تھا جسکی بنیادی تعلیم تزکیہ نفس پر تھی

علامہ اقبال کی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے کہ مرد حکیم چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے بغیر بھی اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا دیتا ہے اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن والے اشعار میں حافظ سے مراد کوئی خاص شخصیت مرادنہ تھی بلکہ اس عمل کی مذمت مقصود تھی جسکا حافظ سمبل بن گئے تھے۔

پروفیسر عنوان چشتی

دیوان غالب کا عروضی تجزیہ

ماہنامہ ذوق نظر حیدر آباد ہند، مئی ۶۸ء
جلد ۲ شمارہ ۵، ص ۶۲-۷۵

غالب کا عروضی تجزیہ اس نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے کہ غالب کی شاعری عروضی پہلو کی اہم خصوصیات کا تعین ہوسکے اس تجزیے کی بنیاد دیوان غالب مرتبہ مالک رام پر ہے۔ اس تجزیے میں محض غالب کی غزلوں کے اوزان اور بحور کو شمار نہیں کیا گیا ہے بلکہ غالب کی عروضی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے

اس تجزیے کی ابتدا میں بحروں غزلوں کے ابتدائی مصاریع، ان کے اوزان اور بحور درج ہیں اس کے بعد عروضی اغلاط کی نشاندھی کی گئی ہے اس تجزیے کی روشنی میں غالب کی شاعری کے عروضی پہلو کے سلسلے میں ایک واضح رائے قائم کی جاسکتی ہے

ڈاکٹر عبدالباری

انشا و قتیل کی نثری خدمات کا
تہذیبی پس منظر

ماہنامہ گلبن احمد آباد، جون، جولائی ۱۹۸۶ء جلد ۹ شمارہ ۱۰۳ - ۱۰۴
ص ۴ - ۱۴ قسط دوم

ظرافت و بذلہ سنجی اس عہد کے امرا کے نزدیک نہایت ضروری وصف تھا جو ایک مہذب و ذی علم انسان کے اندر لازمی تھا لکھنؤ میں ملک کے دیگر حصوں سے آکر سر بر آوردہ طبقہ کے جو لوگ آباد ہو گئے تھے وہ اپنی محرومیوں ناکامیوں اور سیاسی و اقتصادی تلخیوں کو

فراموش کرنے کیلئے گردوپیش ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں زیادہ سے زیادہ ہنسنے ہنسانے کے مواقع پیدا ہوسکیں. انشا نے وقت کے اس تقاضے کو بڑی کامیابی کے ساتھ پورا کیا.

لکھنؤ کے معاشرے میں ایک طرف عیش و نشاط کی بدمستیاں، دوسری طرف شعر و ادب کا مذاق، تیسری طرف عربی و فارسی میں علوم کا احیاء. پھر دہلی اور ملک کے دیگر حصوں سے آئے ہوئے اہل علم اور اصحاب فن کا ہجوم، ایسی شکل میں وہ فنکار جو اس عہد کا سب سے زیادہ نمائندہ فنکار کہا جاسکتا ہے اور جو کرسی اقتدار سے سب سے زیادہ قریب تھا اور دربار سے بار بار تک جس مقبولیت کا نقارہ بجتا تھا اپنی داستان رانی کیتکی میں سادہ گوئی کے التزام کے باوجود خوش آہنگی کی خاطر مختلف وسیلوں کے استعمال پر خود کو مجبور پاتا ہے.

عارفہ فرید

جیلانی بانو اور انکا فن افسانہ نگاری

ماہنامہ سب رس حیدر آباد (ہند) مارچ اپریل ۱۹۸۶ ع جلد ۴۶ شمارہ ۳۹ - ۴ ص ۲۱ - ۳۱

جیلانی بانو کے افسانوں کے محرکات خارجی زندگی کے اہم واقعات ہی رہے ہیں. اپنے زمانے کی اہم سیاسی اور سماجی تحریکوں نے انہیں متاثر کیا ہے انہوں نے زیادہ تر حیدر آباد کے متوسط طبقے کے گھرانوں میں پیش آنے والے حادثات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے

ان افسانوں کی روشنی میں اس حقیقت کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ جیلانی بانو کا فکری میلان اشتراکی ہے. وہ موجودہ نظام زندگی کے بہیمانہ رواج کی دشمن ہیں جیلانی بانو کے ذہن پر فرائیڈ کا اثر نہیں. وہ جنس کے دلدل میں نہیں پھنستی. انکے فکر کی بنیاد تاریخ کی مادی صداقتیں اور زندگی کی حقیقت ہے. یہی وجہ ہے کہ جیلانی بانو کی فکر پر اداسیت اور مجہول رومانیت کی لکیریں نہیں ملتی.

ابو الکلام قاسمی

خضر راہ

ماہنامہ شب خون الہ آباد جون جولائی ۱۹۸۶ جلد ۱۹ شمارہ ۱۴۲ ص ۴۷ - ۶۰

«خضر راہ» بانگ درا کی طویل نظموں میں اپنی فنی خصوصیات کی بنا پر ایک ممتاز نظم ہے.

اس نظم میں نمایاں نظر آنے والی شاعر کی وہی حکمت عملی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اس حکمت عملی کا اظہار کہیں فکری عناصر کے حسن متبادل کی تلاش اور شعری پیکروں کی تشکیل کی صورت میں پیدا ہوا ہے تو کہیں متضاد حقائق کی جدلیاتی کیفیت سے کسی نئی حقیقت کی تخلیق کی کوشش اور سپاٹ خیالات کی نئے تخلیقی صداقت کی سحر آفرینی جیسے فنکارانہ طریقوں سے ہوا ہے

حصر راہ کی ہی قدر و قیمت اسکی فلسفیانہ اور فکری بنیادوں سے کہیں زیادہ قابل توجہ ہے۔

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

سرسید کے تعلیمی افکار و اعمال

ششماہی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۸۶ ع
جلد ۳۶ شمارہ ۱ ص ۸۴ - ۹۳

مسلم معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کیلئے سرسید نے جو منصوبے بنائے اور جو تحریک شروع کی اس میں تعلیم و تربیت کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ بلکہ اپنے زمانے کے ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی خرابیوں کا واحد علاج تعلیم ہی کو قرار دیا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کیلئے سرسید کے خیال میں یہ بھی ضروری ہے انکو جدید علوم و فنون کی فائدہ مند تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی آراستہ کریں اور مذہبی تعلیم کیلئے دینی علم اور دینی فہم اصحاب یکجا جمع ہوں اور بحث و مباحثہ کے بعد وہ ایسا نصاب مرتب کریں جو بلحاظ حالات زمانہ اور نظر علوم و فنون جدیدہ مطابقت رکھتا ہو اور جو پرانی اور دقیانوسی تعلیم سے مختلف یعنی ترمیم شدہ ہو، ضروریات وقت کے موافق ہو اور جو مذہبی مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو۔

سرسید نے تعلیمی تحریک کا آغاز عملی طور پر ۱۸۵۹ ع میں ایک فارسی ذریعہ تعلیم کے مدرسے سے کیا جو آج بھی وکٹوریہ اسکول کے نام سے جاری ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام غازی پور میں ۱۸۶۳ ع عمل میں آیا۔ علیگڈھ تبادلہ ہوتے ہی اس کا سنگ بنیاد ۱۸۶۴ ع میں علیگڑھ میں رکھا۔ اس عمارت میں اب بھی طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ جاری ہے

تعلیمی تحریک کے سلسلے میں وائسرائے ہند کو ایک یادداشت ۱۸۶۷ ع میں

پیش کی سرسید نے اعلیٰ پیمانے پر جدید قسم کی درسگاہیں اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کیلئے انگلستان کے سفر کو ضروری سمجھا۔ الغرض یکم اپریل ۱۸۶۹ع کو وہ بنارس سے لندن کیلئے روانہ ہوگئے کیمرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کا خود جاکر معائنہ کیا اور وہاں کے ماہرین تعلیم سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد ایک تعلیمی منصوبہ بنایا جو ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے کار آمد ثابت ہوا۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کی اور اپنی انتھک کوششوں کے بعد ۱۸۷۷ ع میں وائسرائے ہند کے ہاتھوں کالج کا سنگ بنیاد رکھا جسکا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور اردو میں مدرسۃ العلوم تجویز کیا۔

محمد بدیع الزماں

کتاب جواں اور صاحب کتاب

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جولائی ۱۹۸۶ ع
جلد ۱۳۸ شمارہ ۱ ص ۳۹ ـ ۵۳

اس مضمون کا عنوان «ضرب کلیم» کی کل دو ہی اشعار پر مشتمل اقبال کی نظم «طالب علم» سے ماخوذ ہے جسکا تجزیہ قرآن کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

اس نظم میں انہوں نے قرآن کی روشنی میں علم کی مقصدیت اور افادیت پر ایک لمبی بحث چھیڑ دی ہے پہلے شعر میں تو انہوں نے ترغیب عمل کے رجحانات کو اجاگر کرنا چاہا ہے مگر دوسرے شعر میں اسے صاحب کتاب سے وابستہ کرکے یہ نکتہ نکالا ہے کہ عمل عشق سے فروزاں ہوتا ہے

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

اقبال کا نیا مکتبِ فکر

ماہنامہ شاداب حیدرآباد مئی ۱۹۸۶ ع
جلد ۳ شمارہ ۵ ص ۲۳ - ۳۲

اقبال کا عقیدہ یہ ہے کہ ادب میں اس وقت تک جان نہیں پڑتی جب تک وہ اپنی زندگی اور توانائی دھڑکتے دل کی گہرائی سے نہیں حاصل کرتا اور خون جگر سے سیراب نہیں ہوتا اقبال کا یہ نظریۂ شعر و ادب و دنیائے علم و فن میں ایک انقلابی نظریہ تھا اللہ تعالیٰ نے اس دور میں اس کام کیلئے ایسے شخص کو منتخب کیا جس نے فلسفہ قدیم و جدید اور ادب و فن کا یکساں اور گہرا مطالعہ کیا تھا انہوں نے عرصہ تک یورپ کی موقر دانش گاہوں اور وہاں کے اساتذہ کی صحبتوں میں کافی

وقت گـــدارا لیکن اللہ تعالی نے انہیں اسلام کے عالمگیر پیغام کیلئے منتخب کیا تھا اور انہوں نے اس پیغام رسانی کیلئے شعر و ادب کی زبان اختیار کی اور بڑی خوش اسلوبی سے یہ پیغام پہنچایا

ہند و پاک کا تقریباً ہر ادیب و شاعر اقبال سے الفاظ و اسالیب، تعبیرات و تراکیب اور خیالات و استعارات میں فیض یاب ہوا ہے حتی وہ لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں جو اقبال سے اختلاف رکھتے ہیں

پروفیسر خلیق احمد نظامی

مولانا شبلی بہ حیثیت مورخ

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۸۶ع
جلد ۱۳۷ شمارہ ۳ ص ۱۸۷ - ۲۱۵

فن تاریخ نویسی میں مولانا شبلی کا سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عربی، ایرانی اور مغربی نظریہ ہائے تاریخ کو ایک فکری وحدت میں ڈھال کر اسطرح پیش کیا کہ اس میں عربوں کی حقیقت نگاری، ایرانیوں کا ذوق ادب اور مغـــرب کا انداز تحقیق جمع ہوگیا. ہندوستـــان کا کوئی دوسرا مورخ اس امتیاز میں ان کا شریک نہیں ہے

مولانا شبلی کے تاریخی ذوق اور انکے نظـــریات تاریخ کے نشو و نما میں چار اثرات بہت واضح طور پر نظر آتے ہیں (۱) سرسید (۲) آرنلڈ (۳) بلگرامی اور (۴) سفر ترکی

حفیظ اللہ نیولپوری

اڑیسہ میں اردو صحافت

ماہنامہ آجکل دہلی جولائی ۱۹۸۶ع
جلد ۴۴ شمارہ ۱۲ ص ۱۲ - ۱۶

اڑیسـہ میں اردو صحـافت کی تـاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے بیسویں صـــدی کے تیسری دہائی میں اڑیسہ میں اردو کے تہذیبی و علمی مرکز کٹک سے مولوی محمد عمر کی ادارت میں ماہنامہ «المصور» کا اجراء پہلا قدم تھا.

ہفتہ وار «مسلم گزٹ» کٹک سے اردو صحافت کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے

ہفتہ وار «دور جدید» اڑیسہ کا دوسرا ہفتہ وار اردو اخبار تھا مسلم طلبا کی انجمن نے ۱۹۴۱ع میں ہفتہ وار اخبـار «بیداری» کا کٹک سے اجراء کیا تھا.

اولین معیاری ادبی جریدے کا آغاز دو ماہی «شاخسار» کٹک سے ہوا

یکم جون ۱۹۸۲ ع کو کٹک سے صدائے اڑیسہ کے نام سے ۱۶ صفحات پر مشتمل اردو اڑیا ذولسانی " یور میگزین " کا اجراء کیا

یونس اگاسکر

مـــــراٹھی لوک گیت

ماہنامہ قـــومی راج جولائی ۱۹۸۶ع جلد ۱۳ شمارہ ۱۲ ص ۲۷ - ۲۸

عوامی ادب یا لوک ساہتیہ کا آغاز کب اور کسطرح ہوا اسکا دار و مـــدار ان گیتوں پر ہیں جنمیں عورتوں اور بچوں کا حصہ بہت اہم ہے مصنف نے مراٹھی لوک گیتوں میں عورتوں اور بچوں کو خاص حصہ بتایا ہے یہ گیت روز مرہ زندگی سے وابستہ ہیں ابتـــدا میں یہ صرف روحانی موضوع تک ہی محدود رہے رفتہ رفتہ ان میں جـذباتی، مذہبی، نیم مذہبی اور معاشرتی رجحان پایا جانے لگا.

گیتوں کی قسمیں بتلاتے ہوئے مصنف نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ یہ گیتوں کا استعمال کن موقعوں پر اور کسطرح کرتے تھے. یہ بات انھوں نے بہت ہی مختصر طور پر بتلائی ہے اور کچھ گیتوں کا ایک ایک ٹکڑا مراٹھی میں اور اس کا ترجمہ اردو میں دیا گیا ہے

شخصیات

محمد نورالدین خان

حالات صفی اورنگ آبادی

ماہنامہ ذوق نظر حیدرآباد پند جولائی ۱۹۸۶ ع جلد ۲ شمارہ ۷۵ ص ۴۶-۵۴

حضرت صفی کے والد حکیم منیر الدین صاحب حصول علم کی خاطر گجرات سے آکر شہر اورنگ آباد میں مقیم ہوئے پھر طب کی تعلیم کی خاطر دلی و علیگڑھ گئے اور اورنگ آباد لوٹ کر واپس آگئے۔

تمام تذکرہ نگاروں نے ۱۱۳۱ ھ کو متفقہ طور پر سن پیدائش تحریر کیا ہے صاحبزادہ میر اشـــرف علی خان نے ۲۶ رجب ۱۳۱۰ ھ لکھی ہے. نام محمد بہاءالدین، مشہور بہبود علی تخلص صفی۔ بہبود علی انکا خود اختیار کردہ نام ہے.

مضمون ہذا میں انکے بچپن، والد کے عقد ثانی، عاشقی کے جھوٹے افسانے صفی کا اپنے گھر سے فرار، والد کی بیماری و تیمار داری و انتقال و صفی کا آخری مکان مسکونہ پر روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے.

ڈاکٹر ثریا ڈار

علامہ فضلِ حق خیر آبادی

پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علیگڑھ
مئی ۱۹۸۶ جلد ۵ شمارہ ۱۰-۹ ص ۲۷-۲۱

علامہ فضل حق ۱۲۱۲ھ - ۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی وطن خیر آباد میں پیدا ہوئے اس وقت آپ کے والد دہلی میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے

آپ نسبتاً فاروقی فقہی لحاظ سے حنفی اور عقائد میں ماتریدی تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس دور کے دستور کے مطابق والد محترم کے ارشاد پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اس دوران تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہے۔

علامہ کا کمال نہ صرف اردو ادب میں جلوہ گر ہے بلکہ آپ نے عربی و فارسی میں بھی اپنی استعداد کا جوہر دکھایا ہے فارسی میں انہوں نے اپنا تخلص «فرقتی» رکھا ہے۔

درج ذیل انکی تصانیف ہیں:

(۱) الہدیہ السعدیہ فی الحکمتہ الطبعیہ (۲) رسالہ تشکیک ماہیات (۳) رسالہ کلی طبعی (۴) رسالہ علم و معلوم (۵) روض المجود فی تحقیق الوجود (٦) رسالہ قاطیغوریاس (۷) رسالہ تحقیق حقیقہ الاجسام، رسالہ الثورۃ الہندیہ، قصاید فتنۃ الہند، مجموعہ القصاید، امتناع النظیر، تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ

مندرجہ بالا تصنیفات میں چار پانچ کے علاوہ باقی سب غیر مطبوعہ ہے

الثورۃ الہندیہ میں شیروانی صاحب نے انکی سوالہ تصنیفات کا ذکر کیا ہے جبکہ تاریخ ادبیات عربی جلد دوم میں ۲۳ کتابوں کا ذکر ہے۔

رضا مظہری - ایک مطالعہ

ماہنامہ کتاب نما دہلی جولائی ۱۹۸۶ء
جلد ۲۶، شمارہ ۷، ص ۵۰-۴۳

حضرت امیر رضا مظہری الکاظمی علامہ جمیل مظہری کے چھوٹے بھائی ہیں آپ کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں مظفر پور کے ایک گاؤں بیشن پور میں ہوئی ایم اے تک تعلیم حاصل کی ۱۹۳۷ء معلمی کا پیشہ اختیار کیا

باضابطہ شاعری ۱۹۲٦ میں شروع کی کسی سے اصلاح نہیں لی. مشتاق احمد نے

پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر کتابی شکل میں رضا مظہری کے سوانح حیات اور ادبی خدمات کا مختصر خاکہ پیش کیا۔ اس کے بعد ابراهیــــم ہوش نے اپنے قسـط وار مضمون مطبوعـہ ماہنامہ اقرا میں ایک مختصر مضمون لکھا

مجمـــوعہ کلام کے نام پر انکے پاس صرف ایک تصنیف "خار و خس" ہے جو ۱۹۷۷ میں کوہ نور آرٹ پریس کلکتہ میں طبع ہوکر منظر عام پر آئی اس میں ۱۹۳۰ سے لیکر ۱۹۷۵ تک کا کلام کا انتخاب ہے کل ۱۲۵ غزلیں چند نظمیں اور چند رباعیاں ہیں

یہ ایک سچائی ہے کہ رضا مظہری کی تخلیقی قوتیں ابھر کر سامنے نہیں آسکیں۔ یہ ضرور ہے کہ اپنے دبے لہجے، پر سکون مزاج اور روایتی مضـــامین کے سبب ان کی شاعری ہمیں اجنبی یا ماورائی نہیں لگتی ہم اسے روزانہ کی زندگی کے قریب پاتے ہیں یہ ہمـارے دماغ کو تحریک نہیں دیتی قوت عمل کو بیدار نہیں کرتی مگر ہمارے احساسات اور جذبات کو ضـــرور چھوتی ہے دراصـل یہی سادگی - سلاست اور روانی مظہـــری کی غزلوں کی انفرادیت ہے

رضـا مظہـری ایک اچھے مترجم بھی تھے۔ اردو فـارسی اور انگریزی زبانوں کے علاوہ ہندی اور بنگلہ زبان سے بھی اچھی طـرح واقف تھے اسلئے انھوں نے ٹیگور اور تارا شنکر کی کئی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

دنیائے شـاعری و ادب کو ٦۰ سال تک روشنی بخشنے والا یہ ستـارہ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۵ع کو غروب ہوگیا۔

تاج القـــــرّاء نور اللہ مرقـدہ

ماہنامہ ذوق نظر جولائی ۱۹۸٦ جلد ۲ شمارہ ۷ ص ۲۲-۱۹

اسم گرامی شـاہ محمد تاج الدین فاروقی قـادری و والد محترم و پیر و مرشـــد کا نام حضـــرت مولانا شاہ محمد سعیدالدین المعـــروف شـاہ منن اللہؒ ہے۔ ولادت ۲۰ ماہ ربیع الثـــانی ۱۳۲۱ھ اندرون احاطہ گنبد شجاعیہ عیدی بازار حیدرآباد دکن تدریس کے سـاتھ ساتھ تصنیف و تالیف کی طرف برابر متـــوجہ رہے ذیل کی تصانیف آپ کے ذوق کی آئینہ دار ہے

(۱) اتالیق تجوید القرآن (۲) تلخیص السمعه
(۳) جدول عشــــرة الکامله (۴) تذکرہ
غوث الدین (۵) تاج النوادر

شاعری میں آپ کا مذاق ستھرا ، خیال پاکیزہ ، خیال عموماً نعتیہ یا پھر منقبتیہ ، تصـــوف اور اخلاق کے مضـامین سے مملو ہے۔

۲۰ ربیع الثــانی ۱۴۰۶ ھ مطـــابق ۲ جنوری ۱۹۸۶ بروز پنجشنبہ اپنی جـان آفریں کے سپرد کردی ۔ تدفین رہائشی مکان کے گوشہ میں ہوئی۔

کوکن محمد یوسف

جسٹس بشیر احمد سعید
حیـات شخصیت اور سیرت

ماہ نامہ برہان دہلی جلد ۹۰ شمارہ ۱
جولائی ۱۹۸۶ ص ۶۳-۶۰

مضمون کی تیسری قسط میں جسٹس بشیر احمد سعید کے اُن سفروں کا حال بہت مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے جو اُنھوں نے تعلیمی خدمات اور تعلیـــمی اداروں کے لیئے مالی اعانت حاصل کرنے کے سلسلے میں کیئے ۔ اُن کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔

متفرقات

جگن ناتھ آزاد

سپر سے سیـال کوٹ تک

ماہنامہ شبخون الہ آبـاد ، جون جولائی ۱۹۸۶ع جلد ۱۹ شمارہ ۱۲۲ ص ۹ - ۳۸

باب ہذا میں اقبال کے آبا و اجداد کی ہجرت سیالکوٹ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے والد شیخ نور محمد ، والدہ امام بی بی بھائی شیخ عطا محمد و استاد میر حسن پر بحث کرتے ہوئے اس زمـانے کی علمی ادبی اور ثقافتی ماحول کا جائزہ لیا ہے

ڈاکٹر فرید شیخ

انجمن اسلام بمبئی اور علی گڑھ

ششماہی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۸۶ ع
جلد ۳۶ شمارہ ۱ ، ص ۹۴ - ۱۱۳

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے بعد ملک کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ انجمن اسلام بمبئی ہے ۔ یـــہ ایک ادارہ نہیں ایک تحریک ہے

۲۵ محـرم الحرام ۱۲۹۳ ھ مطـابق ۲۱ فروری ۱۸۷۴ع روز جمعہ انجمن اسلام

کا قیام عمل میں آیا۔ جسکے روح رواں صدر الدین طیب جی تھے

مضمون ہذا میں انجمن اسلام بمبئی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارباب کے تعلقات کی روشنی میں دونوں اداروں کا جائزہ لیا ہے

ڈاکٹر آفاق فاخری

اقبال اور علم اقتصادیات

ماہنامہ شاداب حیدر آباد ہند، مئی ۱۹۸۶ع
جلد ۳، شمارہ ۵، ص ۶۱ - ۶۴

«علم الاقتصاد» اقبال کی پہلی نثری تصنیف ہے جو ۱۹۰۳ع میں شائع ہوئی دوبارہ ۱۹۶۱ع میں اقبال اکیڈیمی کراچی نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو زبان میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کی تحریک پروفیسر آرنلڈ نے کی تھی

اس کتاب میں ترتیب وار علم الاقتصاد کی اہمیت اور اسکی قدر حق المحنت، زر کاغذی، اعتبار اور اس کی ماہیت پیداوار، دولت کے حصہ دار کے تحت لگان، سود، منافع، اجرت، مقابلہ نامکمل کا اثر دستکاروں پر، جدید ضروریات کا پیدا ہونا اور صرف دولت کے عنوانات کے تحت نہایت بلیغ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ اقبال نے اپنے اقتصادی نظریہ کی وضاحت اس کتاب کے دیباچہ میں کی ہے جس سے کتاب کے موضوع اور اسکی افادیت کا اندازہ ہوتا ہے

مصطفیٰ علی فاطمی

سر رشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علیگڑھ اگست ۱۹۸۶ع جلد ۵، شمارہ ۱۵ - ۱۶
ص ۲۸ - ۳۲

اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جدید فلسفہ، نفسیات، منطق، اخلاقیات، تاریخ سماجی علوم، قانون و دستور، سائنس و ریاضی، طب اور انجنیری کی علمی و فنی کتابوں کا عربی، فارسی، جرمن، فرنچ اور خصوصاً انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ معتمد تعلیمات نے شعبہ تالیف و ترجمہ کے قیام کی منظوری کے لئے معروضہ پیش کیا جو منظور ہوا اور بموجب فرمان خسروی مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۱۷ع جامعہ عثمانیہ کے پیش رو ادارے سررشتۂ تالیف و ترجمہ کا ۶ ستمبر ۱۹۱۷ع کو قیام عمل میں آیا

مقالہ نما ذیل کے رسائل سے ترتیب دیا گیا ہے

المعارف — ماہ نامہ
(مدیر : محمد سعید شیخ)
ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور

الفرقان — ماہ نامہ
(مدیر : محمد منظور نعمانی)
۳۱ ، نیا گاؤں (مغربی) لکھنؤ

معارف — ماہ نامہ
(مدیر . سید صلاح الدین عبدالرحمن)
دار المصنفین ، اعظم گڑھ (یو پی)

برہان — ماہ نامہ
(مدیر سعید احمد اکبرآبادی)
اردو بازار ، جامع مسجد ، دہلی ٦

سب رس — ماہ نامہ
(مدیر : مغنی تبسم)
ادارۂ ادبیات اردو ، ایوان اردو
حیدرآباد (آندھرا)

الفاظ — دوماہی
(مدیر . احمد سعید خاں)
ایجوکیشنل بک ہاؤس یونیورسٹی مارکیٹ علیگڑھ

فکر و نظر — ماہ نامہ
(مدیر ٠ ساجد الرحمٰن)
ادارۂ تحقیقات اسلامی .
اسلام آباد (پاکستان)

شاعر — ماہ نامہ
(مدیر . افتخار امام صدیقی)
مکتبہ قصر الادب ، بمبئی ۸

کتاب نما — ماہ نامہ
(مدیر شاہد علی خاں)
مکتبہ جامعہ اسلامیہ ، جامعہ نگر ، دہلی ۲۵

جامعہ — ماہ نامہ
(مدیر ضیاء الحسن فاروقی)
جامعہ ملیہ اسلامیہ ، نئی دہلی ۲۵

نوائے ادب — ششماہی
(مدیر : نظام الدین ایس گوریکر)
انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
دادا بھائی نوروجی روڈ ، بمبئی ۱

شب خون — ماہ نامہ
(مدیرہ عقیلہ شاہین)
۳۱۳ ، رانی منڈی ، الہ آباد

تہذیب الاخلاق — پندرہ روزہ
(مدیر ٠ سید حامد)
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (یو پی)

قومی راج — پندرہ روزہ
(مدیر ریاض احمد خاں)
جرنل ایڈمنسٹریشن اینڈ پبلک ریلیشنز
سچیوالیہ بمبئی ۳

خدا بخش لائبریری جرنل — سہ ماہی
خدا بخش لائبریری پٹنہ (بہار)

●

رسائل کے مدیروں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اپنے رسائل و جرائد نوائے ادب میں مقالہ نما کی ترتیب کے لئے ڈائرکٹر کے نام بھیجیں ۔ (ادارہ)

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے فروری ۱۹۴۷ع میں الحاق ہوا)

اغراض و مقاصد

۱ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کا انتظام کرنا
۲ تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی اعانت کرنا
۳ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں میں اردو کے مخطوطات کی فہرست کو ترتیب دینا
۶ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ اردو ودیگر متعلقہ زبانوں کے فروغ کے سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرنا

نوائے ادب بمبئی

(۱۹۵۰ع)

(ہر سال دو بار اپریل اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

خصوصیات

۱ اردو ومتعلقہ زبانوں و ادبیات سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو ودیگر متعلقہ زبانوں سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر نقد وتبصرے

(سالانہ چندہ ۲۰ روپیے)

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

مطبوعات و تالیفات

لغات گجری (مرتبہ) رقعات عالمگیر (مرتبہ) مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ) تاریخ ادب عربی (ترجمہ) برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ) سوراج (ترجمہ) رہنمائے صحت (ترجمہ) ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)	پروفیسر نجیب اشرف ندوی
ولی گجراتی (مولفہ) نورالمعرفت (مرتبہ) غزل ولی تک (مولفہ) اردو ایسیز (مرتبہ)	ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی
اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ) نوائے وقت (مولفہ) گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مولفہ) طوطیان ہند (مرتبہ) انڈوایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
نوائے آزادی (مرتبہ) مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ) مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ) مبادیات تحقیق (مولفہ) راگ مالا (مولفہ)	عبدالرزاق قریشی

. نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامداللہ ندوی

مقالہ نما مرتبہ رقیہ انعامدار

REGISTRATION NO. : 32009/50

NAWA-E-ADAB

(BIANNUAL)

VOLUME : XXXVI
OCTOBER
1986

ANJUMAN-I-ISLAM
URDU RESEARCH INSTITUTE
92, Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001